February
2023

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

یوم
یکجہتی
کشمیر

FEBRUARY
5
کشمیر
KASHMIR
SOLIDARITY DAY

سہ ماہی
اقبال
اقبال
مدیر
فرحت عباس شاہ

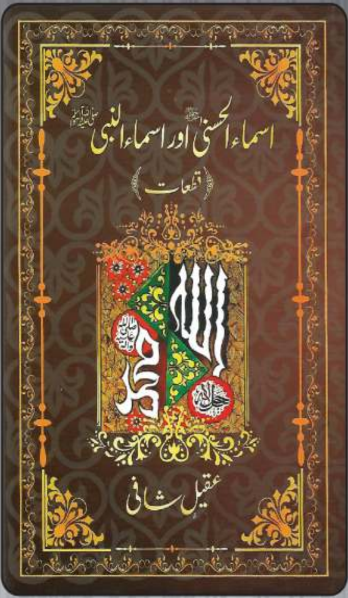
اسماء الحسنیٰ اور اسماء النبی
(قطعات)
عقیل شافی

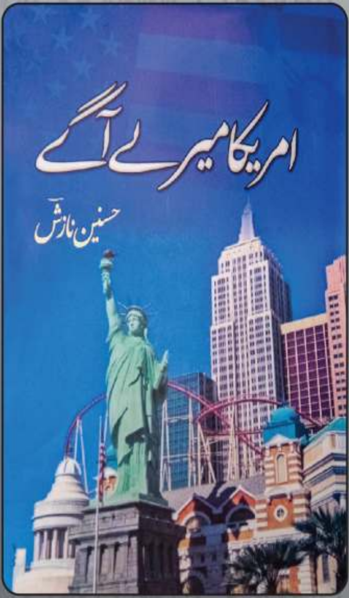
امریکا میرے آگے
حسنین نازش

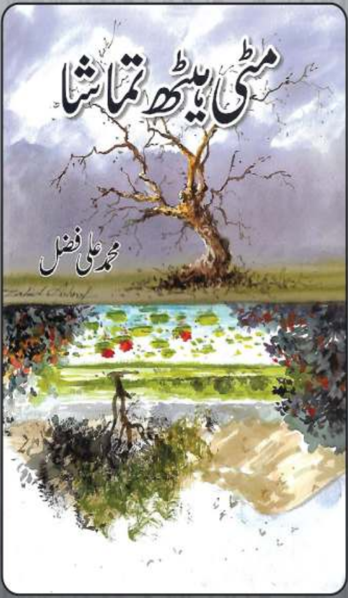
مٹی پا بیٹھ تماشا
محمد علی فضل

بانیِ مدیر خالد احمد

بامِ مینا سے اُترتی ہوئی ایک نظم

سرِ طاقِ سماع روشن ہو
اے چراغِ دیارِ گویائی
رنگ ٹھہریں دکھوں کے اندھیارے
جھلملا ، اے ندیم بینائی
ہم سفر غم نے تجھ کو ٹھہرایا
بے کسی نے تجھے وکیل کیا
تیرا دکھ تھا تری توانائی
تیرے غم نے تجھے تشکیل کیا
تیرے غم آشنا لبوں کے چمن
آگہی کا نشان ٹھہرے ہیں

تیری غم آشنا نظر کے سخن
روشنی کی زبان ٹھہرے ہیں

بامِ مینا سے ماہتاب اُترا
ہوا سینہ کشا ایاغِ لحد
جگمگا ! گورِ آسمانِ سخن
جاگ ! اے تابشِ چراغِ لحد

۱۹۸۴ء

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL | Freight Forwarding | Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا اشاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 31 - فروری 2023 - شمارہ نمبر: 2

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: یوم یکجہتی کشمیر
قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور- 53700
فون: 3-37513000-42-92 فیکس: 37512517-42-92
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر، پرنٹر و پبلشر نے ٹریک لمیٹڈ، پلاٹ نمبر 16 کلومیٹر ملتان روڈ سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمدیہ	خالد احمد	7
2	نعت	جلیل عالی، نسیم سحر، سرور حسین نقشبندی، علی رضا، سید فرخ رضا ترمذی، نبیل احمد نبیل، حسنین مظہری	8 تا 14
3	عقیدت	حسن عسکری کاظمی، محمد یٰسین قمر، محمد افضال انجم، سیدہ روبینہ بخاری	15 تا 18
4	رباعیات	محمد ارشاد	19 تا 20
5	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	21 تا 24
6	مضامین	سلمیٰ اعوان، حامد یزدانی، فرحت عباس شاہ، مقصود جعفری، محمد ظہیر بدر، محمد نوید مرزا، عرفان صادق، فیصل زمان چشتی، عاصم بخاری، مہر علی، میجر عادل وردگ، عنبرین فاطمہ، نعمان منظور	25 تا 86
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	87 تا 95
8	شاعر امروز	اعجاز رافع [شاہد ماکلی]	96 تا 98
9	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر، راحت سرحدی، رشید آفرین، خاور اعجاز، محمد انیس انصاری، گلزار بخاری، شاہنواز زیدی، منظور ثاقب، فرحت عباس شاہ، یعقوب پرواز	99 تا 175

نمبرشمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	مسعود احمد، شہزاد نیر، اقبال سروبہ، انیس احمد، شبہ طراز خالدہ انور، شوکت محمود شوکت، رضا اللہ حیدر، اصغر علی بلوچ سید فرخ رضا ترمذی، محمد نوید مرزا، اوصاف شیخ افتخار شاہد رخشندہ نوید، آسناتھ کنول، شہاب صفدر، فیض رسول فیضان اکرم ناصر، افتخار شوکت، ارشد محمود ارشد، ذکی طارق، انصر حسن اعجاز دانش ، احمد جلیل ، اشرف کمال ، شاہد ماکلی فیصل زمان چشتی، اکرم جاذب، علی رضا احمد، فخر عباس جی اے نجم، سجاد بلوچ، بشیر احمد حبیب، صغیر احمد صغیر علی آرش، احمد مسعود، حکیم خان حکیم، عمر قیاز قائل، حسن پرویز سیّد سید ضیا حسین، محمد افضال انجم، محمد شفیق انصاری، الیاس قمی ثاقب تبسم ثاقب، سجاد حسین ساجد، محمد علی ایاز، ذوالفقار شاذ عطاالمحسن، حنا قریشی، عثمان حنیف، سمیرا یوسف، نور کمال شاد نائلہ راٹھور، کوکی گل، رخسانہ سحر، علمدار حسین، مستحسن جامی نعیم خان، عاصم بخاری، روا حاصل خلوص، عطا العزیز امتیاز انجم ، حافظ طلحہ شفور، نجمی مقبول نعیم	99 تا 175
10	افسانے	کلیم خارجی، اقبال خان یوسف زئی، وسیم جبران حمزہ حسن شیخ ، آفتاب محمود	176 تا 195
11	طنزومزاح/خاکے	محمد کلیم، گوہر رحمان نوید	196 تا 202
12	نظمیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی نسیم سحر، گلزار بخاری، تابش کمال، طالب انصاری، اکرم ناصر شہاب صفدر، افتخار شاہد، شاہین عباس، سرور حسین نقشبندی اشرف نقوی، ظہور چوہان، افتخار شوکت، توقیر احمد شریفی امجد بابر، فرح شاہد، زاہد ربانی ، عاصم بخاری نائلہ راٹھور ، آفرینہ آفرین ، عنبرین خان	203 تا 226
13	خطوط	محمد ارشاد، آصف ثاقب، نسیم سحر، دروانہ نوشین خان، کلیم خارجی محمد شفیق انصاری، فیض رسول فیضان، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	227 تا 241

حمدیہ

ربِ گل! ربِ رنگ! ربِ بہار!
ایک نقش اور، ربِ نقش و نگار!

وسعتِ کائناتِ عشق دِکھا
ربِ قوسین! نقطۂ پرکار

کس لیے ارد گرد کھینچ لیے
دائرہ دائرہ دَر و دیوار

جرسِ گل سنائی دی نہ ہمیں
کر گیا کوچ کاروانِ بہار

راکھ کب تک کریدتے دل کی
ڈال کر سر پہ ہو گئے تیار

جتنی بار اُس طرف نگاہ اُٹھی
روح تک ہم لرز گئے ہر بار

ہر سخن تھا ہم اہلِ غم کے لیے
دل شکن، دل خراش، دل آزار

اِک نم آہنگ حزنیہ لَے پر
کیسے تھم تھم کے چل رہے تھے یار

دیکھتا کون ایک پل رُک کر
رقصِ یارانِ بے سر و دستار

کون گنتا جوان لاشوں کو
کون رکھتا دلاوروں کا شمار

کچھ چھپایا نہ ہم نے دُنیا سے
عشق ہم نے کیا بھرے بازار

اک مذلت نشیں تھے ہم ہی یہاں
کوئی خاقان تھا، کوئی قاچار

تختِ مرمر پہ کل تھے آسودہ
مرمر آسودگانِ زیرِ مزار

آنکھ سر پھوڑتی رہی خالدؔ!
اور منہ دیکھتی رہی دیوار

خالد احمد

نعتؐ

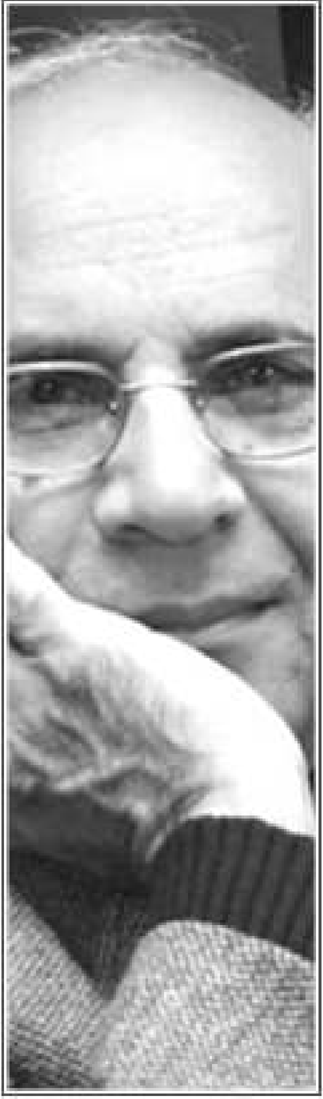

جلیل عالی

ہم خستہ و خجل تریؐ خدمت میں آ گئے
دنیا کی زندگی میں ہی جنّت میں آ گئے

تیرے کرم سے اپنا مقدّر سنور گیا
ادبار سے مدارِ سعادت میں آ گئے

دل تجھؐ سے کب تھے دور مگر یہ جدا سرور
جان و بدن سمیت جو قربت میں آ گئے

ہر ذرۂ وجود میں جاگی ولا کی لو
فائق فضائے عرض و عبادت میں آ گئے

کُھلتا ہے دل پہ فرق جہاں رسم و روح کا
ہم اُس نواحِ فیض و فضیلت میں آ گئے

سارے جہاں ہیں دید تریؐ اک نگاہ کی
قرنوں کے سب نشاں تریؐ ساعت میں آگئے

خُلقِ عظیم نے کیے تسخیر ذہن و دل
آخر عدو بھی سایۂ رحمت میں آ گئے

تجھ نام کی عطا ہے زمینِ وطن ہمیں
شہرِ بتاں سے قریۂ مدحت میں آ گئے

عالی ندامتوں سے گڑے جا رہے تھے دل
قسمت کہ سائبانِ شفاعت میں آ گئے

نعتؐ

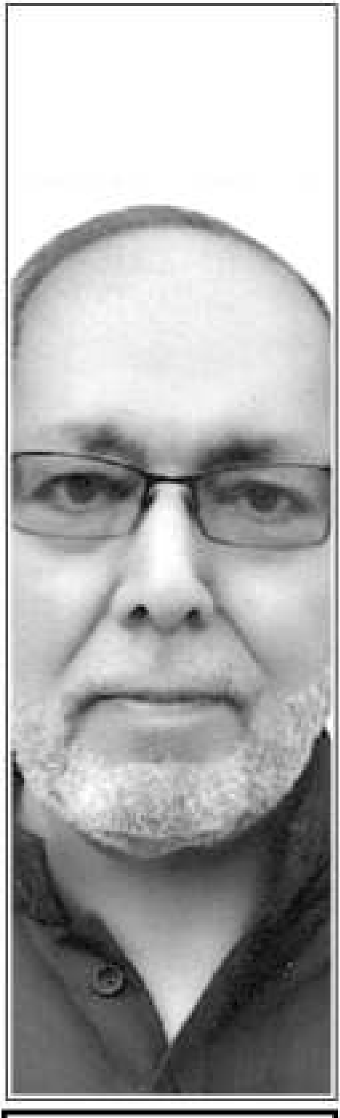

نسیمِ سحر

آنکھوں کے سامنے ہیں لگاتار موجزن
دیکھے تھے اُنؐ کے در پہ جو انوار موجزن

ہر دم گواہی دیتی ہے اُنؐ کے وجود کی!
خوشبو جو ہے سرِ در و دیوار موجزن

لوٹے ہوئے مدینہ سے کچھ دِن جو ہو گئے
پھر سے ہوئی ہے حسرتِ دیدار موجزن

کیونکر نہ سامعین کو لے لیں گرفت میں!
عشقِ نبیؐ جو ہو پسِ اشعار موجزن

دنیا کے دشتِ خشک میں اُنؐ کے وجود سے
ہر سمت رحمتوں کے ہیں امبار موجزن

شہرِ نبیؐ میں دھوپ میں رہ کر بھی یوں لگے
ہر سُو ہو جیسے سایۂ اشجار موجزن

قلزم شفاعتوں کا جو دیکھا رواں دواں
آنسو مرے ہوئے سرِ دربار موجزن

موسم وہاں کے کیوں نہ سہانے رہیں نسیمؔ
اُس شہر میں ہے رحمتِ سرکارؐ موجزن

نعتؐ

اشک میرے بھی اگر نعت سنانے لگ جائیں
خود نمائی کے سبھی شوق ٹھکانے لگ جائیں

تذکرہ حسنِ مکمل کا بیاں کیسے ہو
ایک ہی وصف جو لکھیں تو زمانے لگ جائیں

ہو بہو ایسا ہے مدحت کا عطا ہو جانا
ہاتھ جیسے کسی مفلس کے خزانے لگ جائیں

مصرعۂ نعت اترتا ہے تو یوں لگتا ہے
بارشِ نور میں جس طرح نہانے لگ جائیں

آپ کی سیرتِ اطہر پہ میں جب چلنے لگوں
سنگ خود میرے لیے راہ بنانے لگ جائیں

دلِ بیتاب سنبھالے سے سنبھلتا ہے کہاں
یادِ طیبہ کے شب و روز جب آنے لگ جائیں

نعت کا فیض ہے سرور کہ زمانے والے
میرے جیسوں کو بھی مسند پہ بٹھانے لگ جائیں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

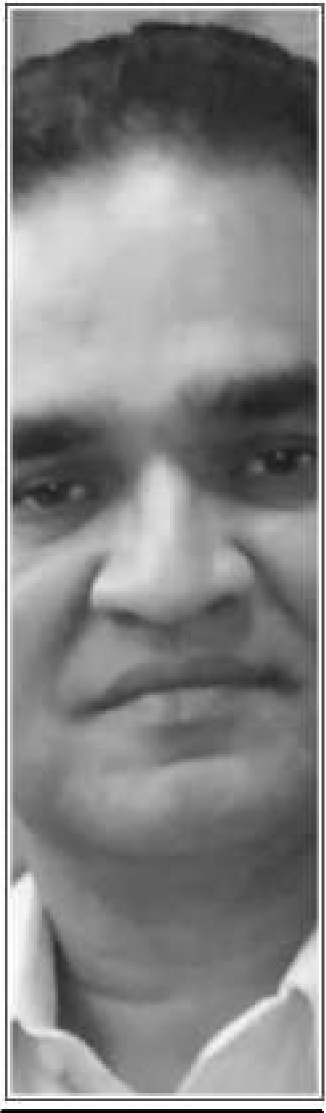

مرے نبیؐ سا کسی کا نام و نسب نہیں ہے
کوئی جہاں میں مثالِ شاہِ عرب نہیں ہے

میں بھیک پاؤں زرِ سخن کی، کمالِ فن کی
مرے قلم کو نواز دیں وہ عجب نہیں ہے

یہ مرتبہ بھی عطا ہوا ہے شہہِ اُمم کو
شفیعِ روزِ جزا کسی کا لقب نہیں ہے

درِ نبیؐ کی گدائی میرے نصیب میں تھی
سو میرا آنا جہان میں بے سبب نہیں ہے

جھلک رہی ہے جو سبز گنبد کی روشنی سے
کسی بھی منظر کی دلکشی میں وہ چھب نہیں ہے

ہر ایک طالب ہے اُن کے الطافِ بے بہا کا
ہے کون جس کے لبوں پہ حرفِ طلب نہیں ہے

وہ آشنا ہی نہیں ہے مدحت کی حُرمتوں سے
وہ جس کے پیشِ نگاہ حدِ ادب نہیں ہے

اُنھی کی چشمِ کرم سے قسمت بدل گئی ہے
جو پہلے والا تھا حال میرا وہ اب نہیں ہے

حضورا! کھولیں کبھی تو بابِ عطا رضا پہ
کہ بے بضاعت کو نعت کہنے کا ڈھب نہیں ہے

علی رضا

نعتؐ

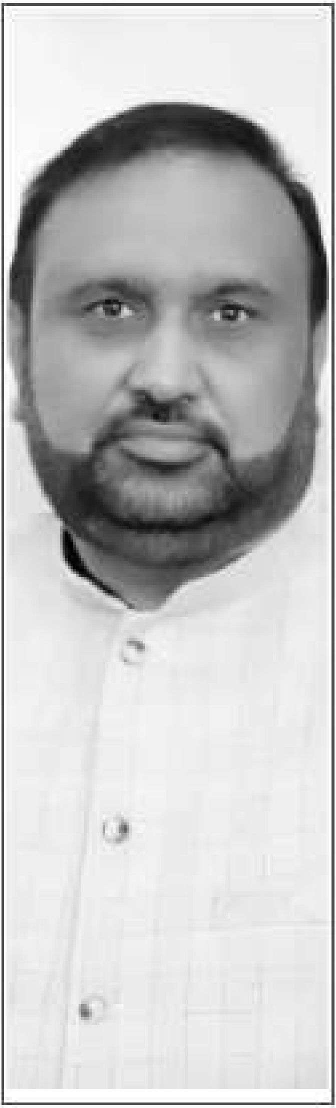

کوئی نہیں ہے آپ سا ذی شان محمدؐ
اولاد مری آپ پہ قربان محمدؐ

اپنا تو ہے پختہ یہی ایمان محمدؐ
سب نبیوں کے ہیں آپ ہی سلطان محمدؐ

کیا ہو گا انہیں آپ کا عرفان محمدؐ
جو رکھتے نہیں آل کی پہچان محمدؐ

ہیں ختم رُسل آپ ہی اے رحمت عالم
قرآن میں مذکور یہ فرمان محمدؐ

بن جائے گی دوزخ ہی فقط ان کا مقدر
جو آپ پہ گھڑ لیتے ہیں بہتان محمدؐ

دشمن بھی ترے در سے نہ خالی کبھی لوٹا
رحمت کی رہی اُن پہ بھی باران محمدؐ

مجھ پر بھی کرم کیجیے اے شاہِ مدینہ
ہو جائے مری زندگی آسان محمدؐ

سید فرخ رضا ترمذی

نعتؐ

کرتے ہیں آپؐ ظلم کا رد سیّد الوریٰ
درکار آپؐ کی ہے مدد سیّد الوریٰ

صد مرحبا! مقامِ فضیلت حضورؐ کا
صد مرحبا! حبیبِ اَحد سیّد الوریٰ

روزِ ازل ہی آپؐ کے حُسنِ دوام سے
روشن ہوئی ہے شمعِ اَبد سیّد الوریٰ

دیتے ہیں آج بھی درِ اقدس پہ حاضری
قُدسی سبھی رسولِؐ صمد سیّد الوریٰ

مجھ پر بھی بابِ علم و ہنر کھول دیجیے
اے شہرِ علم، روحِ خرد سیّد الوریٰ

ہم عاصیوں کو ڈھانپے گا محشر کی دھوپ میں
ایک آپؐ ہی کا سایۂ قد سیّد الوریٰ

اپنی عطائے خاص سے مہکایئے حضورؐ
یہ عمر میری تا بہ لحد سیّد الوریٰ

میں اُمتی ہوں آپؐ کے در کا غلام ہوں
کافی یہی ہے ایک سند سیّد الوریٰ

عرفان و فہم آپؐ کے گھر کے غلام ہیں
اے جانِ علم! حُسنِ خرد سیّد الوریٰ

ہیں آپؐ کے نبیل کو جاں سے عزیز تر
سب آپؐ کے دیار و بلد سیّد الوریٰ

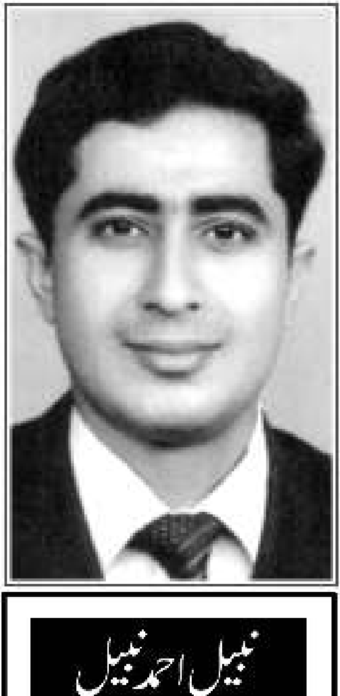

نبیل احمد نبیل

نعتؐ

سُرخ، جو منظرِ احوالِ دروں ہے، یوں ہے
الفتِ آلِ نبی شاملِ خوں ہے، یوں ہے

اِس قدر آپ نے خوشیوں سے بھرا دامن کو
ایک بھی غم نہ دروں ہے نہ بروں ہے، یوں ہے

ربط رکھتا ہے مسلسل غمِ شبیر کے ساتھ
قلبِ مضطر کو جو اِس درجہ سکوں ہے یوں ہے

ورفعنا لک ذکرک سے ہوا مجھ پہ عیاں
اصل جو فلسفۂ کن فیکوں ہے یوں ہے

غیر ممکن ہے ثنائے شہِ والا کا بیاں
سوچنا بھی ہے عبث ایسا کہ یوں ہے یوں ہے

مظہری مدحتِ سرکار کا اعجاز ہے یہ
تیری توقیر جو پہلے سے فزوں ہے، یوں ہے

حسنین مظہری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

میرے بچوں، میرے شہروں میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

عقیدت

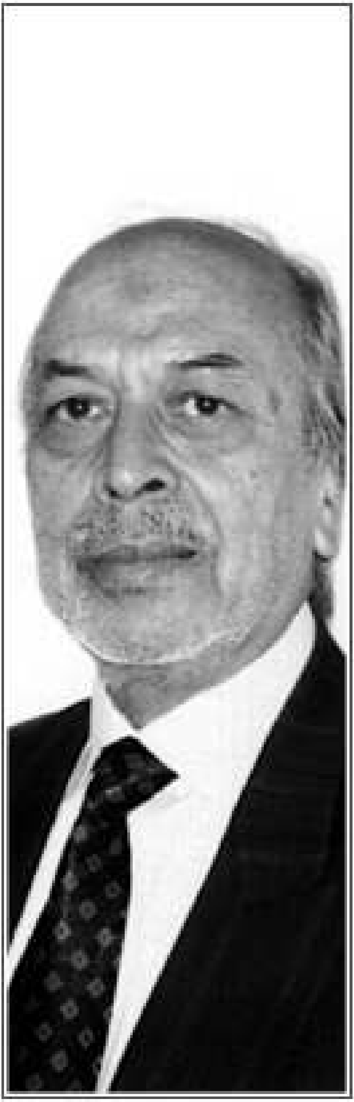

پردۂ شب میں ریاضت کا ثمر اچھا لگا
روبرو اس کے قیامِ مختصر اچھا لگا

مالکِ ہر دو جہاں کا ذکر ہے میرا شعار
باوضو یہ حمد گوئی کا ہنر اچھا لگا

طاعتِ حکمِ خدا تو فرض ہے ہم پر مگر
جانبِ کعبہ ہمارا یہ سفر اچھا لگا

بستیاں یوں تو بسائیں حضرت انساں نے
جو ہوا منسوب ربّ سے وہ نگر اچھا لگا

سجدے میں دیکھے نمازی ہم نے سر رکھے ہوئے
ایسا نظارہ ہمیں شام و سحر اچھا لگا

آ گئے صحنِ چمن میں سیرِ گل کو ہم سبھی
جھومتا اس کی ثنا میں ہر شجر اچھا لگا

ڈوب کر اُبھرے کہاں تھے ہم تہجد میں حسن
بے خودی میں یادِ باری کا بھنور اچھا لگا

حسن عسکری کاظمی

وہ جن کی نور منزل ہو

کئی صدیوں، کئی قرنوں سے واماندہ مسافر ہوں
سفر ایسا کہ ہر منزل مجھے آغاز لگتی ہے
میں تھک کر گر بھی جاتا ہوں
مگر جیسے ہی گرتا ہوں
خنک وادی کے نظارے، حسیں منظر
مری پژمردہ سوچوں کو حیاتِ نو کی اک قوسِ قزح کے رنگ دکھلائیں
اشاروں میں یہ بتلائیں، کنایوں میں یہ سمجھائیں
دیارِ خیر کے عازم! اُجالوں کے مسافر ہو
خنک وادی کی چاہت ہے تو پھر تم رک نہیں سکتے
سنو! اہلِ وفا کے قافلوں کو چلنا ہوتا ہے
وہ جن کا سوز جادہ ہو، وہ جن کا شوق محمل ہو، وہ جن کی نور منزل ہو
خزاں سامانیاں کب ان کے رستے روک سکتی ہیں؟
وہ پژمردہ نہیں ہوتے
درودوں کی حدی میں مست پیہم چلتے رہتے ہیں

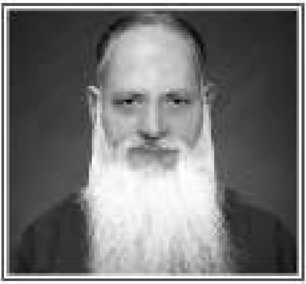

محمد لیٰسین قمر

عقیدت

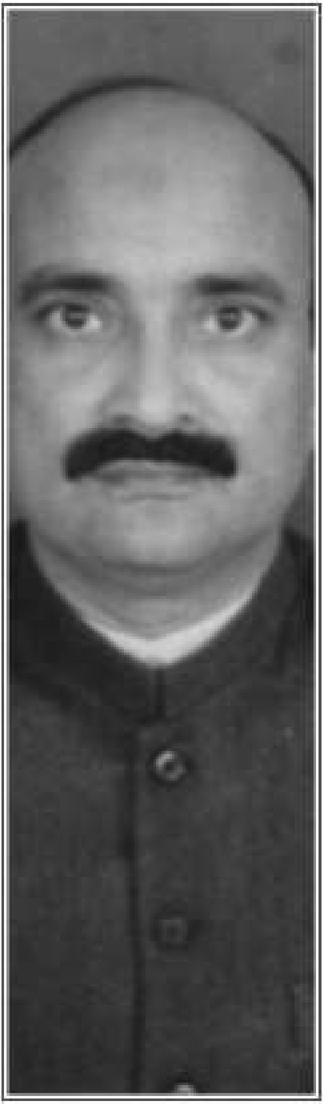

محمد افضال انجم

امت یہ ہوئی خاک بہ سر سیدؐ عالم
اس کی بھی دعاؤں میں اثر سیدؐ عالم

آج اس کے عدو اس پہ ہیں غالب سرِ دنیا
اس کو بھی ملے فتح و ظفر سیدؐ عالم

امت یہی پھر اٹھے ترے نام کو لے کر
ہو ایسا عطا اس کو ہنر سیدؐ عالم

ہر سمت سے یلغار ہے ہر دشمنِ دیں کی
بند اس پہ ہوں آفات کے در سیدؐ عالم

پتھر تھی، سو پتھر نہ چلی جائے جہاں سے
کب ہونا ہے قسمت میں گہر سیدؐ عالم

آسان ہو اس کی بھی مسافت مرے آقاؐ
کب ہوگا سپھل اس کا سفر سیدؐ عالم

ہر طعنۂ اغیار کا بس یہ ہے نشانہ
اب اس پہ ہو رحمت کی نظر سیدؐ عالم

رستے پہ رہے تیرے یہ ثابت قدمی سے
چھٹ جائے نہ اس سے یہ ڈگر سیدؐ عالم

عقیدت

تہی داماں ہوں ، تو سب جانتا ہے
تری رحمت کا مجھ کو آسرا ہے

ہمیں ایمان کی دولت عطا کر
لبوں پہ ہر گھڑی حرفِ دعا ہے

چھُپا سکتے نہیں ہم کچھ بھی تُجھ سے
دلوں کے راز تُو سب جانتا ہے

اکیلی ہو نہیں سکتی کہ مجھ پر
ترے فضل و کرم کی انتہا ہے

ہمیں رستے پہ اپنے ہی چلانا
تُو سب بھٹکے ہوؤں کا رہنما ہے

تُو مالک ہے ازل کا اور ابد کا
کہ تیرے نام سے ہر ابتداء ہے

ہماری خستہ حالی پہ نظر ہو
ہمیں تُو بخش دے یہ التجا ہے

کرم سے اپنے ہم کو بخش دینا
گنہگاروں کا بس تُو آسرا ہے

سیّدہ روبینہ بخاری

رباعیات

فرعون کہیں خدا کہیں ہے نمرود
از بندہ قیام است و رکوع است وسجود
موسیٰ با عُقدۂ اللسان ابراہیم
تعمیر میں کعبے کی ہمکہ موجود

....

دیکھی جو مداری کی پٹاری میں نے
آپ اپنی نظر کی نذر اُتاری میں نے
شاید کوئی ہو بھی پر نہ دیکھا اب تک
جھرلو بن کوئی بھی مداری میں نے

....

آتا ہے نظر سبھی کو ہر سُو بیٹھا
کرتا ہوا رات بھر ھَیا ھُو٭ بیٹھا
انجام اس باغ کا نہیں نامعلوم
جس کی ہر شاخ پر ہے اُلّو بیٹھا

....

ہر کھیل سے الگ سیاست کا کھیل
بے جوڑ سے جوڑ اور اَنمل سے میل
ہے صبح کو مُک مُکا تو شب کو اَن بَن
منڈھے چڑھتی دکھائی دیتی نہیں بیل

....

ہے اس کے سوا اور کوئی کام نہ کاج
جب تک ہے تاجدار کے سر پر تاج
دینا نہیں کچھ کسی کو، لینا سب سے
جو ماؤں کے پیٹ میں ہیں ان سے بھی خراج

....

از نسل بہ نسل ہے سیاست چالو
ماموں یہ چچا وہ، یہ بہو وہ، خالو
خود ساختہ لُکنت ہے چھپا مت رشتے
شف شف چہ کنی فاش بگو شفتالو

....

کیا اس سے اُسے ہے کون خوش کون اداس
ہوتا ہے تو ہو کسی کا بھی ستیاناس
کس کو ہے مجال ٹوکنے کی اُسے، شیر
بَن کا راجہ ہے گھاس کھائے یا ماس

....

منت سے نہ جھاڑ پھونک سے ہوں گے کیل
کب تک جاری رہے گا آخر یہ کھیل
کھیتی چر لی ہے وحشیوں نے ساری
ڈالی نہ کسی نے بھی کسی کو بھی نکیل

....

٭ھَیا ھُو۔ آشوب، جنجال۔ یہ رباعی ماخوذ ہے اس مصرع معروف سے: ہر شاخ پہ اُلو بیٹھا ہے انجام گلستاں کیا ہوگا۔

جب تک ہیں زبردست اُچکے اوباش
سُدھرے گی کبھی نہ زیردستوں کی معاش
اُپلوں کو سمجھ کے روٹیاں کھائیں نہ لوگ
یا پھانکیں ریت اسے سمجھ کر خشخاش

....

جس کی ہے ناک بند اس پر نہ ہو فاش
آلو کی ہے منہ میں یا کہ ہے سیب کی قاش
یکساں ٹھہریں گے ذائقے میں دونوں
پاکستاں کی حلیم ، ایراں کی آش

....

مکھیے کبھی ٹھاکر کبھی نوچیں ہیں پٹیل
کھینچا تانی یہ کب تلک لے گی جھیل
ہے بسکہ خداداد، خدا ہی جانے
کس کی جورو ہے مملکت کس کی رکھیل

....

ہر بجور کہ مد ، جوار ہو یا بھاٹا
نادار کے ہی نصیب میں ہے گھاٹا
کپڑے نہ بکے کہ کوئی گاہک ہی نہ تھا
کپڑے بکتے تو مل ہی جاتا آٹا

....

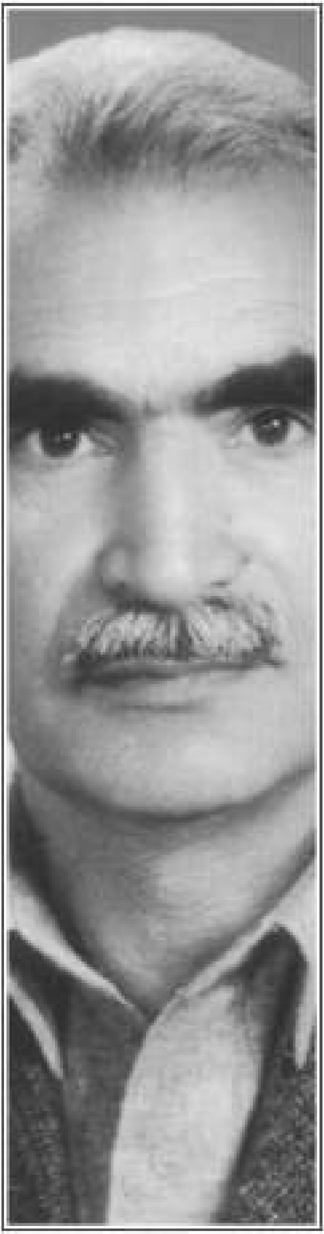

محمد ارشاد

باتیں

رونے والے کو بھی تو ایک کندھا درکار ہوتا ہے پھر کسی مخلص چاہت والے دوست کی تلاش جو آپ کے درد کو جانتا ہو مانتا آپ کو خود سے بہتر گردانتا ہو۔ خالق و مالک سے بڑھ کر خیر خواہ اور چاہت کرنے والا کوئی اور کیا ہوگا جو آپ کی دنیا بھی بنانا چاہتا ہے اور آخرت بھی تو پھر دل کی بات اُسی سے کیوں نا کی جائے آپ آزما کر دیکھ لیں احباب میں رشتہ داروں میں کسی کے آگے ایک آنسو روئیں تو وہ پوری اوک بھر کے آپ سامنے روئے گا اور اپنے دُکھوں کا پنڈورا باکس آپ کے سامنے کھولے گا۔

اپنے مالک وخالق سے دل کی بات کریں اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اردگرد ہُو کا عالم ہو اور شور برپا ہو خانۂ دل میں پھر دل کی بات کرنے کی لذّت انسان پر کُھلتی ہے اُٹھتے ہیں حجاب آخر یعنی اللہ جل شانہ اپنا بنا لیتے ہیں مالک کی ذات عالی کی عظمت دل میں اور آنکھوں میں بس جاتی ہے مالک آنکھوں کے سامنے سے اک پردہ سرکا دیتے ہیں تو بندہ مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے صفاتِ ربی کا ایک جھروکہ سا بندے کے سامنے کُھلتا ہے تو اُسے سمجھ ہی نہیں آتا کہ میرا مالک تو میرے محدود ذہن سے ماورا ہے بندے کی خوش نصیبی کہ وہ دعا کرلے مالک سے سچل مانگت بن کر مانگے اس کی وحدانیت دل میں ہو اور اصلی وحدانیت یہ ہے کہ غیر اللہ کا ذرا سا خیال بھی دل میں نہ آئے۔

بندہ خلوت میں بھی اور جلوت میں بھی محبوبِ حقیقی کو یاد کرسکتا ہے۔ روزانہ کچھ وقت اس کے لئے مختص کرنا ہوگا اس سے کہنا ہوگا۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ تیری چاہت کی معراج کو پا نا سکا مگر میں تیری چاہت کے در پر کئی بار گیا تو تھا بس میرا ظرف ہی چھوٹا تھا تیرے کرم سنبھال ہی نہ سکا اتنے پیارے سخی اور دیالو مالک سے مانگنا ہی نہ آیا اب یہ تو مالک ہی جانتا ہے کہ میں اس میں کس حد تک کامیاب ہوسکا مگر پریت لگائی تو تھی پریت پُرانی ہوگئی مگر نفس اور ابلیس سے بچنا۔ بہت مشکل تھا دل کو بہت سمجھایا کہ نفس کی نہ مان خالق کی مان کر چلنا ہوگا بندہ رو رو کر التجا کرتا ہے تو خالق (جاننے کے باوجود) مقرب فرشتوں سے پوچھتا ہے

"یہ کیسی آواز ہے یہ کس کی آواز ہے"

فرشتے عرض کرتے ہیں

"ایک پُرانا چاہنے والا ہے بڑی مانوس سی آواز

سلیمان عبداللہ ڈار

ہے آواز میں لرزش پاؤں لغزش ندائے سحرش ساتھ ہی اشکِ ندامت کی بارش دل کی دیواروں پہ چسپاں نوٹس نالش بس یہی تھی کاوش مگر نفس کی سازش۔ جان ہی نہ چھوڑتی تھی۔ ایک وقت تھا یہ بندہ دو عالم سے خفا تیرے لئے تھا تو نے اپنے قرب سے نوازا تو یہ پچھاور محبت کی روحوں میں بجھ گیا یہ تو کہتا تھا۔ کی کرنا اُچیاں شاناں توں کی جھلا دُنا اَساں نوں بس میں نا ہیں سب توں ۔ جب بندہ مالک کی چاہ والی راہ پر اک پرکاہ کی طرح چلا تو اس کا اپنا وجود ہی محو ہو گیا اس کے دل میں کوئی ذاتی خواہش رہی نہ طلب نہ غرور حسب ونسب محبت کے دنوں میں بندے نے چہرے پر سنت سجائی اک انجانے کیف و سرور کا سلسلہ تھا جو سلسلہ ہائے روز شب پر محیط تھا بس پھر تو بندے کی آنکھوں میں مالک سے تعلق والی لذت ڈولتی تھی کانوں میں رس گھولتی تھی (پھر بندے کی وچھوڑے والی آہ اور راتوں کا رونا دھونا عرش تک جا پہنچا تو) ہاتف نے بارگاہ الٰہی میں پھر عرض کی۔ یہ انسان یہ تیرا بندہ پراگندہ نادھندہ جب تیری مان کر چلا تو سرینڈر کر گیا کلی طور پر اس نے اپنی خواہش مالک کے حکموں کے تابع کر دی مگر یہ کیا کرتا آخر کو تھا تو انسان ہی۔ (مالک کو چاہنے والے ہر بندے پر بھی نہ کبھی ایسے ہی حالات گذرتے ہیں بندے کا نام اور مقام کوئی بھی ہو تیرا میرا پیا تو سانجھا ہے اس لئے یہ ہر چاہنے والے کی کہانی ہے) اے مالک وہ انسان ہی نہیں جس سے خطا نہ ہو تو نے اتنا کچھ وان کیا اس نے مان لیا مگر اسے کئی محاذوں پر لڑنا تھا شیر خوارگی سے لے کر لڑکپن تک لڑکپن سے لے کر بڑھاپے تک کوئی نہ کوئی خوف کوئی نہ کوئی ٹینشن اس کے ساتھ رہی یہ گلی میں نکلا تو بدمعاشی اس کی آنکھوں میں اُتری، بازار میں گیا تو بدکاری کانوں میں اُتری یارب اس نے بتیری کوشش کی مگر بار بار لڑکھڑایا بار بار شرمندہ ہوا نادم ہوا اس کے جسم و جاں کا روم روم ہر بال وبال بنا آنسو بنا التجا بنا پچھتاوا بنا بار ہا یہ اکیلا بیٹھ کر بارگاہِ الٰہی میں رویا اور کہا کہ میں ہوں وہ ہے مالک ہے اور دعائیں ہیں باتیں ہیں درمیاں نہاں کہاں سے کہاں مالک سے دور رہ کر زیاں ہی زیاں ظاہر بھی پنہاں۔ مالک سے تعلق بنا تو سامنے اک اور ہی انوکھا جہاں تھا۔ بے یقینی کی شکوک کی اشکالات کی آندھیاں چلیں مگر بندے کے ایمان و یقین والے پہاڑ خم ٹھونک کر کھڑے رہے مالک کی وحدانیت اور سرکارِ دو عالم کی رسالت پر ایمان متزلزل نہ ہوا بندہ کئی بار روضہ مبارک پہ حاضر ہوا۔ عاشقوں کے جمِ غفیر میں درِ رسالت پہ پہنچا پھر روضہ مبارک کے دروازے پہ پہروں کھڑا رہا آنکھوں کی منڈیروں پہ پلکوں کی جھالر پر شرمندگی کے آنسو لٹکائے نادم اتنا تھا کہ یارا ہی نا تھا چاہتا تھا زمین پھٹ جائے اور خطا کار بندہ اس میں سما جائے سوچتا تھا میں بارگاہ رسالت میں آتو گیا ہوں سامنے شیخین کی آرام گاہ ہے بندے کو رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ میں درِ رسالت پہ لے کر کیا آیا ہوں؟؟ صرف خطائیں ہی خطائیں بس فروگذاشتیں بس جوانی کے کمزور لمحات والے

لیے میرے دامن میں تو ایک بھی عمل ایسا نہیں جو بارگاہِ رسالت میں پیش کر سکوں اُس لیے بندے کے دل نے کہا اور یہ اک انسان کی نہیں ہر اُمتی کا بھی کہنا ہوتا ہے کہ دھیان والی محبت والی تعلق والی تاثیر والی دل سے ادا کی گئی نمازیں بہت تھوڑی ہیں کہیں ایسا نا ہو کہ میرے ان اعمال کی وجہ سے روزِ محشر والی سخت دھوپ اور بلا کی گرمی میں شافعِ محشر مجھ پیاسے کو حوضِ کوثر سے پانی نہ پلائیں۔ مجھے پہچان نہ سکیں کہ ہو سکتا ہے میرے وضو والے اعضا اس روز نہ چمکتے ہوں نہ ہی دمکتے ہوں۔ پھر ہم جیسے اُمتیوں کے لئے وہ رات بھر روتے رہے اللہ سے بخشش مانگتے رہے وہ خوبصورت پاؤں میرے جیسے گندے مندے بندے کے لئے متورم ہوئے کہ میں متوجہ گھر کا رہا نا گھاٹ کا۔

رب کریم پھر جاننے کے باوجود پوچھیں گے
"یہ آہ بکا والی آواز بڑی شناسا ہے یہ بندہ کیا چاہتا ہے"؟

ہاتف پھر سجدہ ریز ہو کر کہے گا

"حق تعالیٰ شانہ کے دربار میں عرض ہے اکثر انسان خطا کار ہیں کہ انسان کا مادہ ہی نسیان سے نکلا ہے یہ 'قالو بلیٰ' والا وعدہ بھول جاتے ہیں۔ آہ بکا کرنے والا یہ بندہ جوانی میں ہدایت والی راہ پر چلا مالک سے تعلق والی گزرگاہوں والا سفر کرتا رہا یہ عرض کرتا ہے کہ غفلتوں نے تعلق والا سرمایہ ہی لوٹ لیا دل کی شادابیاں چٹیل اور بے آب گیا میدان بنیں پر پھر بھی میں نے چہرے پر سنت نبوی سجائے رکھی یہ سوچ کر کہ جیسے کوان بتوں سے بھی نسبت ہے دور کی نسبت ہی اصل ہے میں نے اپنی شکل اور صورت وہی تعلق والے دنوں والی ہی رکھی سوچا تھا اعمال میں آب و گیاہ غفلت تو آ گئی اسے بھی خالق دور کرے گا پر ظاہر تو بتا رہا ہے کہ اکثر اللہ والوں کو یہی کہتے ہوئے سنا

"ظاہر کے بغیر باطن مردود ہے اور باطن کے بغیر ظاہر مقبول ہو سکتا ہے"

بندے نے شکل ایمان و یقین والی ہی رکھی نہ جانے اس طرح کی بہت سی اور باتیں بندے محبوبِ حقیقی سے کرتے ہیں رب جی سوہنے کو دل کی باتیں بتاتے ہیں حالانکہ وہ تو خود سمیع و بصیر ہے بس بندہ ہی دلگیر ہے راہگیر ہے فقیر بہت حقیر ہے پُر تقصیر ہے بس خستہ حال نڈھال ہے طالبِ وصال ہے صاحب۔

وہم و خیال ہے اللہ راضی ہو تو جنت ورنہ ساکنِ پاتال ہے

اپنے خالق سے التجائیں کرنا دعائیں کرنا باتیں کرنا محال نہیں بس دل میں اس کی یاد بسی ہو لب پر اس کا ذکر ہو جب ذرا گردن جھکائی مالک کے سامنے دل والا کشکول پھیلا دیا کہ دیارِ نور میں تیرہ شبوں کا دکھ تو ساتھی ہے بندہ رب سے شکایت کرے گلہ کرے تو اُسے یہ زیب نہیں دیتا یہ تو بڑی بے مروتی ہے بس جب بھی درد ہو تو یاد ہی اس کی میڈیسن ہے کسی کے سامنے اپنے درد کا ذکر کرنا بڑی بے قدری تو ہے ہی مالک کے سامنے ذکر کرنا بھی تو شکایت ہے ناگفتہ یہ روایت ہے مالک سے بندہ کیوں کہے کیا اُسے علم نہیں کہ بندہ کس حال میں ہے اور جب وہ جانتا ہے تو یہ خیال ہی کس قدر حسین ہے کہ بندے

کے رب کو اس کے درد کی خبر ہے شکایت ہو بھی کیوں درد اور چبھن تو تعلق کی نشانی ہے تعلق کے ساتھ ساتھ پاس پاس رہتی ہے درد تو غم خوار ہے ہم راز ہے محرم ہے بندہ ہی تھوڑا ہو کر نا محرم بن جاتا ہے ۔ چبھن غم خوار ہے دلدار ہے تو پھر زخموں سے کیا گھبرانا بس خالق سے آسانی مانگنا ہو گی کہ بندہ آزمائش کے قابل ہی نہیں مگر آزمائش آ جائے تو پھر ہر لمحہ الحمدللہ کہنا ہو گا کہ چاہنے والا شور نہیں مچاتا بس چپ کر جاتا ہے اس اندر ہو کا عالم بڑا ظالم ہوتا ہے۔

مسلمان جب ایمان کامل کے ساتھ رب کو پکارتا ہے تو بہت سی باتیں کرتا ہے کہتا ہے میں تیرے قابل نہیں پھر بھی تو اپنا بنا لے تو وارے نیارے ہو جائیں گے مسلمان التجا کرتا ہے کہ اے میرے خالق اگر میں تجھے اپنا نہ سکا تو میں ہی جھوٹا ہوں تو سچا ہے سچا ہے کمی تو مجھ میں تھی میرے اندر وہ طلب ہی ناپید ہو گئی جس پر تیرے فیصلے اترتے ہیں۔

بندہ عرض کرتا ہے جب بھی کوئی مشکل آئی تجھے یاد کیا تیرا نام لیا تیرا ذکر کیا تیری پوجا کی اب اگر صلہ مانگوں تو یہ بڑی بے شرمی ہو گی اس سے چاہنے والا مسلمان بھی دل سے کہنے لگتا ہے۔

"میرے دل نمازوں کے بدلے صبر والے روزے کے بدلے دنیاوی آسانیاں آسائشیں مانگتے ہو کتنی شرم والی بات ہے خالق سے سودے بازی کرتے ہو کاروبار (معاذ اللہ) کرتے ہو ہر کاروبار سفاک ہوتا ہے بیوپار نہ کرو اپنا سب کچھ اور خود کو بھی مالک کے سامنے ڈھیر کر دو تعلق بنانا پھر استوار کرنا ہے تو ہتھیار ڈال دو۔

بندے کے ذمے دعائیں کرنا ہے تعلق کی بات ہے اور باتیں ہیں بظاہر دعائیں قبول ہوتی نہ بھی دکھائی دیں تو یہ آخرت کے لئے ذخیرہ کر لی جاتی ہیں تعلق والا بندہ عرض کرتا ہے اے مالک یہ بھی اچھا کیا دنیا کی زندگی آخر کو ہے ہی کتنی چند ماہ یا چند سال اور یہ تکالیف میں بھی گزر گئی تو بندے کو صبر اور شکر کرنا ہو گا بس مالک کا اپنا نظام ہے اس نظام میں جب بندے کی دعاؤں کے منظور ہونے والی باری آئے گی جب یہ دعا اللہ جل شانہ کے نظام میں فٹ ہو سکے گی تو اللہ دعا پوری بھی کر دیں گے دعائیں قبول تو ہو رہی ہیں سنی بھی جا رہی ہیں جب مالک نے مناسب سمجھا پوری بھی ہو جائیں گی باتیں تو بہت سی ہیں یہ تو ایسی فصلیں ہیں کہ جن کی جتنی کٹائی کر دو یہ اور بڑھتی ہیں نمو پاتی ہیں بس اس لئے دل کی زمین کا زرخیز ہونا ضروری ہے۔ کامل اکمل ذات تو بس اللہ کے رسولؐ کی تھی بندہ بڑا عبادت گزار ہو بہت صالح ہو ہمیشہ بدنظری سے بدکاری سے بچتا رہا ہو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک مالک سے سچی محبت کرتا رہا ہو تو بھی وہ آخر کو بندہ ہی ہے بس بندے کے ذمے یہی ہے کہ منگتا رہے کہتا رہے میرے جیسا منگتا کوئی نہیں تیرے جیسا داتا کوئی نہیں۔ مالک سے دل کی بات کرتا ہے خلوت درا نجمن ہو بندہ دفتر میں ہو یا دکان پر باتیں ختم ہی نہ ہوں بندہ ختم ہو بھی جائے محبتوں والے تذکرے ختم نا ہوں۔

☆☆☆☆☆

فرخ سہیل گوئندی ایک منفرد سیاح

سلمیٰ اعوان

گریز پا تھی میں۔ فرخ سہیل گوئندی پر لکھنا کوئی خالہ جی کا گھر تھا۔ دو تین بار اصرار بھی ہوا۔ محبت بھی مجھے اِس نوجوان سے بہت ہے جو ستاروں پر کمندیں ڈالے رکھتا ہے۔ مگر پہلو بچانے میں عافیت تھی کہ اس کی ذات کی کوئی ایک دو تھوڑی پینتیس سو تو جہتیں ہیں۔

یہ بوڑھی عورت اس کی کس کس کچھار میں ہاتھ ڈالتی پھرے گی۔ اس سے انصاف ہی نہ کر پائے گی۔ ڈر ہے کہ اس کا کوئی نہ پہلو تشنہ رہ ہی جائے گا۔ کتاب اور علم کا دیوانہ، سیاحت جیسے مشکل شغل کا پروانہ، سیاست جیسے گندے کھیل میں خوبصورت خواب دیکھنے والا مستانہ۔ اس کی سوچ انقلابی ہے۔ فکر و عمل میں دانشوری ہے۔ کم عمری میں اِس صفت کا اس کے اندر نمو پانے کا سبب وہ بہت پڑھے لکھے لوگ تھے جن کے ساتھ اس کے شب و روز گزرے تھے۔

تحریر کا مرد مجاہد ہے۔ حرف لکھتا ہے اس سے محبت کرتا ہے۔ اس کو شائع کرنے، پبلیشنگ کو نئے رنگ، نئے انداز دینے اور اپنے کارکنان کو تحفظ دینے کا داعی ہے۔

گفتار کا غازی ہے جب بات کرتا ہے تو اس میں دلیل اور دانش مندی ہوتی ہے۔ الیکٹرونک میڈیا سے بھی اس کا تعلق گہرا رہا۔ مختلف شخصیات کے انٹرویوز لینا اس کی ڈیوٹی کا ایک حصہ تھا۔ ''لوگ در لوگ'' پڑھیں تو اس کے اِس جوہر کا زیادہ گہرائی سے احساس ہوتا ہے۔ اس در جہ خوبصورت خاکے کہ جن میں ان شخصیات کی اپنی حیثیت کے ساتھ ساتھ درمیان میں تعلق کا وہ ناطہ بھی نظر آتا ہے جو فرخ اور ان کے درمیان تھا اور ہے۔

فرخ سے پہلی با قاعدہ ملاقات کب ہوئی۔ سالوں پہلے جب ترکی جانے کو دل مچلا۔ سیما نے کہا ''کسی سے معلومات لیں''۔ ''لو وہ لڑکا اپنا فرخ ہے نا۔ ارے بھائی ایک ہی تو بندہ ہے اس لاہور میں جو زمانوں سے ترکی کے عشق میں مبتلا ہے۔ اور جب اس کے گھر کے دروازے پر دستک کے بعد اندر داخل ہوئیں تو ہر سو ترکی ہی ترکی بکھرا پڑا تھا۔ کہیں ترکی کی اعلیٰ قیادتیں بلند ایجوت شریک زندگی راشان ایجوت، طیب اردگان، صاحب خانہ کے ساتھ محبتیں بگھارتے تھے۔

بلغاریہ جانا اور اس پر لکھنا فرخ کا سب سے اہم کام ہے۔ روس بیسویں صدی کا سوویت یونین اگر آہنی پردوں کے پیچھے تھا تو بلغاریہ بارے ہلکی پھلکی سی شناسائی بھی عام لوگوں کے لیے صفر برابر تھی۔ سوویت سے متعلق پہلی تحریر عوامی سطح پر بیگم اختر ریاض الدین احمد کی تھی۔ مگر یہ کہنا پڑے گا کہ اس نے تصویر تو ضرور پیش کی مگر ایلیٹ کلاس کے حوالے سے۔ عوامی شناسائی کا ہلکا سا رنگ بھی نہ تھا اس میں۔ ایسے میں نوجوان فرخ خوف، ڈر، وسوسوں، خوشی ترنگ، کچھ جاننے کی آرزوں سنگ اس دنیا میں داخل ہوا تھا۔

سچی بات ہے بلغاریہ کا پڑھنے سے تعلق ہے۔ مشرقی یورپ تو یوں بھی تہذیبوں کے عروج وزوال کے آئینوں کا دلفریب عکس ہے۔ کمیونزم سے بھی اس کا عشق زوردار رہا۔ ایسے میں سوویت سمیت یہ خطہ انقلابی اور نظریاتی لوگوں کے خوابوں اور آرزوں کا مسکن تھا۔ کامریڈ فرخ بھی میری طرح انہی کھسن گھیریوں کا اسیر تھا۔

تمہارا بہت شکریہ فرخ۔ تم نے جب مجھے یہ کہا کہ ''میں ہوں جہاں گرد'' میں اور کچھ پڑھیں نہ پڑھیں بلغاریہ ضرور پڑھنا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے تمہارے ایران اور ہند ترکی کے اسفار تو میں بہت پہلے سے پڑھے بیٹھی ہوں۔ اسی لیے میں نے سب سے پہلے ملک ممنوع بلغاریہ کو کھولا۔ دن

اتوار کا تھا۔وقت گیارہ بجے اور میرے سامنے فرخ کا شرلک ہومز جیسا اسرار لیے خوبصورت تحریر تھی۔اب میں اس کے ساتھ ساتھ ہوں اس کی سرخ جنت میں جانے کے لیے۔اردنی عمار کی بات نے میری آنکھوں کو گیلا کر دیا ہے۔اگر مجھے سوویت یونین میڈیکل میں داخلہ نہ ملتا تو میں پاکستان کے شہر لاہور میں پڑھ رہا ہوتا۔ میرے اللہ میرا ملک تو مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے طالب علموں کا کبھی بہترین تعلیمی مرکز تھا۔آج یہ کہاں ہے؟

آنسو پونچھ لیے ہیں اور اندھیرے میں فرخ کی آنکھوں سے نظارے دیکھ رہی ہوں۔ ٹرین کی فیلسٹی کا بھی کیا لطف ہے۔ایدرنے کی تاریخ تفصیل۔وہ سلطان محمد فاتح اور امیگریشن آفیسر سے دلچسپ مکالمہ۔

میں اعتراف کروں گی کہ بلغاریہ کا پڑھنا میرے لیے ویسا ہی انوکھا تجربہ تھا جو ”روس کی ایک جھلک“ لکھتے ہوئے میرے اندر اترتا تھا۔میں اپنی اور فرخ کی اس حیرت انگیز مماثلت پر بھی حیران ہوں۔ کتنی عجیب بات ہے میں صفحہ نمبر 614 پر ہوں۔ اسلامی مرکز سے باہر آنے والی خواتین والا مکمل پیراگراف جیسے میرے اپنے خیالات اور طرز سیاحت کا عکاس ہے۔

کامریڈ فرخ کی سرخ جنت جس کے آسمانوں اور زمین کے ٹکڑوں پر بکھرے ہر ہر منظر پر وہ فدا ہو ہو جاتا تھا۔جس کی سڑکوں پر چلتے ہوئے وہ خواہشوں کے جلو میں سفر کرتا تھا۔ کامریڈ لیڈروں کے جابجا نصب مجسموں سے محبت اور وابستگی کی اُس رو میں بہتا تھا جس میں بہنے کی خواہش ہر کامریڈ کی دلی آرزو ہوتی ہے۔اس کی ارضی پیمائی وہ اپنے قدموں سے کر رہا تھا۔ اس کے چشموں کا پانی وہ آب حیات سمجھ کر پی رہا تھا۔

خوف، ڈر اور الٹے پلٹے خدشات کے سائے بھی میری طرح فرخ کے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ ڈر کے سنپولیے اُسے پیر پیر پر ڈنگ مارتے تھے۔ کہیں اس کے اندر خوشی و سرشاری کے جذبے نہال کرتے تھے۔اُسے شادمان کرتے تھے اس احساس کے ساتھ کہ وہ اپنے خوابوں کی سرزمین پر ہے اور اُسے دیکھ رہا ہے۔بعینہٖ میری طرح۔

انجوئے رائے، امرلعل، خٹک صاحب اور ان جیسے بے شمار غیر مقامیوں اور مقامیوں کا ملنا ویسا ہی تھا جیسا کہ ایک سچے سیاح کا ان اجنبی سرزمینوں پر خدائی عنایات کا نصیب ہونا ہوتا ہے۔

شہروں کے اِن قدیمی گلی کوچوں کے منہ متھوں پر تہذیبوں کے عروج و زوال کی

داستانیں رقم ہیں۔ کبھی اس کے تاج محل میں گھستا ہے۔ اس کی وادیوں کو جنت نظیر کہتا ہے۔ شہر شہر گھومتا ہے۔ نائٹ کلبوں میں رقص دیکھتا اور گیت سنتا اور جھومتا ہے۔

There lived a certain man in Russia long ago پڑھتے ہوئے میں خود بھی جھومی تھی کہ ایسے انوکھے تجربے مجھے بھی ملے تھے۔ فرخ کا اسلوب دل میں گھر کرنے والا ہے۔ سچا خلوص سے بھرا ہوا۔ جو اندر ہے وہ باہر ہے۔ اس نے یونہی تحریر کو لفظوں کے پھول بوٹوں سے نہیں سجایا۔ تشبیہیں، استعاروں سے اسے نہیں چمکایا۔ یہاں دل کی زبان ہے۔ جذبات کی زبان ہے۔ اور صرف یہی وجہ ہے کہ قاری اگر اُسے شروع کرے تو ممکن ہی نہیں کہ چھوڑ دے۔ کہ بیانیے کی روانی میں تاریخ کا بہاؤ بھی شامل ہوتا ہے۔ شور شرابا کرتے ہوئے نہیں۔ بس دھیمے سے لطافت کے ساتھ اتنا ہی کہ جتنا مناسب ہے۔ تہذیبی رنگوں کی پھوار بھی ماحول کو گل و گلزار کرتی ہے۔ تاریخی عمارات، حسین جگہوں اور کہیں کہیں اس کا سانس رکتا ہے کہ پیارا سا پرعزم لڑکا کسی سیاپے میں نہ پڑ جائے۔ مگر پھر اس کی سانسیں ہموار ہوجاتی ہیں۔ اور وہ آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ کمیونسٹ بڑھیا کا گھر، یونانیوں کا اپالونیا، باغ بہشت سے اڑن سفر تک بندہ سانس روکے پڑھتا چلا جاتا ہے۔ چلا جاتا ہے نہ اُسے ظہر کا پتہ نہ عصر کا۔ اور پھر آنکھ کھلتی ہے خواب ٹوٹتا ہے تو جانتا ہے کہ وہ کس سحر انگیز دنیا میں تھا۔ اس وقت میں جیسے ایک ٹرانس میں تھی۔ کچھ یاد آرہا تھا۔ کم و بیش وہی ماہ و سال جب تم بلغاریہ کے چوکوں، چوراہوں، سڑکوں، گلیوں، بازاروں، کیفوں میں مختلف قوموں، ملکوں اور مقامی لوگوں سے بات چیت کے سے شناسائی کے رنگوں سے ابھری دلکش تصویریں بنا رہے تھے۔ میں شمالی علاقہ جات کی وادیوں میں تجلّی ہورہی تھی۔ میرے اندر ایک سرگوشی ابھری تھی اس نے مجھ سے کہا تھا۔ کاش میں تمہاری بڑی بہن ہوتی۔ تمہاری ماں ہوتی تو بلغاریہ کا سفر تمہارے ساتھ کرتی۔ اور تم روس اور چین کا سفر میرے ساتھ کرتے۔ ہم پشکن اور دوستوئیفسکی کے گھر بیٹھ کر مزے سے ان کی کتابوں پہ باتیں کرتے اور بیجنگ کے تھین آن من سکوائر میں 1989 کے شہید ہونے والے بچوں کی فاتحہ پڑھتے تو فرخ کیسا مزہ آتا۔

جیو میرے بچے بہت مبارک باد اتنا خوبصورت سفرنامہ لکھنے پہ۔

☆☆☆☆☆

میشیل ہوئل بیک کی ''غیر مفاہمتی نظمیں''

حامد یزدانی

شاعری میں کردار ہی نہیں الفاظ بھی بسیرا کرتے ہیں''۔

شاعری سے متعلق اس دل چسپ بیان کے خالق میشیل ہوئل بیک جن کا نام گذشتہ برس ادب کے نوبل پرائز کے لیے پسندیدہ لکھاریوں کی فہرست میں بھی میں گردش کرتا رہا ہے ۱۹۵۸ کو فرانس کے جزیرہ ری یونین میں میشیل تھامس کے نام سے پیدا ہوئے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ عالمی ادبی منظرنامے میں اپنا ایک متنازع مگر اہم مقام بنا چکے ہیں۔ ویسے تو انھوں نے مضامین بھی لکھے اور شاعری بھی کی بلکہ کچھ سال قبل ایک فلم میں اداکاری کے جوہر بھی دکھائے مگر ان کی پہچان بنانے میں ان کے ناولوں نے زیادہ قابلِ ذکر کردار ادا کیا۔ ان کے اندازِ تحریر کو دیکھتے ہوئے بعض ناقدین انھیں دورِ حاضر کے موثر ترین روایت شکن کہانی کاروں میں شمار کرتے ہیں۔ ان کے ناول اتنے مقبول ہوئے کہ ان کی شہرت فرانس کی حدوں کو عبور کر گئی۔ وہ ''پلیٹ فارم'' ہو یا ''نقشہ اور خطہ'' یا پھر ''اطاعت'' ان کا ہر ناول کسی نہ کسی انداز میں متنازعہ رہا تاہم ان کی حقیقی شہرت ''اطاعت'' سے ہوئی جس میں انھوں نے فرانس پر انتہا پسند مسلمانوں کے قبضے کی فرضی تصویر کشی کی ہے۔

میشیل ہوئل بیک کی شاعری بھی بیاباں کے انہی خطوط پر سفر کرتی دکھائی دیتی ہے جس کا مطالعہ ہمارے سامنے آج کے ایک انقلابی لکھاری کا ایک مکمل خاکہ ہمارے سامنے ابھارتا ہے۔ وہ آزاد اور پابند نظمیں بھی لکھتے ہیں اور نثری بھی۔ اور ان کے موضوعات متنوع ہوتے ہیں ۔ ان کی فرانسیسی نظموں کے چار مجموعوں کی منتخب نظمیں سن دو ہزار سترہ میں گیون باوڈ کے انگریزی ترجمے کے ساتھ "غیر مفاہمتی نظمیں" کے نام سے ایک جلد میں شائع ہوئی تھیں۔ ان کے ناولوں سے ملتے جلتے موضوعات کی حامل ان کی یہ نظمیں انفرادی تجربے اور آفاقی جذبوں کی گہرائیوں کا سفر ہے جو اپنے دامن میں محبت، ناامیدی، بربادی، تھکن اور حتمی نجات جیسے موضوعات سمیٹے ہوئے ہے۔ وہ سُپر مارکیٹوں، سفر کے جدید وسائل، لاتعلق مناظر اور تنہا راتوں کے جال میں پھنسی دنیا میں بھی کہیں تو تقدیس کے نشانات ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو کہیں وہ انسان کے ناقابلِ تسخیر زوال کو ابتری اور انتشار سے تعبیر کرتے ہیں۔

ان کی نظموں کی ہیئت اور بردم میں جدید اور قدیم حُسن دونوں جھلکتے ہیں۔ زبان روزمرہ کی تروتازگی سے معمور ہے۔ ان خوبیوں کے سبب یہ نظمیں بودلئر کی روایت کی امین قرار پاتی ہیں اور نئی شاعری کے لیے سمت نمائی کا فریضہ ادا کرتی ہیں۔ ناقدینِ ادب ہوئل بیک کو عہدِ رواں کے ان صاحبِ ادراک لکھاریوں میں شمار کرتے ہیں جو ہمارے دور کے اس گمبھیر تناؤ سے ہم کلام ہیں جس کی مختلف صورتوں سے مصالحت اور موافقت ممکن نہیں۔ اس تناظر میں ان کی شاعری کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ انگریزی میں مترجمہ پانچ نظمیں جو مجھے دستیاب ہوئیں انھیں اردو قالب میں ڈھال کر آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ یہ نظمیں شاعر کے فن کی نمائندہ ہیں اس کا میں دعویٰ نہیں کر سکتا کیونکہ دیگر تخلیقی کاموں کی طرح شاعری کے حوالے سے بھی پسند و ناپسند کا تعین تو پڑھنے والے کا معیارِ ذوق ہی کرتا ہے

دراڑ

جمود میں، ایک ناقابلِ تسخیر سکوت
وہاں ہوں میں۔ میں تنہا ہوں اور ہلتا ہوں
جب وہ مجھے مارتے ہیں
میں ایک لال اور لہو رستی شے کو بچانے کی کوشش میں ہوں۔
دنیا بے کم و کاست ایک بدلحاظ انتشار ہے۔
آس پاس اور بھی لوگ ہیں، میں ان کی سانسیں سُن سکتا ہوں
اور جنگلے پر آ کر اس کے میکانکی قدم باہم مل جاتے ہیں
تاہم میں نے محسوس کیا ہے غم اور غصہ

میرے قریب، بہت قریب، ایک اندھا آہ بھرتا ہے۔
میں کب سے بچا ہوا ہوں۔ مضحکہ خیز ہے نا یہ بات۔
مجھے اچھی طرح یاد ہیں امید کے زمانے
حتیٰ کہ مجھے اپنا ابتدائی بچپن بھی یاد ہے
لیکن اب لگتا ہے کہ یہ میرا آخری کردار ہے۔
تمھیں معلوم ہے؟ میں نے پہلے لمحے ہی
میں اسے صاف دیکھ لیا تھا
سردی تھی مگر مجھے خوف سے پسینہ آ رہا تھا
پُل ٹوٹ چکا تھا، یہ سات بجے کا وقت ہوگا
ایک دراڑ تھی بس، خاموش اور گہری۔

ناوجود کی زندگی

میں پیدا ہوتے ہی خود کو بوڑھا محسوس کرنے لگا تھا
دوسروں نے جنگ کی، آرزو کی اور آہیں بھریں
میں نے اپنے اندر کچھ محسوس نہیں کیا ایک
مبہم سی خواہش کے سوا
میرا بچپن تو کوئی تھا ہی نہیں
گہرے جنگلوں میں کہیں دُور، کائی کے قالین پر
مکروہ درختوں کے تنے اپنے پتوں کی بقا
میں کوشاں
ان کے چاروں طرف سوگ کی فضا ہے۔
پھپھوندی اس کی کالی اور گندی جلد پر پھٹتی ہے۔
میں نے کبھی خدمت نہیں کی۔ نہ کسی شے کی،
نہ کسی انسان کی
افسوس، تم بُری طرح جیے حال آں کہ سب
تمھارے لیے ہی تو ہے
ذرا سی حرکت بھی ایک مسئلہ ہے
تم دکھی بھی محسوس کرتے ہو مگر اہم بھی
تم مبہم سے انداز میں حرکت کرتے ہو ایک
چھوٹے سے کیڑے کی طرح۔
تم اب بس نہ ہونے کے برابر ہو پھر بھی کس
بُری حالت میں ہو
تم اپنے ساتھ ایک طرح کا پاتال لیے
پھرتے ہو
رذیل، نقل پذیر اور کچھ مضحکہ خیز سا۔
اب تم موت کو کوئی مہلک شے نہیں سمجھتے
تم وقتاً فوقتاً ہنس بھی دیتے ہو: خاص کر آغاز پر
تم بے سود کوشش کرتے ہو حقارت اپنانے کی
پھر تم کچھ بھی قبول کرنے لگتے ہو، باقی کام
موت کر دیتی ہے۔

الوداع

کہیں نہ کہیں ہمیشہ ایک شہر ہوتا ہے جس
میں شاعروں کے آثار ہوتے ہیں
جس کی دیواروں کے درمیان ہی وہ اپنی
منزلیں عبور کرتے رہتے ہیں
پانی، ہر طرف پانی، یادوں کی گنگناہٹ
لوگوں کے نام، شہروں کے نام، فراموشی۔
اور پھر سے وہی پرانی کہانی شروع ہو جاتی ہے
مٹتے ہوئے آفاق اور مالش کے کمرے
فرضی تنہائی، باعزت ماحول
اور کچھ لوگ جو وجود رکھتے ہیں اور رقص
کرتے ہیں۔
وہ کوئی اور ہی مخلوق ہے، وہ کسی اور ہی نسل

کے لوگ ہیں
ہم کسی ظالمانہ رقص کی شان میں رقص آغاز
کرتے ہیں
اور اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر جنت
کے مالک بن بیٹھتے ہیں
اور پھر وہاں جگہ پا لینے کی درخواستوں کا
لامتناہی سلسلہ۔
اُدھر وقت، بُوڑھا وقت اپنے انتقام کے
منصوبے بناتا ہوا
غیر یقینی افواہوں کی طرح گزرتی زندگی
ہوا کی سرسراہٹ، پانی کی ٹپ ٹپ
اور ایک زردی مائل کمرے میں پیش قدمی
کرتی ہوئی موت۔

....

میرا جسم

میرا جسم ایک بوری کی طرح ہے جسے سرخ
دھاگے سے سیا گیا ہے
کمرا تاریک ہے اور میری آنکھوں میں
مریل سی چمک ہے
میں اُٹھنے سے ڈرتا ہوں، میں محسوس کرتا
ہوں اپنے اندر
کچھ نرم سے، کچھ بُرا سا، حرکت کرتا ہُوا
میں برسوں نفرت کی ہے گوشت کے اس
لوتھڑے سے
جس نے میں ہڈیوں کو ڈھانپ رکھا ہے،
چربیلی بافت سے
درد میں سریع الحس، بلجا، مسام دار
مجھے غصہ آتا ہے، میرے خدایا، کہ تم نے
مجھے یہ جسم دیا
دوست نظروں سے اوجھل ہوتے جاتے
ہیں، فرار ہوتے جاتے ہیں تیزی سے
سال پر سال گزرتے جاتے ہیں، ہاتھوں سے
پھسلتے جاتے ہیں، مگر کوئی قیامت نہیں آتی
میں جینا نہیں چاہتا اور مرنے سے مجھے ڈر
لگتا ہے۔

....

ایسا بھی نہیں---

ایسا بھی نہیں۔
میں اپنے جسم کو اچھی حالت میں رکھنے کی
کوشش میں ہوں
ہو سکتا ہے وہ مر چکا ہو، مجھے معلوم نہیں
کچھ ایسا ضرور ہے جو کرنا چاہیے اور وہ میں
نہیں کرتا
اس سال میری عمر بہت تیزی سے بڑھی
آٹھ ہزار سگریٹ پھونک چکا
سر اکثر دکھتا ہے، بہت دُکھتا ہے
پھر بھی جینے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہونا ہی
چاہیے؛ کچھ ایسا جو کتابوں میں نہیں
یہاں کتنے ہی انسان ہیں، کردار ہیں مگر میں
ایک برس سے دوسرے تک پہنچتے ہوئے
بمشکل انھیں پہچانتا ہوں
میں انسان کی عزت نہیں کرتا: ہاں اُس پر
رشک کرتا ہوں

☆☆☆☆☆

اعجاز رضوی کا تصورِ حیات و کائنات

میں حیران ہوں نظم کے اتنے اعلیٰ شاعر کو ناقدین نے پچھلے چالیس سالوں سے کیوں نظر انداز کیا۔ مجھے اپنے طور پر ایک وجہ تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ جہاں کہیں رضوی، نقوی یا کاظمی لکھا آجائے ادیبوں، نقادوں کی صفوں میں موجود مذہبی تعصب اور منافرت سے بھرے نام نہاد دانشور بغیر سوچے سمجھے اس پر خطِ تنسیخ پھیر دیتے ہیں اور دوسری وجہ غزل مارکہ روایت زدہ دقیانوسی گروہ نظم دشمنی کے سبب نظم کی لطافتوں سے حظ اٹھانے کی توفیق سے محرومی کے باعث چاہتے ہیں کہ نظم تو مر ہی جائے تو اچھا ہے۔ ایک تیسری وجہ اعجاز رضوی کی فنون اور احمد ندیم قاسمی سے طویل رفاقت بھی ہوسکتی ہے کہ ان گروہ بندیوں نے بھی ادب کو کوئی کم نقصان نہیں پہنچایا ورنہ اعجاز رضوی جیسے انتہائی توانا شاعر کا ہونا ہیئت کی فکری وسعت اور صنفی ارتقاء کا معتبر حوالہ ہوا کرتا ہے۔ یہ لوگ اس لیے بھی غیر معمولی اور کمیاب ہوتے ہیں کے ان کے اندر موجود تخلیقی اضطراب صدیوں کے تہذیبی بگاڑ کے نتیجے میں ان کو ورثے میں میسر آتا ہے۔

سچ پوچھیں تو شاعری کی پہلی بنیادی شرط اضطراب ہے۔ محبت ہو اضطراب نہ ہو، فکر و فلسفہ ہو اضطراب نہ ہو، فنِ شعر سازی پر حد درجے کی مہارت ہو، زبان پر عبور ہو لیکن اضطراب نہ ہو تو باقی سب کچھ صرف اور صرف باقی سب کچھ تو ہوسکتا ہے شاعری نہیں ہوسکتی۔ تخلیقی عمل کے تناظر میں اضطراب کو وہی حیثیت حاصل ہے جو کسی ماں کو بچے کی ولادت سے لیبر پین اور

فرحت عباس شاہ

پیدائش تک کے عمل کی ہے۔ اسی طرح کسی بیج کے وجود کے شق ہو کر نئی کونپل کے پھوٹنے کے عمل میں موجود غیر محسوس ارتعاش سے بھی مشابہہ قرار دیا جا سکتا ہے جو شاید ہمارے لیے غیر محسوس ہو لیکن بیج کے لیے اتنے ہی اضطراب اور تکلیف کا باعث ہو جتنا بچے کی پیدائش کا عمل ایک ماں کے لیے۔ اعجاز رضوی ایسا ہی خالص شاعر ہے جس کے پاس اضطراب کی دولت ہے۔ یہ اضطراب کہیں ہلکی سی اداسی تو کہیں بے پناہ کرب کے شانوں پر ہاتھ رکھے اس کی نظموں میں ستاروں کی طرح ٹمٹماتا پھرتا ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ معاشرتی اقدار کے عدم توازن سے جنم لینے والا یہ اضطراب اگرچہ انسانی رویوں کی دین ہے لیکن اعجاز رضوی کی شاعری میں کہیں بھی تلخی کے قریب سے بھی گزرتا دکھائی نہیں دیتا بلکہ قاری کو ایک تعمیری صبر اور ترفع پر مائل کرتا ہے۔ یہ ایسا صبر ہے جو آگے بڑھ کر پہلے سے بڑی ذمہ داری اٹھانے اور اسے نبھانے کے عہد جیسے اعلیٰ انسانی فعل سے مرصع ہے۔ اگرچہ اعجاز رضوی بنیادی طور پر نظم کا شاعر ہے لیکن ایسا شاعر جو تخلیق کے بنیادی اوصاف اور سچائی کا حامل ہو غزل لکھتے ہوئے بھی اپنی انفرادیت اور تخلیقی بلندی کا اسی طرح ثبوت دیتا۔ غزل دیکھیے ---

خوابوں کے انبار اٹھائے پھرتا ہوں
کاندھوں پر گھر بار اٹھائے پھرتا ہوں

ایک پرندے کی خاطر میں صدیوں سے
شانوں پر اشجار اٹھائے پھرتا ہوں

دل کی اندھی گلیوں اندھی سڑکوں پر
کیوں تصویرِ یار اٹھائے پھرتا ہوتا ہوں

بچپن میں اک کاغذی کشتی کیا ڈوبی
میں اب تک پتوار اٹھائے پھرتا ہوں

شاہوں کی صحبت کا ادنیٰ تحفہ ہے
ہاتھوں پر دستار اٹھائے پھرتا ہوں

اس کے آنسو شبنم تھے اور میں اعجاز
ہاتھوں پر کہسار اٹھائے پھرتا ہوں

....

ہمارے ہاں صبر کی تلقین دو پیرائے میں کی جاتی ہے ایک صبر وہ ہے جسے حکمران طبقہ اپنے جبر اور ستم کے خلاف محتاج بنائی گئی عوام کی صدائے احتجاج کو دبانے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کرتا ہے اور دوسری تلقین وہ ہے جو کربلا کے مظلومین کا درس ہے جو اپنی ذات پر ہونے والے مظالم پر صبر کرنے اور ظالم کے خلاف مزاحمت

جاری رکھنے کی طاقت بخشتا ہے - اعجاز رضوی اسی کربلائی صبر کا حامل ہے جو مصاحبین شاہ بن کر عزت پانے والوں کے سروں کو ہمیشہ بے دستار رہ جانے کا شعور دیتا ہے۔ غلامانہ صبر اور انقلاب کے خواب دیکھنے والوں کے صبر کے درمیان فرق اور امتیاز کی یہ لکیر اعجاز رضوی کی شاعری کا نمایاں وصف ہے جو اسے اردو کے دیگر شعرا سے ممیز بھی کرتا ہے اور ممتاز بھی۔ اگر شکیب جلالی کی شاعری کا بغور مطالعہ کیا جائے تو یہی صبر اس کے ہاں تلخی اور مفرد مگر زیرلب احتجاج میں بدلتا ہے لیکن اعجاز رضوی کی شاعری میں ارفع شعری اظہار میں متشکل ہوتا ہے۔

یہ نظم دیکھیے:

مجھے ڈھونڈو

میں چھپا ہوں فصیلِ جسم کے پیچھے
مجھے ڈھونڈو
مجھے دیکھو
کہ میری خشک آنکھوں میں تمہاری شبنمی
تصویر بن جائے
مرا بھی دن نکل آئے
مجھے تھامو
مرے قدموں تلے مٹی نہیں پتھر کی ڈھیری ہے
مرے تلووں میں ٹھنڈک کی جگہ گرمی لہو کی ہے
مجھے تولو
کہ مجھ کو بھی مری قیمت کا اندازہ تو ہو جائے
مرا دل بھی مری حالت پہ مسکائے
یہ دنیا دیکھ لے یوسف کے بکنے کا حسیں منظر
کہ اک انّی کے بھاؤ پر بکا کرتے ہیں پیغمبر

....

نظم میں چھپنے اور مضبوطی سے قائم رہنے کا عمل اتنی گہری واردات کا حامل ہے کہ اس کی حقیقی تفہیم قاری اور نقاد دونوں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے - جن معاشروں میں انسانی ذلت رواج پا کر اپنی کاٹ کھو بیٹھے اور اجتماعی سطح پر قبول کر لی جائے تو پھر عزتِ نفس اور انسانی تکریم کی پاسداری کے حامل کسی بھی حساس انسان کے لیے منہ چھپائے پھرنے کے سوا کوئی چارہ باقی نہیں رہتا لیکن حق اور عدل کا شعور رکھنے والا انسان اس تمام معاشرتی ابتری کے باوجود اپنے رویے، کردار اور نظریے سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹتا۔ اعجاز رضوی کی یہ نظم اسی وضعدار اور حوصلہ مند انسان کی داخلی شکست و ریخت، نفسیاتی و نظریاتی مزاحمت کی نمائندگی کرتی ہے - جو معاشرتی ناہمواریوں کو نارمز کے طور پہ قبول کرنے کے بجائے ان کے مداوا کی کوشش سے باز نہیں آتے۔

ایک اور نظم دیکھیے:

”مجبوری“

اب سمیٹو بدن اور رخت سفر باندھ لو
دوستو!
یوں جیو جیسے ریشم کا کیڑا جو اپنی ہی تخلیق میں
قید ہے
ان درختوں کو دیکھو
جو ریشم کی خاطر لہو بیچتے ہیں مگر سارا ریشم
کوئی اجنبی کھردرے جسم پر اوڑھ کر اپنی
آنکھوں سے ان کی جڑیں کاٹتا ہے
مگر سارا جنگل اسے بادشہ مانتا ہے

....

نظم ایک طرف طاقتور طبقے کی بے حسی اور درندگی کو بے نقاب کرتی تو دوسری طرف تمام تر مشکلات اور مسائل کے باوجود فطرت کے ارتقا کے جاری وساری عمل سے ہمت کشید کر کے زندہ رہنے کی طاقت کو بحال رکھنے کی وضاحت ایسے شعری گداز سے ظہور پذیر ہوتی دکھائی دیتی ہے کہ نظم کو کھولنے کے بجائے اسے محسوس کر کے لطف وشعور حاصل کرنے کی کیفیت سے نکلنا مشکل لگتا ہے۔

اعجاز رضوی کی شاعری درخت، پہاڑ، ستاروں اور دریا جیسے استعاروں کو داخلی کیفیات کے بیان کا وسیلہ بنانے سے سے زیادہ کائناتی عمل کی ابدیت کے ثبوت کے طور پر سامنے لاتی ہے۔ اعجاز رضوی کی فکر انسان کو کائناتی ابدیت کا ایسا حصہ قرار دیتی ہے جسے زوال نہیں اور انفرادی داخلی سطح پر خالص انسانی جوہر کو تعمیر اور تخریب کے مسلسل جاری وساری سلسلے میں سے تعمیر کے دائرے سے منسلک ہو کر ابدیت حاصل کرنے کی طرف آنے کی ترغیب دیتی ہے۔ اعجاز رضوی علامہ اقبال کی طرح انسان کو مردِ مومن کے بجائے خالص انسان کا تصور دیتا ہے جسے کسی خاص مذہبی نقطہ نظر سے تقویت لینے کے بجائے فطرت کے کائناتی عمل سے اثبات لیتا ہے۔

”میں اور دنیا داری“

کہیں تالاب میں مینڈک کی ٹرٹر سے
کنول کا پھول سہما ہے
کہیں گنبد پہ آوارہ کبوتر صبح سے ڈر کر
اندھیری رات کے حق میں دعائیں مانگتا
ہے اور
کہیں الو کی خواہش پر پرندے شیر کو محصور
کرتے ہیں
تو سورج مسکراتا ہے
میں اس منظر سے ڈرتا ہوں
مگر سورج، کبوتر، پھول، مینڈک، شیر اور
ننھے پرندے
سب مری ہستی کا حصہ ہیں
میں ان سے ڈر تو سکتا ہوں

نگر ان سے الگ رہنا میری طاقت سے باہر ہے

....

دور حاضر کی شاعری میں سب سے زیادہ جس چیز کی کمی نظر آتی ہے وہ فکر ہے۔ فکری ونظریاتی بنیادوں کے بغیر ایک ہجوم ہے جن میں سے ہر ایک خود کو عظیم شاعر قرار دے چکا ہے اور دوسروں سے منوانے کے لیے چاروں طرف دوڑتا پھرتا ہے۔ کوئی آسمان کو الٹا لٹکا کے پیروں میں پھینکنے کو بلند خیالی سمجھتا ہے اور کوئی یونانی فلسفیوں کے نام لکھ کر سمجھتا ہے کہ اس کی شاعری میں بہت بڑا فلسفہ موجود ہے بس دریافت کرنے والا نہیں مل رہا۔

یہ معذوری اور کمی ہمیں اعجاز رضوی جیسے انتہائی گنے چنے شعرا میں دور ہوتی نظر آتی ہے۔ اعجاز رضوی ایک مربوط فکر کا حامل اور واضح نظریے کا شاعر ہے اور اس نظریے کا اظہار کہیں بھی شعری کیف سے دور نہیں ہوا اور آخری بات کہ اس نے یہ نظریہ کتابوں سے کم اور زندگی سے زیادہ اخذ کیا ہے ورنہ اس کی شاعری میں فلسفہ تو ہوتا لیکن شاعری نہ ہوتی جبکہ یہاں یہ صورت ہے کہ شاعری اور فکر یعنی کیفیت اور خیال اتنے حسین اور بھرپور امتزاج سے آئے ہیں کہ اعلان نہیں کرنا پڑتا کہ ہم بڑی شاعری پڑھ رہے ہیں یا بڑا فلسفہ۔

آخر میں اپنے اس دعوے کے حق میں دلیل کے طور پر اعجاز رضوی کی نظم پیش کرنے کی جسارت کروں گا۔

''سنو اعجاز رضوی''

سنو اعجاز رضوی
یہ نگر جس میں تمہیں سانسوں کی گنتی کا عمل
سونپا گیا ہے۔
گو بظاہر خوبصورت ہے۔
یہاں ہر چیز جیسی ہے فقط ویسی نہیں رہتی
فقط ویسا نہیں جیسا تمہیں محسوس ہوتا ہے
یہاں میلی سی چادر پر بہت کچھ اس طرح
بکھرا پڑا ہے
جس طرح آنگن کسی بچے کے قبضے میں چلا جائے
جہاں تم ہو،
یہاں پر باغ بھی ہیں اور بیاباں بھی
یہاں کہسار بھی ہیں اور دریا بھی
تمہیں کس سمت جانا ہے؟
قدیمی باغ میں یا آج کے جنگل بیاباں میں
کسی کہسار پر یا ریت کے بھورے سمندر میں
سنو اعجاز رضوی! تم کہیں جاؤ
مگر یہ سوچ لینا
تم فقط اعجاز رضوی ہو
تمہارے ہاتھ میں لفظوں کا شیشہ ہے
کہ یہ شیشہ فقط تم ہو

☆☆☆☆☆

الگ راستوں کا دُکھ

جب راستے جُدا جُدا ہوں تو منزل یکجا نہیں ہوتی۔ جادۂ زندگی یکساں تو منزلِ مقصود مانندِ شبستاں۔ ممتاز امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ (Robert Frost) اپنی ایک نظم میں لکھتا ہے کہ میرے سامنے دورانِ گلگشت دو راستے آ گئے اور مجھے انتخاب ایک راستے کا کرنا تھا جو میں نے کیا اور دوسرے راستے کے سفر سے محروم رہا۔ اسی طرح جو حقیقی ہمسفر ہوتا ہے وہ آپ کا ہمدم و ہمراہ ہوتا ہے۔ الگ راستوں کا دکھ، زیست کے سفر میں بڑا کرب ناک اور دل سوز ہوتا ہے۔ یہ محبت کی پگڈنڈیوں کا سفر ہو یا زندگی کے لق دوق صحرا کا سفر ہو، دست در دست، قدم بہ قدم اور شانہ بہ شانہ ہم سفر ہو تو زندگی جنت وگرنہ دوزخ۔ ٹینسن (Tennyson) نے کیا خوب کہا تھا کہ وصال دوست جنت اور فراقِ دوست دوزخ ہے۔

'الگ راستوں کا دکھ' ممتاز شاعر، دانشور اور کالم نگار دوست محترم ڈاکٹر طلعت شبیر کا دوسرا مجموعہ کلام ہے جو پچاس غزلیات اور سینتیس منظومات پر مشتمل ہے۔ آپ انگریزی اور اُردو کے مایہ ناز ادیب ہیں۔ طلعت شبیر بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور آپ کے کلام کی بنیادی خصوصیت سلاست و بلاغت، غنائیت و موسیقیت ہے۔ آپ کی شاعری سادہ و سلیس ہے، جذبات میں شدت وحدت اور افکار میں جدت ہے۔ عشق میں طہارت، جنون میں نزاکت اور وجدان میں بصیرت ہے۔ رنگ و آہنگ شاعری رومانیت سے بھرپور، سماجی مسائل پر نگاہِ عمیق اور نفسیاتی معاملات پر مکمل دسترس اور غزلیات میں دردِ ہجراں کی تپش سوزشِ پروانہ ہے۔

مرزا غالب نے کہا تھا:

اُن کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

....

لیکن طلعت شبیر کا محبوب تو کارِ مسیحا کرتا ہے اور مُردوں کو زندہ کر دیتا ہے۔ کہتے ہیں:

تیری فُرقت میں مر گیا تھا میں
تیرے آنے سے جی اُٹھا ہوں میں

مقصود جعفری

بڑی شاعری میں استعارات و تشبیہات و تمثیلات کی معجز نمائی نمایاں ہوتی ہے جبکہ ایمائیت اور جوازیت ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔ شعر کے پہلے مصرع میں ایک دعویٰ کرنا اور دوسرے مصرعے میں دلیلِ دعویٰ گویا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ یہ طرزِ شاعری کمیاب و نایاب ہے۔ غزل کا شعر وجہ تسمیہ اور جوازِ شعر پر ملاحظہ کیجیے:

کٹ گرے گا تو سوکھ جائے گا
یہ شجر بھی شجر تو ہے آخر

چراغ حسن حسرت کی مشہورِ زمانہ غزل کا ایک شعر ہے:

غیروں سے کہا تم نے غیروں سُنا تم نے
کچھ ہم سے کہا ہوتا کچھ ہم سے سُنا ہوتا

طلعت شبیر کی شاعری میں مقامِ حیرت اور عالمِ بے خودی ہے۔ کہتے ہیں:

اُس نے بھی کچھ کہا نہیں
میں نے بھی کچھ سنا نہیں

یہ شعر سہلِ ممتنع کی بہترین مثال ہے۔ پیش محبوب شاعر مثلِ سنگِ گنبد ہے۔ زبانِ بے زبانی سے دونوں طرف سے سکوت کدۂ بے درکی صدا ہے۔ دل کی دھڑکنوں کے زیر و بم ہی آوازِ دلِ شکستہ ہیں۔ الفاظ ساتھ نہیں دیتے۔ خاموشی بہانگِ دُہل حکایتِ دل بیان کر رہی ہے۔ اشکِ خونیں شمعِ شب دیجور داغِ دل بقعۂ نور اور چشمِ گریاں رشکِ چراغِ طُور ہے۔ شاعری میں شام کا سماں خلوتِ جاں ہے۔ جب دن ڈھلتا ہے تو ڈھلتے سایوں کے ساتھ حساس دلِ شاعر ڈوبنے لگتا ہے۔ ڈولتا ہے دل سنبھلتا نہیں۔ دل مچلتا ہے۔ جذبات کا لاوہ اُبلتا ہے۔ بقولِ غالب:

جوئے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہوگئیں

ڈاکٹر طلعت شبیر کی دو غزلیات میں 'شام' کا لفظ بطور ردیف استعمال ہوا ہے۔ موسم اور زمان و مکاں کے اثرات انسانی نفسیات پر گہرے اثرات مرتب کرتے ہیں۔ درجِ ذیل اشعار میں شاعر کی آتشِ دروں شعبہ بار ہے۔ یہ اشعار دلِ شکستہ کی شمعِ فسردہ کے آئینہ دار ہیں۔ کہتے ہیں:

ایک دھڑکا سا لگا تھا شام سے
دل بھی مشکل میں پڑا تھا شام سے
آ گیا سورج ہتھیلی پر لیے
اِک دیا جو تو بجھا تھا شام سے
یوں جدا مجھ سے ہوا تھا شام کو
میں بھی کب اُس سے ملا تھا شام سے

'ایک شخص سارے شہر کو ویران کر گیا' کے مصداق اس رنجِ روح فرسا کو ڈاکٹر طلعت شبیر کا شہرِ نگاراں کو عزیزِ جاں اور کوئے یار کو سرمۂ چشمِ دلبراں گردانتے ہوئے پکار اُٹھتے ہیں!

سب سلسلے تھے شہر کے اُس کے وجود سے
وہ کیا گیا کہ شہر کا ہر سلسلہ گیا

....

جب پیار کے یہ سلسلہ ٹوٹتے ہیں تو شمعِ زیست ٹمٹمانے لگتی ہے اور بقولِ شاعر:

تم جو گُل کر گئے ایک تمنا کا چراغ
محفلِ زیست کی سب شمعیں بجھادیں میں نے

....

مشرقی طرزِ معاشرت میں اظہارِ عشق بھی ایک جرم اور ناپسندیدہ طرزِ عمل سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ ہماری روایات و رسوم ہیں۔ جب محبت بوالہوسی اور عشق بے وفائی ٹھہرے تو اُس سے اجتناب برتنا ہی بہتر ہوتا ہے۔ اس نازک اور حساس نکتہ کو ڈاکٹر طلعت شبیر نے معاشرتی رسم کے علاوہ ایک نفسیاتی مسئلہ بھی قرار دیا ہے۔ کہتے ہیں:

ایسے سہمے ہوئے پھرتے ہیں محبت کے امیں
جانے کیوں پیار کی نظروں سے بھی ڈر جاتے ہیں

....

غمِ جاناں اور غمِ دوراں ایک ہی مسئلے کے دو رُخ ہیں۔ جب ان کا اتصام ہو تو یہ غمِ انساں کی صورت میں اُجاگر ہوتے ہیں۔ مرزا غالب پر رومانویت غالب تھی۔ ان کی شاعری نفسیاتی، سماجی اور انقلاب ہونے کے باوجود رومانویت کے زیرِ اثر ہے۔ کہتے ہیں:

گویا میں رہا رہینِ ستم ہائے روزگار
لیکن تیرے خیال سے غافل نہیں رہا

رومانس انسان کا فطری جذبہ ہے۔ شاعر انسان دوست اور آزادی پرست ہوتا ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر کی شاعری غمِ جاناں کی داستان، غمِ دوراں کا بیاں اور غمِ انساں کی ترجمان ہے۔ یہ ”تکثیفِ غم“ حقیقی شاعری کا غمِ نہاں ہے۔ غزل مسلسل کا نمائندہ اور سرتاج میر تقی میر ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر کا رنگِ غزل دیکھئے:

پھر ستاروں کا سفر درپیش ہے
اور چراغوں کو سحر درپیش ہے
چاہتوں کے دُکھ مقدر ہو گئے
نفرتوں کی رہگزر درپیش ہے
کیا خزاں نے پیرہن بدلا نہیں
کیا شجر کو اِک شجر درپیش ہے

....

ڈاکٹر طلعت شبیر کی شاعری میں ارضِ وطن سے محبت اور اپنے آبائی گاؤں سے دیوانہ وار وارفتگی و دِل بستگی کا اظہار اُن کے کئی اشعار میں ملتا ہے۔ کہتے ہیں:

پھر نہ بیری ہو گی نہ ہی شیشم کا درخت
گاؤں کا گھر نہیں ہوگا تو کہاں جائیں گے

....

اپنے بچپن کے مسکن اور خوابوں کی جنت اپنے گاؤں کا ذکر ان دل دوز اشعار میں کرتے ہیں:

میں اپنے گاؤں کو پھر لوٹ جاؤں
یہی اب دل میں حسرت رہ گئی ہے
گاؤں میں کٹ گرا ہے مرا شجر سایہ دار
بستی میں اپنے درد کا درماں نہیں رہا

آپ کے اشعار میں 'گرد' لفظ جبر واستحصال، بربادی اور بدحالی کا استعارہ ہے۔ گردِ سفر کا استعارہ اکثر شاعروں کے کلام میں غبارِ زندگی کی علامت ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر نے زندگی کی تلخیوں اور تلخ حقیقتوں کو ایک شعر میں ایسے بند کر دیا ہے، جس کے لیے ساحر لدھیانوی کو پوری کتاب 'تلخیاں' لکھنا پڑی۔ کہتے ہیں:

یوں زندگی کی گرد میں سب ہی اَٹے رہے
جس نے رُخِ حیات سنوارا نہیں رہا

'الگ راستوں کا دکھ' آپ کی ایک نظم ہے جو کتاب کا سرنامہ ہے۔ آپ کے اشعار میں جابجا ''دکھ'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ کہتے ہیں:

چرچے بھی میرے دُکھ کے یہاں پر تھے جابجا
دنیا سے اپنا غم بھی چھپانا پڑا مجھے

اس تمام دکھ درد جو واردات عشقِ مجازی ہے کے ساتھ ساتھ آپ کے کلام میں سماجی تلخیوں، معاشرتی ناہمواریوں اور سیاسی بداعتدالیوں کی جھلک بھی موجود ہے:

مجھ کو معلوم سرِ دار ہوا
کیسے جی سکتا ہے مرتا ہوا شخص
پھر راستوں کی گرد میں اَٹ کے وہ رہ گئے
پھر رہ نمائے قافلہ سر پر نہیں رہا
شہر بیدار ہوا چاہتا ہے
کچھ تو اس بار ہوا چاہتا ہے
ایک مدت سے تیرے تابع تھے
اب کے اِنکار ہوا چاہتا ہے

کتاب کے آخر میں منظومات مختلف موضوعات پر ہیں جو بہت دل نواز بھی ہیں اور دل گداز بھی ہیں۔ 'انجانا خوف' میں نفسیاتی اُلجھن کا ذکر ہے۔ 'بے نام رشتہ' میں بھی نفسیاتی اور سماجی معاملات اظہر الشمس ہیں۔ 'الگ راستوں کا دکھ'، 'مسافت'، 'جرم'، 'تکریم' رومانوی نظمیں ہیں۔ نظم 'وقت' میں گاؤں کی یاد اور 'میں کہاں روتی ہوں بابا' ایک دو سالہ بیٹی کی ماں باپ سے فطری پُرخلوص محبت کا ذکر ہے۔ ان نظموں میں رومانوی، انقلابی، سماجی اور نفسیاتی رنگ و آہنگ ہے۔ علامہ اقبال نے شاعر کو ''دیدۂ بینائے قوم'' کہا ہے۔ شاعر صاحبِ شعور کو کہتے ہیں۔ شاعر کی نگاہ تیز بیں شاہین کی نگاہ ہوتی ہے۔ شاعر صاحبِ بصیرت ہوتا ہے۔ شاعرِ فطرت ولیم ورڈز ورتھ نے شاعر کو بیرومیٹر (Barometer) کہا ہے۔ ڈاکٹر طلعت شبیر چشمِ بصیرت، دلِ حساس، ضمیرِ زندہ اور شعورِ زندگی کے حامل ہیں اور اُن کا یہ دکھ ہر انسان کا دکھ ہے۔ یہ شاعری و ساحری نہیں بلکہ وہ نوائے پریشاں ہے، جس کے بارے میں علامہ اقبال نے کہا تھا:

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ
کہ میں ہوں محرمِ رازِ درونِ میخانہ

☆☆☆☆☆

فہمیدہ ریاض.....نسائی جذبات، رواج سماج اور احتجاج اور جرات اظہار کی شاعرہ

اردو کی پہلی شاعرہ کون تھی - تاریخ ادب کے اوراق اس بارے میں خاموش ہیں- البتہ بعض محققین نے اٹھارہویں صدی عیسوی میں شاعرات کی موجودگی کا سراغ لگایا ہے-اردو شاعری کی تاریخ میں شعرا کی روایت بہت مستحکم رہی ہے - جہاں تک شاعرات کا تعلق ہے-اس سرمایہ شعروسخن میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے مصداق رہی ہے -اکثر محققین نے ،چندا ساکن نامی خاتون کو اردو کی پہلی صاحبِ دیوان شاعرہ بتایا ہے- بعض نے جہانگیر بادشاہ کی ملکہ نور جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی زیب النسا اور میر تقی میر کی بیٹی کو شاعرات قرار دیتے ہوئے کچھ اشعار ان سے منسوب کیے ہیں- لیکن انیسویں صدی میں شاعرات کا کچھ کلام ملتا ہے- گلشن بے خار(نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ) اور طبقات الشعرائے ہند (شیخ کریم الدین)اور کچھ اور تذکروں میں شاعرات کا مختصر سا ذکر ملتا ہے- مگر ان کی تعداد پچاس سے بھی کم ہے- البتہ انیسویں صدی کی آخری اور بیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں متعدد شاعرات معروف ہوچکی تھیں- لیکن مشاعرے ان کے لیے شجر ممنوع تھے - دربارِ دہلی میں مغل شہزادیوں کے شعروسخن، لکھنؤ کے نوابین اور لکھنؤ کے بالاخانوں پر شاموں کی ساحراؤں کی شاعری کا سراغ ملتا ہے- بعض محققین نے شاعرات سے منسوب دواوین کا بھی پتا لگایا ہے- لیکن شاعرات کے زُمرے میں میراں بائی کے معروف و مقبول دوہوں کی مستحکم روایت کی طرز پر کوئی معروف نام اور کلام نہیں ملتا - لیکن جب دلی کالج اور فورٹ ولیم کالج کے قیام کے نتیجے میں اردو کا چلن عام ہوا تو شاعرات کا نام بھی تذکروں میں آنے لگا- یہ غزل کا زمانہ تھا-چنانچہ یہ شاعرات غزل گو شاعرات تھیں- مگر محمد حسین آزاد اور مولانا حالی نے جب انجمن پنجاب کے

محمد ظہیر بدر

مشاعروں کی بنیاد رکھی تو نئی شاعری کا چرچا ہوا۔ پھر جب ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو جدید اردو نظم فطرت نگاری اور معاشرتی اور سماجی مسائل سے دو قدم آگے سماجی ناہمواری و ناانصافی اور انسانی فطرت اور جذبات و احساسات کا عکس بھی نظر آنے لگا۔ ابھی تک اردو شاعری میں ''تذکرۃ النسا'' اس کی بے وفائی اور ہرجائی پن، اس کے حسن، غمزہ و عشوہ و ادا کے مضامین کو محیط تھا۔ گویا عورت شانِ محبوبی کے سنگھاسن پر براجمان ایسی جنس تھی جس کا شغل ستم ظریفی، کٹھور پن، اور بے وفائی و ہرجائی پن تھا۔ مگر ترقی پسند تحریک نے جب ذہنی آزادی اور موضوعات کو ادب اور ادب کو زندگی سے جوڑ دیا تو عورت نے سر اٹھایا اور اپنے جذبات اور محسوسات اور فطری خواہشوں کا بھی اظہار کیا۔ چنانچہ اردو میں نسائی یا نسوانی شاعری کی بنیاد پڑی۔ برعظیم کی تقسیم کے بعد دونوں مراکز اردو، پاکستان اور ہندوستان، میں شاعری اور مشاعروں کا در خواتین پر وا ہوا تو مشاعروں میں شاعرات کی موجودگی ضروری سمجھی جانے لگی۔ پاکستان میں ادا جعفری، پروین فنا سید، زہرا نگاہ، فہمیدہ ریاض، سارا شگفتہ، پروین شاکر، فاطمہ حسن شاہدہ حسن اور دیگر شاعرات کے نام سامنے آئے۔ ان میں بے باک طرزِ اظہار کے اعتبار سے سب سے بھرپور اور توانا آواز فہمیدہ ریاض کی تھی۔ انھوں نے پہلی نظم پندرہ سال کی عمر میں کہی جو احمد ندیم قاسمی کے زیر ادارت معروف ادبی جریدے ''فنون'' میں شائع ہوئی۔ فنون، ادب کی تشہیر میں اعلیٰ معیار کا نام تھا۔۔ ۱۹۶۶ میں فہمیدہ ریاض کی چھپے نظمیں، اب سو جاؤ، وہ لڑکی، ہاکس بے، سردیوں کی ایک شام، مری چنبیلی کی نرم خوشبو، ایک شام، چھپیں اس کے ساتھ معروف نقاد اور ناول نگار محمد خالد اختر نے فہمیدہ کے فن پر تعارفیے میں کہا تھا: ''اگرچہ فہمیدہ نہایت جدید شاعرہ ہے اور اس کی شاعری بھی جدید ہے اس کے باوجود سمجھ میں بھی آتی ہے، مسحور بھی کرتی ہے۔ جدید شعری رجحانات کے حوالے سے یہ کچھ عجب سا حادثہ ہے مگر بڑا خوش گوار حادثہ ہے۔'' محمد خالد اختر کے ان تاثرات سے فہمیدہ ریاض کی فکری اڑان اور فنی اپج کے ارتقا کا سراغ ملتا ہے۔ اس سے انھیں ہمت ملی اور ان کی ریاضت اور جرأت نے جلد ہی انھیں پاکستان اور بھارت کی صف اول کی شاعرات میں لا کھڑا کیا۔ ان کی شاعری ترقی پسند تحریک کے تحت جو اردو شاعری کے معیارات بتائے گئے تھے ان کے عین مطابق تھی۔

سماج سے بغاوت اور ظلم کے خلاف جرأت اظہار سے متصف، فہمیدہ ریاض نے اپنی نظموں کو ایک نئی طرح دی۔ انھوں نے عورت پر سماجی قدغن اور عورت کے جذبات و احساسات کے اظہار پر ہندو سماج کے

لگائے ہوئے قدغن کی روایت کو توڑنے اور حقوق نسواں کے لیے قلم اٹھایا۔ عورت کے بارے میں ان کی نظمیں جن خیالات اور محسوسات کا اظہار یہ ہیں اسے ہمارا سماج ایک عورت کے منہ سے سننے کا ابھی تک روادار نہیں ہو پایا۔ ان کی نظموں میں عورت کی جنسی حسیات بے باکانہ اظہار پر انھیں ایک رجعت پسند طبقے کی طرف سے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ مگر انھوں نے اپنی ڈگر سے سر مو انحراف نہ کیا اور ادائیگی میں نئی علامتوں اور استعاروں سے مطلوبہ معنی کشید کرنے روایت شکن روش پر قائم رہیں۔

فہمیدہ ریاض وسیع مطالعہ خاتون تھی۔ انھوں نے عالمی ادب اور عالمی ادبی اور محکوم اقوام کی حریت پسند تحریکوں میں ادیب کے کردار کا بھی گہرا مطالعہ کیا جس کا اظہار ان کی تحریروں اور نظموں سے بخوبی ہوتا ہے۔ ان کی نظموں میں فروغ فرخزاد، ناظم حکمت، پابلو نرودا، ژاں پال سارترے اور سائمن کے افکار کی باس ملتی ہے۔ ان کا نام نظم، خاص طور پر نظم آزاد میں جدید شعرا کی جس لڑی میں شامل ہے۔ ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ کھلے دریچے سے (فروغ فرخزاد کی نظموں کا ترجمہ)، آدمی کی زندگی، خط مرموز، بدن دریدہ، پتھر کی زبان، سب لعل و گہر، کیا تم پورا چاند نہ دیکھو گے، قافلے پرندوں کے، یہ خانۂ آب و گل، حلقہ مری زنجیر کا، اپنا جرم ثابت ہے، میں مٹی کی مورت ہوں۔ ادھورا آدمی، دھوپ وغیرہ ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ انھوں نے کراچی نام سے ایک ناول بھی لکھا جو سہ ماہی مجلے آج کے خصوصی شمارے، کراچی کی کہانی، میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں ان کے مضامین مقالے اور افسانے بھی ان کے تخلیقی سرمایے میں شامل ہیں۔ یہی نہیں انھوں نے جدید جدلیاتی فکر اور فن کے حوالے سے سماج کے رویوں کی سمت درست کرنے کے لیے جبر کے ادوار میں صحافتی جدوجہد کرتے ہوئے آواز کے نام سے ایک مجلہ بھی نکالا۔ قلم اور قول کے ذریعے ان کا مزاحمتی کردار ارباب اختیار کے لیے ناقابل قبول تھا۔ چنانچہ انھوں نے گھٹن کے اس دور میں وطن سے دور رہ کر اس جبر کا مقابلہ کیا۔ وہ جمہوریت اور انسانی حقوق، خاص طور پر حقوق نسواں کی علم بردار تھیں۔ ان کا شمار اردو کے ایسے شعرا میں ہوتا ہے جنھیں عالمی سطح پر پذیرائی حاصل ہوئی اور ان کی آواز سنی گئی۔ چنانچہ ہیومن رائٹ واچ کی طرف سے مزاحمتی ادب کی تخلیق کے اعتراف میں انھیں ہیمیٹ ہیلمن ایوارڈ(Hemmet Hellman Award) سے نوازا گیا۔ وہ کچھ عرصہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کی سربراہ بھی رہیں۔ اس کے علاوہ اردو لغت بورڈ میں بھی اہم عہدے اور منصوبے پر کام کرتی رہیں۔ ایک مترجم کے طور پر انھوں نے مثنوی مولانا روم

کا فارسی سے اردو ترجمہ کیا، انھیں شیخ ایاز ایوارڈ اور ستارۂ امتیاز، صدارتی تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔

فہمیدہ ریاض ۲۸ جولائی ۱۹۴۵ میں میرٹھ (انڈیا) میں پیدا ہوئیں۔ پاکستان بننے کے بعد ان کا خاندان حیدرآباد، پاکستان میں منتقل ہوگیا۔ ان کے والد ریاض الدین احمد ماہر تعلیم تھے۔ وہ چار سال کی تھیں جب ان کے والد کا انتقال ہوگیا اور انھوں نے والدہ کے سایۂ عاطفت و ملاطفت میں پرورش پائی۔ ان کے منشور حیات میں عورت کی حمایت میں شدید اظہار کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ انھوں نے اپنی والدہ کو بطور عورت جس طرح محنت اور فرض شناسی سے اولاد کی پرورش کرتے ہوئے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس اہم منصب پر فائز عورت کو اس کا اصل مستحق مقام نہیں دیا جاتا۔

فہمیدہ ریاض کو بچپن ہی سے اردو اور سندھی ادب سے دلچسپی تھی۔ انھوں نے فارسی زبان بھی سیکھی، وہ ریڈیو پاکستان سے بطور نیوز کاسٹر بھی وابستہ رہیں۔ ایم اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ان کی شادی ہوگئی اور وہ ۱۹۶۷ میں وہ لندن چلی گئیں۔ وہاں ایک عرصہ تک بی بی سی اردو سروس سے وابستہ رہیں۔ اس دوران انھوں نے وہاں فلم میکنگ میں ڈگری حاصل کی۔ خاوند سے طلاق کے بعد وہ پاکستان آگئیں۔ ان کی دوسری شادی ایک سیاسی شخصیت ظفر علی اجن سے ہوئی۔

فہمیدہ ریاض کی پہلے خاوند سے ایک بیٹی اور دوسرے خاوند سے دو بچے تھے۔ چند سال قبل ان کے جواں سال بیٹے کبیر کی رحلت کے صدمے نے انھیں اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا مگر وہ ایک عرصہ سے بیمار تھیں، تحریر و تصنیف کا کام موقوف تھا اور لاہور میں اپنی بیٹی ویرتا کے ہاں مقیم تھیں۔ چند روز پہلے انھیں شدید علالت کے باعث ہسپتال داخل کروایا گیا جہاں سے وہ سنین حیات کے تہتر برس گذار کر ۲۱ نومبر ۲۰۱۸ کو خالق حقیقی سے جا ملیں۔ عورت کے ان کی جنازہ ان کی بیٹی کے ہاں سے عسکری ون سے اٹھایا گیا اور انھیں کیولری گراؤنڈ کے قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ ان کے جنازے میں لاہور کے معروف ادیبوں او رعداحوں نے شرکت کی۔ یوں اردو میں آزاد نظم کی ایک منفرد اور موثر آواز معدوم ہوئی۔

جب بھی شاعری، خاص طور پر آزاد نظم میں عورت کی معنویت سے مزین شاعری اور جرأت اظہار کا ذکر آئے گا۔ تو فوراً جو نام ذہن کے کینوس پر ظاہر ہوگا وہ فہمیدہ ریاض کا ہوگا۔ فہمیدہ ریاض پر بھی عصمت چغتائی اور خالدہ حسین کی طرح ”بے باکی“ کا الزام آیا۔ اس کی سزا بھی انھوں نے سماجی رویوں کی صورت میں بھگتی۔

ان کی نظموں کے عنوانات ان کے فکر و نظر کے مرموز ہیں۔ مثلاً: عالم برزخ، باکرہ، چادر اور چار دیواری، ایک رات کی کہانی،

زبان کا بوسہ، ایک لڑکی سی، مقابلہ حسن، پچھتاوا، پتھر کی زبان، اور دیگر۔ ان کی چند نظموں سے اقتباس قارئین کے لیے یہاں درج کئے جاتے ہیں:

کب تک مجھ سے پیار کرو گے
جب تک میرا رنگ ہے تازہ
جب تک میرا انگ تنا ہے
پر اس کے آگے بھی تو کچھ ہے
وہ سب کیا ہے
کسے پتہ ہے
وہیں کی ایک مسافر میں بھی
انجانے کا خوف بڑا ہے
پر تم میرے ساتھ نہ ہو گے تب تک

رات اک رنگ ہے، اک راگ ہے، اک خوشبو ہے
مہرباں رات مرے پاس چلی آئے گی
رات کا نرم تنفس مجھے چھو جائے گا
دودھیا پھول چنبیلی کے مہک اٹھیں گے
رات کے ساتھ مرا غم بھی چلا آئے گا
اب مرے خانۂ دل میں بھی چراغاں ہوگا
یونہی ہر شب جو پگھلتی ہے سیاہی شب کی
اک لرزتا ہوا سایہ سا چلا آتا ہے
جس کے سینے میں دھڑکتا ہے طلائی مہتاب
رات کے پیار میں گم ذہن اگر یہ پوچھے
کون ہو تم مرے مہمان اندھیرے میں چھپے
چار اطراف بکھرتے ہوئے سناٹے میں
میرے افکار یونہی گونج کے رہ جاتے ہیں
ایسا لگتا ہے نہیں اور کوئی بھی موجود
بے کراں رات میں گھل جاتا ہے خود میرا وجود

تم چاند سے ماتھے والے ہو
اور اچھی قسمت رکھتے ہو
بچے کی سی بھولی صورت
اب تک ضد کرنے کی عادت
کچھ کھوئی کھوئی سی باتیں
کچھ سینے میں چبھتی باتیں
اب انھیں بھلا دو، سو جاؤ
اور اپنے ہاتھ کو میرے ہاتھ میں رہنے دو

جن پر میرا دل دھڑکا تھا
وہ سب باتیں دہراتے ہو
وہ جانے کیسی لڑکی ہے تم اب جس کے گھر جاتے ہو
مجھ سے کہتے تھے بن کاجل اچھی لگتی ہیں مری آنکھیں
اب تم جس کے گھر جاتے ہو
کیسی ہوں گی اس کی آنکھیں
تنہائی میں چپکے چپکے نازک سپنے بنتی ہو گی
تم جس کے گھر جاتے ہو کیا وہ مجھ سے اچھی ہو گی؟

یہ کیسی لذت سے جسم شل ہو رہا ہے میرا
یہ کیا مزا ہے کہ جس سے ہے عضو عضو بوجھل
یہ کیف کیا ہے کہ سانس رک رک کے آ رہا ہے
یہ میری آنکھوں میں کیسے شہوت بھرے اندھیرے اتر رہے ہیں
لہو کے گنبد میں کوئی در ہے کہ وا ہوا ہے
یہ چھوٹتی نبض، رکتی دھڑکن، یہ ہچکیاں سی

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر سعادت سعید ــــ جدید ترین نظم نگار

محمد نوید مرزا

ڈاکٹر سعادت سعید اردو زبان وادب سے تعلق رکھنے والے انتہائی اہم اور جدید نظریات رکھنے والے شاعر۔ نقاد، محقق اور مترجم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا نام نئی لسانی تشکیلات کے حوالے سے جانا پہچانا جاتا ہے اور اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ وہ اس تحریک کے چند نظریہ ساز نقادوں میں سے ایک ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید 15 مارچ 1949 کو لاہور میں پیدا ہوئے ان کے والد الف دنسیم کا نام بھی اردو کے قابل ذکر ناقدین میں لیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے ابتدائی تعلیم ساہیوال سے حاصل کی۔ 1965 میں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی اے کرنے کے بعد وہ لاہور آگئے جہاں انہوں نے 1969 میں پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے اردو امتیازی حیثیت سے پاس کیا اور 1970 میں گورنمنٹ کالج راوی روڈ لاہور میں بطور لیکچرار اپنی ملازمت کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ گورنمنٹ کالج فیصل آباد میں تدریسی خدمات سرانجام دینے کے بعد وہ بطور اسسٹنٹ پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور آگئے۔ ڈاکٹر صاحب نے 1980 میں پنجاب یونیورسٹی سے اردو زبان وادب میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی اور 1995 میں ایسوسی ایٹ پروفیسر بنے۔ اس دوران وہ پانچ برس انقرہ یونیورسٹی ترکی میں اردو زبان وادب اور مطالعہ پاکستان کی تدریس کے سلسلے میں قیام پذیر رہے۔ ڈاکٹر صاحب نے بہت سی ملکی و غیرملکی ادبی کانفرنسوں میں شرکت کی اور وہاں ادب کے مختلف موضوعات پر مقالات پڑھے۔

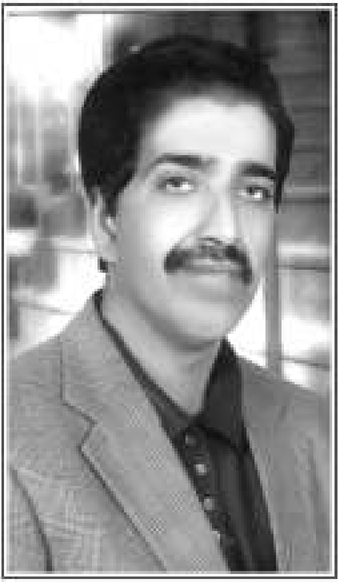

ڈاکٹر سعادت سعید کی شائع شدہ کتابوں کی تعداد دو درجن سے زائد ہے جن میں تنقید وتحقیق، تراجم اور شاعری کے چھ مجموعے بھی شامل ہیں۔ یوں تو ان کی بے مثال خدمات کا احاطہ کرنے کے لیے ایک پوری کتاب لکھی جاسکتی ہے لیکن یہاں ہم ان کی نظم نگاری کا جائزہ لیں گے۔ ڈاکٹر صاحب کے اب تک شائع ہونے والے تمام مجموعے نظم پر مشتمل ہیں جن میں کجلی بن، فنون آشوب، بانسری چپ ہے، من ہرن، الحان اور شناخت شامل ہیں۔ نظم کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے غزلیں بھی کہی ہیں اور اس صنف کے حوالے سے ان کی تخلیقی کاوشیں بھی ترتیب پا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کا مجموعہ ''کجلی بن'' جدید ترین نظموں کا ایک ایسا مجموعہ ہے، جس میں شاعر اپنی تخلیقی قوت کی انتہاؤں پر دکھائی دے رہا ہے۔ ایک شاعر جب اظہار کی جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے تو وہ بہتر سے بہتر کی خواہش میں مفہوم کی نئی نئی پرتیں سطر اندر سطر کہیں مخفی تو کہیں کھولنے میں مصروف عمل دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے شعری مسائل خاصے الگ ہیں وہ ماضی، حال اور مستقبل تینوں زمانوں میں شعری سفر کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ جس کی شاید ایک وجہ یہ بھی ہے وہ ایک ایسے وسیع المطالعہ شخص ہیں، جنھوں نے پاکستانی ادب کے علاوہ غیر ملکی ادب کو بھی اپنی روح میں سمویا ہوا ہے۔ ''کجلی بن'' کی زیادہ تر نظمیں عالمی مسائل کا احاطہ کرتی ہیں۔ دراصل یہ شاعری ہمارے سماج سے جڑی ہوئی ہے شاعر سماجی صورت حال کی بے اطمینانی پر اپنے اندر ایک تڑپ محسوس کرتا ہے۔ وہ کہیں معاشرے میں عدم مساوات تو کہیں ظلم وجبر کو دیکھ کر سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظمیہ شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے ہر کتاب کے طویل اور حاصل مطالعہ دیباچے لکھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب جدید نظریات کے حامل ہیں وہ ایک حقیقت پسند شاعر ہیں اور ان کی تنقید بھی حقائق سے آراستہ ہے۔ ''کجلی بن'' کے دیباچے میں لکھتے ہیں، ''حقیقی شاعری کی جڑیں ٹھوس انسانی صورت حال سے نمو پاتی ہیں۔ آگے چل کر نئی شاعری کے پس منظر میں لکھتے ہیں، ''اردو ادب میں نئی شاعری جس کے پس منظر میں نظیر اکبرآبادی اور اقبال جیسے بلند قامت شاعروں کی تخلیقات موجود ہیں اور جس کے انتہائی قریب معاصر مجید امجد ہیں تخلیقی صلاحیتوں اور مکافات کی نقیب ہے۔'' میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب نے ان شعراء سے کسی حد تک فیض تو حاصل کیا ہے مگر اپنے لیے الگ

اور نئی راہ نکالی ہے۔ یہ وہ شاعری ہے جسے سمجھنے کے لیے ابھی خاصہ عرصہ درکار ہے۔ ''کجلی بن'' میں موضوعات کی فراوانی کے ساتھ نت نئی لفظیات سے ان کی نظم میں ایک جادوگری کا احساس ہوتا ہے بقول عقیل اختر، ''کجلی بن'' کا شاعر تو یہ نو موضوعات کو گرفت میں لاتا ہے وہ سماجیات، سیاسیات اور اجتماعی نفسیات وجذبات پر بات کرتا ہے لیکن اس سارے مکالمے میں وہ اپنی کلیدی حیثیت منظرنامے سے اوجھل نہیں ہونے دیتا وہ جو کہتا ہے اس کی ذمہ داری قبول کرتا ہے وہ بنی بنائی تراکیب واستعارات سے دامن سمیٹتے ہوئے اپنی زبان خود اختراع کرنے پر قادر ہے یوں وہ اپنا لہجہ خود دریافت کرنے کی کامیاب سعی کرتا دکھائی دیتا ہے۔''

ڈاکٹر سعادت سعد نے ''کجلی بن'' کا انتخاب ''نئی اردو شاعری کے مآخذ جناب افتخار جالب کے نام کیا ہے اور وہ خود بھی اس قبیلے کے ایک فرد ہیں۔ جو نئے سے نئے خیالات پیش کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ اس کتاب میں یوں تو سارا کلام ہی خوبصورت ہے لیکن ''دستاب عذاب کا سرورق''، ''مسخ مسخ، نیلامی ہے''، ''آگ چھپائے پھرتے ہیں''، ''شیشہ خانے کرچی کرچی''، ''جنازے''، ''کب تلک یہ تماشہ''، ''فقط موت ہی میری تقدیر ہے''، ''یہ کیسے قحط پڑے'' اور ''کجلی بن'' جیسی شاہکار نظمیں خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔

ڈاکٹر سعادت سعید کا مجموعہ ''فنون آشوب'' ایک طویل نظم کی صورت ظہور پذیر ہوا ہے۔ جس میں ڈاکٹر صاحب نے مختلف حصوں میں تمام اہم فنون کا جائزہ بھی لیا ہے اور فنون لطیفہ کے حوالے سے اس شعبے میں فن اور فنکار کی کمی ہونے کا احساس بھی دلایا ہے۔ اس کتاب میں دراول تعارف کے طور پر بنام ''سلگتے کتبے گداھڑیوں سے بجے اپنے مقدور ہیں'' کے نام سے ہے۔ اس کے علاوہ سنگ تراشی۔ مصوری، خطاطی، شاعری، موسیقی اور رقص جیسے فنون کو بھی نظم کے رنگ میں بڑی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ اس حوالے سے وہ اس کتاب کے دیباچے میں لکھتے ہیں، ''تمام فنون کا بنیادی منشا و مقصد زندگی، انسان اور کائنات سے متعلقہ اسرار ورموز کی تحقیق و مظہر ہے۔ وہ فنکار جو اپنے فریضے کی خبر نہیں رکھتے اپنے ضمیر کے اظہار سے قاصر رہتے ہیں۔ فنکاروں کے لیے لازمی ہے کہ وہ اولین سطح پر زندگی کے مفہوم کا یقین کریں۔ اس کی حدود میں انسان کے مقام کا سراغ لگائیں اور اس حوالے سے کائنات کی تفہیم سے

عہدہ برآ ہوں۔''

کائنات کی تفہیم سے عہدہ برآ ہونا ایک بہت بڑا اعزاز ہے۔ تحقیق کرنے کا حکم تو خدائے بزرگ و برتر نے بھی دیا ہے اور اگر اس کا ایک بندہ جسے شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہوا ہے وہ یہ کہہ رہا ہے تو وہ عین خدا کے رستے پر چل رہا ہے۔ ''فنون آشوب'' ایک منفرد اور بڑی کاوش ہے۔

ڈاکٹر سعادت سعید کی کتاب ''بانسری چپ ہے'' بھی حقائق پر مشتمل نظموں کا ایک خوبصورت مجموعہ ہے لیکن اس میں شاعر نے کسی حد تک اظہار کے لیے مشکل استعارات و علامات کا سہارا لینے کے بجائے خاصی حد تک سادگی اختیار کی ہے مگر خیال میں گہرائی اور سطروں میں سچائی اسی طرح ہے جو ان کی نظم کی خوبی ہے مثال کے طور پر اس نظم کا بند دیکھیں ''یہ کس نے کہا:

یہ کس نے کہا ہے کہ انسان
زرو مال سے انس رکھتا ہے
واجب ہے اس کا
ہوس کار ہونا
غریبوں کی نیا ڈبونا

....

ان نظموں میں بھی سماج میں ہونے والی ناانصافیوں اور بے حسی کا تذکرہ بڑی خوبصورتی سے کیا گیا ہے اس کتاب کے دیباچے میں بھی ڈاکٹر صاحب اردو ادب میں اپنے نظریے کے ساتھ نظر آرہے ہیں فرماتے ہیں، '' اردو ادب میں دو نظریے ایسے ہیں جن کے وسیلے سے ادیب اور قاری کے شعور نے زندگی اور سماج کے ارتقا اور مسائل کو کسی حد تک سمجھنے کی کوشش کی ہے، ایک تو حقیقت نگاری کا نظریہ ہے اور دوسرا ترقی پسندانہ، جہاں تک حقیقت نگاری کا تعلق ہے اس نظریے کے پیروکار سماج کی پراگندگی، خباثت اور بدحالی کی تصویر کشی کرتے ہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں ''جہاں تک ہمارے ادب کے ترقی پسندانہ نظریے کا تعلق ہے - یہ امر اختلافی ہیں کہ اس نظریے نے اردو ادب کو وہ نیا رنگ دیا جس سے اس کی تاریخ کے اوراق خالی تھے یعنی ترقی پسندوں نے ادب اور زندگی کا طبقاتی بنیادوں پر مطالعہ کیا ان کا کہنا ہے کہ جب تک ادب کو طبقات اور طبقات کو سیاست سے مربوط نہ کیا جائے صحیح اور حقیقی شعوری تشکیل ناممکن ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کی یہ باتیں ہمیں بتاتی ہیں کہ وہ کس طرح ترقی پسند تحریک کے ایک سرگرم رکن ہیں ان کی شاعری اور نثر دونوں میں حقیقی طور پر ترقی پسندانہ نظریات واضح

دکھائی دیتے ہیں۔
ان کی زیرِ بحث کتاب ''بانسری چپ ہے'' شاید اپنے نام میں گہری معنویت رکھتی ہے بانسری کا چپ ہونا ممکن ہے کہ صدائے حق کے کمزور ہونے کے بارے میں کوئی اظہار ہو۔ اس کتاب کی نظموں میں ''شخصیت پرستی''، ''بے رنگ مٹیں''، ''یہ کس نے کہا''، ''اندھیرا''، ''پورا چاند'' اور ''بانسری چپ ہے'' خصوصی اہمیت کی حامل ہیں۔
ڈاکٹر صاحب کی کتاب ''من ہرن'' کا طویل دیباچہ بھی انہوں نے خود ہی بعنوان ''ادبی تخلیق اور بشریاتی جھنور'' کے نام سے لکھا ہے یہ کمال بھی ڈاکٹر صاحب کو حاصل ہے کہ آج کے دور میں جب شاعر کو ناقدین سے شکوہ ہے ڈاکٹر صاحب خود ہی شاعر اور خود ہی ناقد بھی ہیں۔ وہ ہر کتاب کے دیباچے میں کوئی نہ کوئی ایک ادبی بحث چھیڑتے ہیں، جس کے مثبت اثرات آنے والے کئی زمانوں میں ادبی دنیا میں دکھائی دیں گے۔
جہاں تک ''من ہرن'' کی شاعری کا تعلق ہے تو ان نظموں میں بھی خیال آفرینی، معنوی پرتیں اور گہرائی جا بجا نظر آتی ہے۔
من ہرن کے فلیپ پر یہ تین سطریں کتاب کے بارے میں جاننے کے لیے کافی ہیں ملاحظہ کریں: ''سعادت سعید کے شعری مجموعہ ''من ہرن'' کی نظمیں غمِ جاناں سے غمِ دوراں کے درمیان ان کے سفر کی فکری و تحقیقاتی روداد کی مظہر ہیں۔ ان میں انسانی تعلقات کی مصدقہ جہت کو بنیاد بنا کر شاعر نے انسان اور معاصر زندگی کو سمجھنے کا اہتمام کیا ہے۔'' ڈاکٹر صاحب کا شعری مجموعہ ''الحان'' بھی ایک منفرد کاوش ہے۔
انسان اور معاصر زندگی کو سمجھنا خاصا مشکل کام ہے۔ ڈاکٹر صاحب انسانی معاملات اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کو انتہائی گہرائی میں اتر کر دیکھنے کے عادی ہیں ''الحان'' کی نظمیں جنہیں صوتی شاعری کہا گیا ہے۔
شاعر کی فرد سے جذباتی وابستگی اور اپنے اندر کی بے چینی کی نمائندگی کرتی ہیں۔ ان نظموں میں انسانی نفسیات کو بھی پرکھا گیا ہے اور سماج میں پائی گئی مختلف بے قاعدگیوں پر بھی نظر ڈالی گئی ہے کتاب میں موجود ڈاکٹر صاحب کے تعارف میں ''الحان'' کے بارے میں لکھا گیا ہے ملاحظہ کریں، ''الحان'' انسانی نفسیات اور سماجی زندگی کی فکری اور جذباتی خصوصیات کو گرفت میں لینے والا مجموعہ ہے۔ ان میں سے بعض نظمیں جب 70 کی دہائی میں ''شب خون'' الٰہ آباد بھارت میں شائع ہوئی تھیں تو حصہ تعارف میں جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا تھا، ''سعادت سعید لاہور کے نوجوان شاعر ہیں

جن کی نظمیں پڑھ کر شعرالصوت اور شعرالمعانی کا فرق" پتہ چلتا ہے۔"

"الحان" میں موجود نظموں میں "مسافرت کے ہجوم"، "موت میں منقلب ہوتی تمنا کے آخری نقش"، "وجود کا امکان"، "پرانی قبروں کے نئے کتبے"، "اپنی معدومی کا دکھ"، "امانت" اور "اثبات کے ہجرت کدوں میں تلی کا گیت" پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ الحان کے بارے میں نعیم بیگ کی رائے بھی ملاحظہ کریں، "اس مجموعے کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ کوئی دمکتا نغمہ، گیت، کوئی حقیقی مسرت میں ڈوبی ہوئی آواز، کسی آورش کے زیر اثر بنائی گئی جنت کے وجود کا احساس دلاتی ہے۔ جہاں سب کچھ موجود لیکن معدوم ہے۔ ہجر و فراق، ناآسودگی تلخئ حیات اور بے اعتبار کیفیات روح کے گھاؤ کو اتنا گہرا کر دیتے ہیں کہ خود فراموشی در آتی ہے۔"

"شناخت" کے نام سے ڈاکٹر صاحب کا ایک مجموعہ نثری نظموں پر مشتمل ہے۔ نثری نظمیں یوں تو شاعر اور شاعری کو آسانیاں فراہم کرنے کے لیے وجود میں لائی گئی تھی لیکن نثری نظم لکھنے والے معدودے چند شاعر ایسے بھی ہیں جنھوں نے شاعری کی اس نسبتاً نئی صنف میں بھی امکانات پیدا کیے ہیں۔ ڈاکٹر سعادت سعید کی نظمیں بھی متاثر کن ہیں۔ اس حوالے سے وہ کتاب کے دیباچے میں "عصری کلیات کے احساساتی اسطریے" کے عنوان سے نثری نظم کا دفاع بھی بڑی خوبصورتی سے کرتے ہوئے کہا ہے، "نثری نظم میں جدید جذبات و احساسات کے آزاد وائی خاکے، وسطی آہنگ، بہاؤ اندرونی تعمیر کے انداز اور شعری سطروں کی تشکیل کے سلاسل موجود ہیں۔ آزاد نظم لکھنے والے روایتی اور مروجہ بحور سے اغماض نہیں برتتے۔ نثری نظم نگار ابھی تک روایتی قارئین کی طرف مائل ہیں اور باقاعدہ شناخت کے لیے کوشاں ہیں لیکن ان کے ذاتی شعور کے درجات انھیں ان کے اونچے چبوتروں سے نیچے نہیں آنے دیتا۔"

یہاں بھی ڈاکٹر صاحب نے نثری نظم کہنے والوں کے لیے کچھ سوالات اور سوچنے کے مواقع چھوڑ دیے ہیں، "شناخت" میں "لاحاصل تمام رشتوں کا"، "ہماری خودکشی کی لذت"، "قیامت کی ساعت"، "ہم سورج کی مانند" اور "زندگی آبرو" خصوصی اہمیت رکھتی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ادبی سفر جاری ہے اور ہماری دعا ہے تادیر وہ یونہی اعلیٰ ادب تخلیق کرتے رہیں۔ (آمین)۔

☆☆☆☆☆

اردو فلمی شاعری عروضی تجزیہ

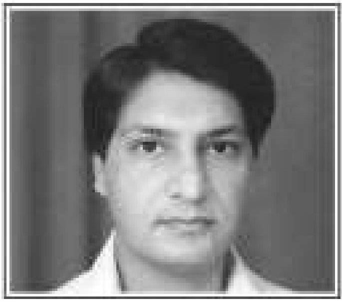

جب میں نے آفتاب خان کی کتاب ؛اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ ؛ دیکھی تو میرا خیال فوری طور پر موسیقی کی طرف چلا گیا کیونکہ موسیقی کے بغیر فلمی شاعری کا جواز ہی ختم ہو جاتا ہے تو میں نے مناسب سمجھا کہ پہلے تھوڑا سا موسیقی پہ بات کر لیتے ہیں- موسیقی سریانی زبان کا لفظ ہے دو الفاظ کا مرکب ہے مو+سیقی مو کا مطلب ہے ہوا اور سیقی گرہ لگانے کو کہتے ہیں- اس طرح موسیقی کا مطلب ہوا کو گرہ لگانا- موسیقی کا آغاز کب کہاں اور کیسے ہوا اس کے بارے میں کئی کہانیاں مشہور ہیں - ان میں ایک بڑی دلچسپ روایت ہے- اس روایت کے مطابق دیپک لاٹ نامی ایک پرندہ ہے جو ہزاروں سال تک زندہ رہ سکتا ہے- جب اس کے مرنے کا وقت قریب آتا ہے تو وہ اپنے اردگرد سوکھی ہوئی گھاس اکٹھی کر لیتا ہے اور اس میں دبک کر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے منہ سے سر نکلنا شروع کر دیتا ہے- جب اس کے منہ سے دیپک سر نکلتا ہے تو گھاس کو آگ لگ جاتی ہے اور وہ اس آگ میں جل کر راکھ ہو جاتا ہے اور اس کی راکھ سے ایک نیا پرندہ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ اسی طرح سلسلہ چلتا رہتا ہے

ایک اور روایت کے ایک دیوتا کی نو بیٹیاں تھیں ان میں ایک کا نام muses تھا اور وہ بہت اچھا گاتی تھی اس وجہ سے اس علم کا نام میوزک پڑ گیا- موسیقی کو سنسکرت میں دیپک لاٹ یونانی میں فیقس اور عربی میں ققنس کہتے ہیں-

موسیقی کے بارے اور بھی اس طرح کی کئی کہانیاں ہیں-

زبانوں کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ انسان پہلے اشاروں کی زبان میں باتیں

عرفان صادق

کرتے تھے پھر انہوں نے اشیا کے نام رکھنے شروع کر دیئے۔ جب انہوں نے باقاعدہ ایک زبان بنالی تو اس میں چیخیں شامل کر کے گیت کی بنیاد رکھی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسان ہمیشہ سے گیت گاتا رہا ہے گیت انسان کی جبلت میں ہے۔ اور وہ اپنی خوشی اور غم کا اظہار گیت کی صورت میں کرتا رہا ہے۔ انہیں اس بات کا کوئی اندازہ نہیں تھا کہ ان میں سر بھی ہوتے ہیں۔ یہ سارا کام تو بعد میں موسیقی سمجھنے والوں نے کیا ہے۔

آفتاب خان کی کتاب اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ پڑھتے ہوئے مجھے بہت خوشگوار حیرت ہوئی ہے۔ انہوں نے جتنے گیتوں کا عروضی تجزیے کے لیے انتخاب کیا ہے وہ بہت دل کو موہنے والے اور دل میں اترنے والے ہیں۔ میں ان کو پڑھ کر ایک عجیب قسم کی سرشاری سے گزرا ہوں۔ اور ایسے لگتا ہے کہ گیت پڑھتے ہوئے گلوکاروں کی مدھر آوازیں کانوں میں رس گھولنے لگی ہیں۔

آفتاب سے میرا تعلق کوئی بیس پچیس سال پرانا ہے۔ ان بیس پچیس برسوں سے میں نے آفتاب کو شعر و ادب سے ہی جڑا دیکھا ہے۔ وہ روزی روٹی کے لیے کوئی اور کام وام بھی کرتا ہوگا مگر میں نے ہمیشہ اسے شاعروں ادیبوں کے جھرمٹ میں ہی دیکھا ہے۔ ہم سب شاعری کے بارے میں جانتے ہیں کہ یہ لمبے سانس کی دوڑ ہے۔ اور جن لوگوں کی سانس تھوڑا سا دوڑ کر پھول جاتی ہے وہ اس دوڑ سے باہر ہو جاتے اور جو مسلسل اس دوڑ کا حصہ بنے رہتے ہیں وہ آفتاب کے قبیلے سے ہوتے ہیں آفتاب خان کی خوش قسمتی ہے کہ اسے علامہ بشیر رزمی جیسا استاد ملا جن کی علم و عروض پر دسترس کو سارا جہان مانتا ہے۔ شہزاد احمد شہزاد جیسے قادر الکلام شاعر بھی اُن کی اس خوبی کے معترف تھے اور انہوں نے ایک مرتبہ خود مجھ سے کہا کہ میں جب تک اپنی تازہ غزل علامہ بشیر رزمی صاحب کو نہ سنا لوں میں کسی مشاعرے میں نہیں پڑھتا۔ علامہ بشیر رزمی کے دیگر شاگردوں کی طرح آفتاب خان بھی علم عروض سے پوری طرح واقف ہیں۔ اس کے سارے اسرار و رموز کو سمجھتے ہیں۔ لیکن ایک چیز جو آفتاب خان کو دوسرے عروضی شعرا سے جدا کرتی ہے وہ شعر میں رس اور چمک ہے۔ اکثر یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ عروض کے ماہر شعرا کے ہاں اچھے شعر نہیں ملتے کرافٹ تو ان کا بڑے کمال کا ہوتا ہے لیکن شعر شعریت سے خالی ہوتے ہیں لیکن آفتاب کے ہاں یہ صورت نہیں اس کا کرافٹ بھی بہت اچھا ہے اور شعر بھی شعریت سے بھرپور ہوتے ہیں۔

ان کی یہ کتاب اردو فلمی شاعری کا عروضی تجزیہ

اس ریاضت کا منہ بولتا ثبوت ہے اور یہ کریڈٹ بھی انہیں جاتا ہے کہ انہوں نے فلمی شاعری کو عروض کے پیمانے پر دیکھا ہے۔ جن شاعروں کو ناقدین اور استاد شعرا شاعری ہی نہیں مانتے۔ یہ الگ بحث ہے بلکہ بحث برائے بحث ہے۔ شاعری شاعری ہوتی ہے چاہے وہ فلمی شاعری ہو مشاعرے کی شاعری ہو یا کتاب کی صورت میں۔ اگر وہ شاعری ہے تو اس سے انکار کی کوئی صورت نہیں۔

میرے خیال میں آفتاب خان نے جن گیتوں کو عروض تجزیے کے لیے منتخب کیا ہے۔ اُن گیتوں کو پڑھ اور سن کر انسان جن خوبصورت کیفیتوں سے گزرتا ہے اس کا بیان لفظوں سے باہر ہے۔ ادب عالیہ یہی تو کام سرانجام دیتا ہے۔ اچھے شعر کی کون سی خوبی ہے جو ان گیتوں میں موجود نہیں اور پھر جن لوگوں نے یہ گیت تحریر کیے ہیں اُن کا نام پڑھ کر کسی قسم کا ابہام رہتا ہی نہیں ہے۔ اردو شاعری کی ایک کہکشاں سجی ہوئی ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شاعر اور ایک سے بڑھ کر ایک گیت۔ ساحر لدھیانوی، قتیل شفائی، شکیل بدایونی، کلیم عثمانی، منیر نیازی، راجندر کرشن، راجہ مہدی علی خاں، حسرت جے پوری، ندا فاضلی، آنند بخشی، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری۔ گیتوں کے نیچے جب ہم ان شعرا کے نام پڑھتے ہیں تو یہ اپنے پورے قد کے ساتھ ہمارے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ ان شعرا نے ایسی ایسی کیفیات کو اپنے شعروں میں ڈھالا ہے کہ ہم پڑھتے ہوئے اور سنتے ہوئے عش عش کر اٹھتے ہیں۔

لوگ اکثر شعرا کو سہل پسند سمجھتے ہیں۔ یہ چلتے پھرتے غزلیں، نظمیں لکھ لیتے ہیں حالانکہ یہ کام بھی کوئی سہل پسندی والا نہیں۔ خون کو جلانا پڑتا ہے۔ محنت کرنی پڑتی ہے کئی جہان کھنگالنے پڑتے ہیں پھر کہیں جا کر دو چار مصرعے ہاتھ لگتے ہیں لیکن آفتاب نے شاعری کے ساتھ ساتھ نثری میدان میں بھی اپنے آپ کو منوایا ہے۔ آپ اندازہ کریں کہ اس نے کتنی محنت کی ہے۔ 240 صفحات کی کتاب میں بے شمار گیت منتخب کیے پھر علم عروض کی روشنی میں مختلف بحور کے گیت الگ کیے۔ ان کی ایک ترتیب بنائی یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ پھر شاعروں کے نام، موسیقاروں کے نام اور صداکاروں کے نام اس پر بہت محنت کی کہیں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔ میرے خیال میں یہ بہت بڑا کام ہے۔ میں آفتاب خان کو اس خوبصورت کاوش پہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

استفادہ - اردو شاعری کا فنی ارتقا - پنجابی شاعری تے موسیقی

☆☆☆☆☆

محمد علی فضل خوبصورت اور سچے جذبات واحساسات کا شاعر

محمد علی فضل ایک خوبصورت ، منفرد اور حساس شاعر ہیں جو بات کو اپنے انداز اور لہجے میں کہنا جانتے ہیں- انھوں نے ذریعہ اظہار اپنی ماں بولی پنجابی اختیار کیا ہے، جس میں ان کے کلام کی بے ساختگی ان کی شاعری کو مزید نکھارتی ہے اور سننے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے- یہ بات کو قارئین تک خوبصورتی سے اور مکمل طور پر پہنچانے کے فن سے پوری طرح آگاہ ہیں- ان کی شاعری میں انسان اور انسانیت بولتی ہے- معاشرہ تہذیب، ثقافت اور ہمارے اِردگرد کی زندگی چلتی پھرتی نظر آتی ہے- لوگوں کے رویے اور آپس میں سلوک اور برتاؤ ان کے خاص موضوعات ہیں- یہ روزگار کے سلسلہ میں دیارِ غیر میں عرصہ دراز سے مقیم ہیں- اس لیے اپنے وطن سے دوری اور وطن کی مٹی سے محبت اور اس کی کشش اپنے لوگوں سے ایک خاص محبت اور عشق بھی ان کے موضوعات میں شامل ہیں- ان کی شاعری میں ایک خاص کشش ہے جو سننے اور پڑھنے والے کو اپنی طرف کھینچتی ہے- محمد علی فضل شاعری کی ان بلندیوں پر فائز ہیں اور اس مقام پر نظر آتے ہیں جو کسی بھی معاشرے میں ایک شاعر ادیب اور دانشور کا ہونا چاہیے- اپنے وطن سے دور رہنے کی وجہ سے تنہائی کا احساس ان کی طبیعت میں شامل ہو چکا ہے جس کا اظہار ان کی شاعری میں جگہ جگہ نظر آتا ہے- انھوں نے اپنی شاعری میں اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے اور ان کے جذبات کی سچائی ان کے اشعار میں چلتی پھرتی نظر آتی ہے - ان کی شاعری پڑھتے چلے جائیں آپ کا دل نہیں بھرے گا اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے کلام میں وہ چاشنی ہے

فیصل زمان چشتی

وہ کشش ہے جو قاری کو کہیں اور متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ ان کے ہاں بھرتی کا کوئی شعر نظر نہیں آتا بلکہ ہر شعر انتخاب نظر آتا ہے۔
اس لیے ان کی شاعری کے جہان سے نکلنے کا دل ہی نہیں کرتا۔ ان کے مشاہدات و تجربات جب ان کی قوتِ متخیلہ سے باہم ملتے ہیں تو ایسی شاعری کشید ہوتی ہے جو آج کی ضرورت بھی ہے اور ادب کی ترویج کے لیے آکسیجن کا کام بھی کرتی ہے۔ یہ آمد کے شاعر ہیں اس لیے ان کی شاعری اپنی طرف مائل کرتی ہے اور اس کو پڑھتے ہوئے نئے جہاں اور نئے در وا ہوتے ہیں۔
آج کے دور میں نیا شعر کہنا اور نئی بات کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے اور محمد علی فضل کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے نئی بات بھی کی ہے اور منفرد اشعار بھی نکالے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی آواز بھلی لگ رہی ہے اور ہجوم میں پہچانے بھی جا رہے ہیں۔ ان جیسے سچے اور سُچے تخلیق کار کم کم ہی نظر آتے ہیں یہ شاعری کے ذریعے اپنی بات کر کے اپنا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں جو ان کے دل پہ گزرتی ہے یا محسوس کرتے ہیں یہ اس کو بیان کر دیتے ہیں اور یہی اصل شاعری ہے کیونکہ آجکل شاعری میں دل کی بات کم اور کاریگری زیادہ چل رہی ہے اصل شعر وہی ہوتا ہے جو وارداتِ قلبی کے بعد برآمد ہوتا ہے۔ آج کل ادب اور شاعری کاروبار بنے ہوئے ہیں اس لیے کاریگری کا عنصر غالب نظر آتا ہے حقیقی اور سچا شعر قسمت سے ملتا ہے لیکن محمد علی فضل کی شاعری ان کے دل کی آواز اور ان کے مشاہدات و تجربات کا نچوڑ ہے اس لیے یہ خود ہی کہتے ہیں کہ:

درد لکاون تے ای ہو گیا شاعراں وچ شمار
ورنہ علم عروض نہیں میتوں نال تقطیع درکار

اپنے شعراں اندر اکھر لبھ لبھ کدی نئیں جوڑے
میتوں جیویں خیال آوندا اے ورقیں لواں اُتار

پنجابی، صوفیوں، درویشوں اور بزرگوں کی زبان ہے۔ صوفیائے کرام نے پنجابی زبان میں اتنے اعلیٰ درجے کی شاعری کی ہے کہ اس کے سامنے ٹھہرنا اور اپنا آپ منوانا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ فیض احمد فیض جیسے جید اور طاقتور شاعر نے بھی پنجابی شاعری کی لیکن اردو کی طرف یہ کہہ کر چلے گئے کہ پنجابی زبان میں اتنے بڑے بڑے شاعر موجود ہیں کہ اگر میں ان کی طرح کا ایک مصرعہ بھی کہہ سکا تو یہ میری بڑی کامیابی ہو گی۔ بزرگ صوفی شعرائے کرام نے عشقِ حقیقی ہجر و فراق سماجی و معاشرتی رویے اور اس سے جڑے مسائل اپنی شاعری میں اتنی خوبصورتی اور عمدگی سے بیان کیے کہ اکثر اشعار ضرب الامثال کی حیثیت اختیار کر گئے اور ہمارے روزمرہ معاملات میں

دہرائے جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں لوگوں اور معاشرے کی رہنمائی نظر آتی ہے۔ محمد علی فضل اس بات پر مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اُن صوفیا اور بزرگان کی اس شاندار شعری روایت کو کامیابی سے نبھایا بلکہ اس کو خوبصورتی سے آگے بڑھانے میں بھی کامیاب ٹھہرے اور یہ بات ان کی شاعری کی کامیابی کی ضمانت بھی ہے۔ اس کے ساتھ پنجابی زبان کی بھی خوش قسمتی ہے کہ اُسے ایک اور بہترین اور خوبصورت شاعر مل گیا ہے، جو اس کی روایات کا امین بھی ہے اور اس زبان کی چاشنی اور روشنی کو پوری دنیا میں بانٹنے کا باعث بھی بن رہا ہے۔
محمد علی فضل نے حمد، نعت، سلام، منقبت، نظم اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں ان کے تخلیقی جوہر کھل کر سامنے آئے لیکن غزل لکھتے ہیں یہ زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں غزل کے موضوعات کو وسعت دے کر انھوں نے اس کے کینوس کو اور بڑا کیا ہے۔ ان کی غزل میں موضوعات کا تنوع ان کے وسیع المطالعہ معاملات پر دسترس اور باریک بینی کا غماز ہے اور عہد موجود میں ضرورت اس امر کی ہے کہ شاعری محض تلذذ کا ذریعہ نہ ہو بلکہ مقصدیت بھی پیش نظر رہے تب جا کر ہی ادب اور ادیب اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکتے ہیں۔

معاشرے اور سماج میں سرایت کردہ جھوٹ، فریب، بے ایمانی، بے انصافی، حسد، دھوکہ ان کو بحیثیت انسان بہت تکلیف پہنچاتی ہیں اس لیے انھوں نے اس بات کو مشن سمجھتے ہوئے ان برائیوں پر قلم اُٹھایا ہے اور ان کی شاعری میں زیادہ یہی موضوعات زیرِ بحث آتے ہیں۔ امیر اور غریب کے درمیان فرق ان کو بہت تکلیف دیتا ہے - یہ معاشرے میں برابری اور مساوات کے قائل نظر آتے ہیں۔ سماجی برائیوں کے خلاف بات کرنا یہ جہاد سمجھتے ہیں۔ اسی لیے ایک جگہ کہتے ہیں کہ:

جتھے گھوڑیاں کتیاں لئی تے گھر ہوون
انساناں دے رہن لئی کرنا بہت اوکھا اے

دن ڈبے تے کم نہ ملن دا دکھ جاگے
سکھے ہتھیں گھر نوں مڑنا بہت اوکھا اے

....

ایک اور شعر دیکھیے جس میں یہ مزدوروں کی بات کرتے نظر آتے ہیں:

عید اُتے وی مزدوراں دے حال نئیں رہندے چنگے
علی کدی مزدو نئیں لایاں ویس اپنے نوں سنگار

....

لوگوں کے عمومی رویوں اور دھوکہ فریب کے حوالے سے ان کے دو اشعار دیکھیے:

دس تینوں کی لبھا میری آنکھیں گھٹا پا کے
میری نظر تے دوئی ہو گئی تیتھوں دھوکہ کھا کے

ٹھگاں پچھے لگ کے کاتوں پینڈا کھوٹا کرئیے
سنڈھیاں والے گھراں چوں لسّی کون لیاوے جا کے

....

ان کی شاعری میں بیشتر غزلیں غیر مردف ہیں صرف قافیہ کے زور پر شعر نکالے گئے ہیں۔ کیونکہ ردیف اپنی طاقت کے زور پر مصرع کھینچ لاتا ہے جبکہ غیر مردف غزل میں خیال کی طاقت شعر کو بناتی ہے اور موضوع سامنے لاتی ہے۔ محمد علی فضل ایک توانا شاعر ہیں جس کے پاس خیالات اور موضوعات کی کمی نہیں ہے اور یہ ہر قسم کا شعر کہنے کی صلاحیت اور قدرت رکھتے ہیں۔ رباعی لکھنا آسان نہیں ہوتا ہے اس کے لیے خاص مہارت اور ریاضت کی ضرورت ہوتی ہے انھوں نے پنجابی زبان میں رباعیات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ یہ کسی شعری صنف میں کمال دکھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

ہر مسلمان کی طرح اہل بیتِ اطہار اور کربلا کے ساتھ عقیدت اور احترام ان کے خون میں شامل ہے اور یہ مودت ان کی سانسوں کے ساتھ ساتھ چل رہی ہے اور خون میں رواں دواں ہے۔ کربلا کے ساتھ انسیت اور جرأت شاعری میں دکھ درد اور کرب لے آتی ہے اور کربلا اور کربلا سے جڑے استعارے شاعری میں غم کی ایک مخصوص فضا قائم کر دیتے ہیں اور محمد علی فضل کی شاعری میں وہ ماحول اور فضا بخوبی محسوس کی جا سکتی ہے۔

پنجابی شاعری میں الفاظ کا چناؤ بھی بہت اہمیت کا حامل ہوتا ہے اور محمد علی فضل اس سلسلے میں بڑے محتاط رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں الفاظ کا چناؤ اور استعمال اتنا اعلیٰ اور خوبصورت ہے کہ ان کی شاعری ایک ایسا گلدستہ معلوم ہوتی ہے جس میں ہر قسم کا اور ہر رنگ کا پھول موجود ہے جس کی خوشبو سے دل و جان معطر رہتے ہیں۔

ان کی شاعری سے پنجابی زبان کے اعتماد میں مزید اضافہ ہوا ہے اور پنجابی زبان کا وقار بھی بڑھا ہے اور اس بات پر بھی یقین کامل ہوا ہے کہ جب تک محمد علی فضل جیسے دھرتی سے پیار کرنے والے اپنے لوگوں سے محبت کرنے والے، اپنی روایات، تہذیب و ثقافت اور اقدار کو پروان چڑھانے والے وجود رہیں گے پنجابی زبان اپنی ترقی کی منازل طے کرتی رہے گی اور محمد علی فضل جیسے خوبصورت شاعر اپنی دھرتی کا احسان اتارتے رہیں گے۔ آخر میں ان کے دو اشعار:

وانگر برف دے کھر جاناں اے
مٹی بیٹھاں ٹر جاناں اے

مٹی بیٹھ تماشا کیہہ اے
جتھوں کسے نہ مڑ آناں اے

☆☆☆☆☆

جاوید قاسم............ایک آفاقی شاعر

عہد جدید نے اسلوبیاتی اور فکری تغیرات کی صورت میں جہاں دیگر اصناف ادب پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں وہاں شاعری بھی ان ارتقائی تبدیلیوں سے اپنا دامن نہیں بچا پائی۔ چنانچہ غزل ہو یا نظم تجربات کی بھٹی سے گزر کر لمحہء موجود کو پہنچی ہے۔ اسلوبیاتی، موضوعی اور لسانی تجربات نے شاعری کے فکری و معنوی دامن کو نئے امکانات سے روشناس کروانے کے ساتھ ساتھ اس کی ہیئت، ڈکشن اور ترکیبی روایت کے بنیادی ڈھانچے کو بھی نیا آہنگ دینے کی کوشش کی ہے۔ شاعری چونکہ اب کلاسیکیت، نیو کلاسیکیت اور جدیدیت کے مراحل سے گزرنے کے بعد مابعد جدیدیت کے مقام پر منتج ہو رہی ہے لہٰذا اس کی ساختیاتی، لسانی، استقرائی اور انتقادی تبدیلیوں سے صرفِ نظر کر کے اس کو سمجھنا ہرگز ممکن نہیں۔ میرے نزدیک شاعری کے محاسن جیسا کہ ڈکشن، بلند پروازیٔ تخیل، ابلاغ، مقصدیت، ترجمانی، سلاست، روایت، تازگی، شگفتگی وغیرہ دراصل ایسے ترکیبی اجزا ہیں جن کا مطمعِ نظر براہِ راست شعر کی زندگی کو دوام دینا ہے۔ احمد ندیم قاسمی چونکہ شاعری کو روزِ ازل کی تخلیق قرار دیتے ہیں لہٰذا ہر تخلیق رسمی طور پر اپنی وجودیت اور اعتباریت میں زمانی و مکانی حدود کی پابند ہے۔ اگر کوئی تخلیق کار اپنی تخلیق کو ان رسمی حدود کے دائرے سے باہر نکالنا چاہے تو وہ اپنی فکری ریاضت، عمیق مشاہدے، تخلیقی انہماک، فنی پختگی، جداگانہ اسلوب، شعری روایت سے جرأت اور لازوال قدری موضوعات کی مدد سے آفاقی پیکر کے قالب میں ڈھال سکتا ہے۔ یہی وہ بنیادی اوصاف ہیں جو ہر بڑے تخلیق کار چاہے وہ انگریزی ادب سے جان کیٹ، پی بی شیلے، شیکسپیئر وغیرہ ہو یا فارسی ادب سے رومی، حافظ، سعدی وغیرہ ہو، پنجابی سے ڈاکٹر فقیر، سلیم کاشر، منظور وزیر آبادی وغیرہ یا اردو ادب سے میر تقی میر، غالب، اقبال، فیض وغیرہ کی شاعری

عاصم بخاری

میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔
بدقسمتی سے فی زمانہ شہرت کی چکا چوند نے تخلیق کاروں کو فنی محاسن و اوصاف پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے تشہیری مہم جوئی پر لگا دیا ہے جس سے جہاں ان کی شاعری کی عمر مختصر ہوتی جا رہی ہے وہاں معیار بھی مفقود ہے۔ مگر اب بھی ادبی منظر نامے پر کچھ ایسے شعرا موجود ہیں جو نہ صرف حرف کی معنویت و حرمت سے واقف ہیں بلکہ آفاقیت پر مبنی کلام کی تخلیق میں ہمہ وقت مصروف ہیں۔ ایسے ناموں میں ایک نام میاں چنوں سے تعلق رکھنے والے کہنہ مشق شاعر جاوید قاسم کا بھی ہے جنہوں نے گزشتہ چار دہائیوں سے شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔
جاوید قاسم کی شاعری یکجہت ہونے کے باوجود کثیرالجہت ہے اور کثیرالجہت ہونے کے باوجود یکجہت ہے۔ ان کی شاعری عرفانِ ذات اور شعورِ کائنات کی ایسی منازل کی طرف کھینچتی ہے جو تصوف اور مجذوبیت کے مابین گاہے گاہے اپنے ہونے کا پتہ دیتی ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک ایسے شاعر کے طور پر سامنے آتے ہیں جو اپنی فکری دسترس کے ذریعے کائناتی صداقتوں کو لفظوں کا پیراہن دے کر اذہان کی شعوری تربیت کرتا ہے۔ وہ کائنات کے تشکیلی عناصر میں اپنی وجودی حیثیت اور اپنے وجود کے اندر کائناتی انجذاب کو بڑی سلیقہ مندی سے موضوعِ سخن بناتے ہیں۔ ان کا فکری سفر ایک ایسے دائرے سے شروع ہوتا ہے جو بنیادی طور پر مرکزیت کا نقطہ ہے مگر یہ نقطہ اپنے اندر آہستہ آہستہ جزو سے کل کا سفر کرتے ہوئے کائنات کے ظاہری و باطنی پہلوؤں کو اپنے حصار میں لے لیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ابدی اور آفاقی سچائیوں سے اس طرح جوڑتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود ان کی علامت بن جاتے ہیں۔ ان کی تخیلاتی رسائی کے سامنے جہانِ رنگ و بو کی وسعتیں سمٹ کر رہ جاتی ہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر قاری مرئی یا غیر مرئی طور پر محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک جذب و مستی میں ڈوبے درویش کے فیض سے اپنی حیثیت کے مطابق مالا مال ہو رہا ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا میں یہ فکری سطح خال خال ہی ملتی ہے۔
ان کی شاعری کا ایک امتیازی وصف فلسفہ خیر و شر کو جملہ روایت سے ہٹ کر نئے آہنگ سے بیان کرتا ہے۔ انہوں نے اس موضوع پر کھوکھلی مصرع سازی کے بجائے باضمیر انسان کو خیر کی علامت کے طور پر پیش کرتے ہوئے کائنات کی یکجہتی علامات کے ساتھ اپنے آپ کو کمال خوبصورتی سے ضم کر لیا ہے۔ وہ ایقان کو انسانی کردار کا مرکزی وصف گردانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک مصمم اور پختہ یقین ان کے کلام میں جا بجا وجود پاتا ہے۔ وہ انسان کو لازوال سمجھنے کے بجائے انسانی قدروں کو آفاقی سمجھتے ہوئے ان کا پرچار کرتے ہوئے نظر

آتے ہیں۔ ان قدروں کے تحفظ کے لیے ان کے اندر کا درویش نعرۂ مستانہ بلند کرتا ہوا مزاحمت کے راستے پر چل نکلتا ہے۔ یوں علامہ اقبال کا مردِ مومن مقامِ حجرہ سے مقامِ معرکہ کی طرف قدم اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ اگر ڈاکٹر طارق عزیز نے انہیں عہدِ نو کا منصور بن حلاج قرار دیا ہے تو یقیناً ان کا نعرۂ منصوری ہر قسم کی مصلحتوں سے سراسر آزاد اور لاتعلق نظر آتا ہے۔ وہ سامراجیت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اسکے پیکر کو اپنی شعری ضرب سے اتنے ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے ہیں کہ اس کے لیے خود کو جوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔

ان کی شاعری میں انسانی کرب و آلام صرف لفظی طور پر ہی نہیں حقیقی طور پر بھی ملتے ہیں۔ وہ اپنے اردگرد سے مکمل طور پر نہ صرف باخبر نظر آتے ہیں بلکہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے معاشرتی محرومیوں اور استحصال کو اپنے قلم کا موضوع بھی بناتے ہیں۔ ان کا دکھ انفرادی ہوتے ہوئے بھی اجتماعی ہے۔ وہ انسانی مشکلات کو اپنی کمزوری نہیں بلکہ حوصلے کے ذریعے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ یہی عنصر ان کی انقلابی فکر کی راہ ہموار کرتا ہے۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں بھی میدانِ عمل میں کھڑے رہ کر اپنے یقین کے سہارے دوسروں کے لیے حوصلے اور ہمت کا استعارہ بن جاتے ہیں۔

جدید کلاسیکیت کا رنگ ان کی شاعری پر چھایا ہوا نظر آتا ہے۔ ان کا اسلوب، آہنگ، ڈکشن، صوتی تاثر، شعری ابلاغ، فکری مواد، تازہ لہجہ، تراکیب، موضوعات میں تنوع، شعری بنت، خیال آفرینی، شعری اظہار وغیرہ نہ صرف ان کا اپنا تراشیدہ ہے بلکہ اسے روایتی و جدید غزل دونوں میں خوبصورت اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے نئی تشبیہات اور استعارات تراشنے کے بجائے فی زمانہ رائج تشبیہات و استعارات کو نئے مفاہیم و معانی عطا کر دیے ہیں تاکہ قاری کو لفظی اجنبیت سے بچایا جا سکے۔ انہوں نے کہیں کہیں اس حوالے سے تجربات بھی کیے ہیں مگر اظہار کی عمدگی نے ان تجربات میں ادبیت کے پہلو کو کسی بھی سطح پر فراموش نہیں کیا۔ فلک، سورج، چراغ، کائنات، زنجیر، خاک، ہوا، نیزہ، دار وغیرہ ایسے الفاظ ہیں جو ان کی شاعری میں نہ صرف نئے فکری امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں بلکہ نئی تراکیب کا حصہ بن کر اردو زبان کو بھی ثروت مند کرتے ہیں۔ گزشتہ چار دہائیوں میں ایسے زود گو شاعر کے صرف دو مجموعہ ہائے کلام ''پوری عمر کا دن'' اور ''کوئی چشمہ نکل آئے'' کا منظرِ عام پر آنا یقیناً معیار پہ سمجھوتہ نہ کرنے کے عزم پر مہر ثبت کرتا ہے۔ ان کے کلام کو پڑھنے کے بعد بخوبی یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کی شاعری نہ صرف اردو

ادب کے ذیل میں ایک خوبصورت اضافہ ثابت ہوگی بلکہ صدیوں تک تشنگانِ علم و ادب کی علمی و ادبی پیاس بجھانے کا سامان فراہم کرتی رہے گی۔ آخر میں ان کے خوبصورت اشعار کے ساتھ اجازت کا طلبگار ہوں۔

نمونہ کلام:

اس سے پہلے کہ چراغوں کو ہوا لے جائے
روشنی جتنی ملے جس کو اٹھا لے جائے

رات اس خوف سے آنکھوں میں گزر جاتی ہے
کوئی اس شہر کے جگنو نہ چرا لے جائے

....

ظلمتِ شب میں مقید ذات کے اصرار پر
رکھ دیا ہے ایک جگنو وقت کی دیوار پر

جب سے میں نے ایک جگنو کو ستارہ کر لیا
چاند بھی پورا نہیں اترا مرے معیار پر

....

نہ کوئی بات کرے گا، نہ پیار دے گا مجھے
برے دنوں کی طرح وہ گزار دے گا مجھے

میں جانتا ہوں کہ وہ وقت کے بدلتے ہی
پھٹے لباس کی صورت اتار دے گا مجھے

....

جب سے فرازِ دار کا قائل نہیں رہا
یہ سر مرے وجود کے قابل نہیں رہا

ممکن ہے اس برس مجھے دریا اچھال دے
موجوں کے اختیار میں ساحل نہیں رہا

....

لوحِ عالم سے مرا نام مٹانے والے
راکھ ہو جائیں گے سورج کو بجھانے والے

تم جسے چاہو اسی شخص کا دامن تھامو
مجھ کو کافی ہیں محمدؐ کے گھرانے والے

....

سحر کو ایسے شبِ غم میں معتبر رکھا
دیے کا نام بھی سورج کے نام پر رکھا

ہواؤں جیسے سبھی پل مرے مقابل تھے
جلا کے اپنا بدن میں نے بام پر رکھا

....

طلوعِ صبح سے پہلے تھا معتبر کتنا
وہ ایک چاند کہ روشن تھا رات بھر کتنا

بدن کے دشت سے آگے بھی راستے ہیں بہت
لپٹ گیا ہے مرے پاؤں سے سفر کتنا

....

متاعِ جاں کا عجب کاروبار اس کا ہے
بدن ہمارے ہیں اور اختیار اس کا ہے

میں کائنات سے آگے بھی دیکھ آیا ہوں
ہر ایک نقش سرِ رہ گزار اس کا ہے

☆☆☆☆☆

غالب کے ایک شعر کی تفہیم (ہندو یونان کے فلسفے کے تناظر میں)

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے
(غالب)

غالب کا یہ شعر میں نے پہلی بار نہم جماعت میں پڑھا تھا اور اس وقت سے لے کر آج تک میں اس شعر کے حصار سے باہر نہیں نکل سکا۔ آج سے پانچ سال پہلے جب اس شعر کو پڑھا تو بہت لطف ملا اور شعر یاد بھی ہوگیا مگر اس شعر میں چھپی بات سمجھ میں نہ آسکی تھی۔ میں اکثر یہ شعر اپنے پسندیدہ شعر کے طور پر سنایا کرتا تھا، لیکن ایک طویل عرصے تک اس کے معنی و مفہوم سے نا آشنا رہا۔ وقت گزر گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے میرا انٹرمیڈیٹ کا امتحان بھی پاس ہوگیا۔ انہیں دنوں مجھے فلسفہ پڑھنے کا شوق پیدا ہوا۔ اپنی زندگی میں فلسفے کی پہلی کتاب "History of Western Philosophy" خریدی۔ اس کتاب کا پہلا حصہ یونان کے فلسفے پر مشتمل تھا۔ یونان کا فلسفہ دنیا کی تاریخ کے اہم ترین فلسفوں میں شمار ہوتا ہے، جس نے دنیا کے تقریباً تمام فلسفوں پر اپنا گہرا اثر چھوڑا۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جدید فلسفہ کی بنیاد یونان کا فلسفہ ہی ہے۔ حتیٰ کہ مسلم فلسفے کا ایک بڑا اور اہم حصہ بھی یونان کے فلسفے پر مشتمل ہے۔ یونان کا فلسفہ اگرچہ سقراط، افلاطون اور ارسطو کے ہاتھوں پروان چڑھا لیکن ان تینوں سے پہلے بھی کئی اہم فلسفی گزرے ہیں جن کے بغیر یونان کا فلسفہ شاید ادھورا ہے۔ ان فلسفیوں میں طالیس (Thales)، انگزمنڈر (Anaximander)، ہیراکلائیٹس (Heraclitus)، پارمینیڈیز (Parmenides)، زینو (Zeno)، فیثاغورس

مہر علی

(Pythagoras)، ڈیموکریٹس (Democritus) وغیرہ سرفہرست ہیں۔
آغاز میں یہ موضوع زیرِ بحث آیا کہ کائنات ایک ہی عنصر سے مل کر بنی ہے یا ایک ایسا عنصر ہے ہر شے میں موجود ہے۔ کسی نے کہا وہ عنصر پانی ہے، کسی نے کہا ہوا اور کسی نے کہا کہ آگ۔ دوسرا موضوع کائنات کے تغیر اور ثبات کے حوالے سے زیرِ بحث آیا اور یہ سوال اٹھا کہ کیا تغیر کائنات کی اصل ہے یا ثبات؟ اس حوالے سے کئی نقطہ نظر سامنے آئے جن میں دو اہم تھے۔
ایک نقطہ نظر ہیراکلائیٹس کا تھا جس کے مطابق تغیر ایک حقیقت ہے اور کائنات کی ہر چیز مسلسل تغیر کا کے عمل سے گزر رہی ہے اور ثبات صرف ایک دھوکا ہے۔ ہیراکلائٹس کا ایک مشہور قول ہے:

"Everything is in the state of flux" (1)

اسی بات کو علامہ محمد اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

سکوں محال ہے قدرت کے کارخانے میں
ثبات صرف تغیر کو ہے زمانے میں

....

ہیراکلائٹس نے اپنا نقطہ نظر بیان کرتے ہوئے مزید کہا کہ چونکہ کائنات کی ہر چیز ہر مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہی ہے اور ہر ایک لمحے کی بعد کوئی نئی چیز وجود میں آجاتی ہے اسی لیے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ کائنات میں کسی چیز کا وجود نہیں اور کائنات صرف ایک دھوکا اور فریب ہے کیونکہ کوئی چیز دوسرے لمحے اپنی اصل حالت پر قائم نہیں رہتی۔ اس دھوکے کو ہمارے حواسِ خمسہ ہمیں حقیقت کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے اس نے حواسِ خمسہ کا بھی انکار کیا۔
تغیر کے حوالے سے دوسرا عقیدہ ایلیائی مذہب کا تھا۔ ایلیائی مذہب کے نمائندہ فلسفیوں میں پارمینیڈیز اور زینو شامل ہیں۔ پارمینیڈیز کا نقطہ نظر ہیراکلائیٹس کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف تھا۔ اس کے نزدیک تغیر اور تبدیلی کی کوئی حقیقت نہیں بلکہ وہ ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ ہندوستان کے ویدانت فلسفے میں بھی یہی بات کی گئی ہے۔ ان کا بھی یہی کہنا ہے کہ تغیر جیسی کوئی چیز کائنات میں موجود نہیں۔ اصل میں ثبات یعنی ٹھہراؤ ہی کائنات اور زندگی کی اصل ہیں۔ برٹرینڈ رسل لکھتے ہیں:

"Heraclitus maintained that everything changes ;Parmenides retorted that nothing changes"(2)

پارمینیڈیز کو اگر ہم وحدت الوجودی کہیں تو غلط نہیں ہوگا۔ اس کے نزدیک کائنات خدا کا ہی روپ ہے۔ چونکہ خدا تغیر کے عمل سے پاک ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس لیے کائنات میں بھی تغیر کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کا نہ کوئی انت ہے نہ کوئی شروعات۔ پارمینیڈیز نے یہ بھی کہا کہ کثرت کا کوئی وجود نہیں اور کائنات کی اصل وحدت ہی ہے۔

پارمینیڈیز نے اپنی بات سے وہی نتیجہ نکالا جو ہیراکلائیٹس نے نکالا تھا یعنی کہ یہ کائنات اور زندگی صرف ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ اس نے کہا کہ چونکہ ہمارے حواسِ خمسہ ہمیں یہ دکھاتے ہیں کہ کائنات اور زندگی تغیر اور تبدیلی سے گزر رہے ہیں جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے، اس لیے یہ کائنات بھی ایک دھوکہ اور فریب ہے۔ پارمینیڈیز نے بھی ہیراکلائیٹس کی طرح حواسِ خمسہ کا انکار کیا۔ زینو نے پارمینیڈیز کے نقطہ نظر کو مثالوں اور منطق کے ذریعے بیان کیا۔

افلاطون نے بھی پارمینیڈیز اور ہیراکلائیٹس کی طرح اس زندگی اور دنیا کو ایک فریب قرار دیا۔ اس نے دو جہانوں کا تصور پیش کیا جو اس نے غالباً فیثا غورسیوں سے لیا۔ افلاطون نے ایک دنیا کو حقیقی دنیا قرار دیا جس کو اس نے تخیلاتی دنیا (World of Forms) کا نام دیا۔ جبکہ یہ دنیا جو ہم گزار رہے ہیں وہ فریب ہے۔ اس کے نزدیک موجودہ دنیا تغیر کا شکار ہے جبکہ دوسری دنیا میں تغیر کا کوئی وجود نہیں۔ مختلف نظریات اور دلائل کے باوجود یونان کا تقریباً ہر فلسفی اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کائنات، زندگی یا ہستی صرف ایک فریب اور دھوکہ ہے۔

تغیر، ثبات اور فریب کے تصورات صرف یونان کے فلسفہ میں ہی نہیں ملتے بلکہ ہندوستان کے فلسفے میں بھی موجود ہیں۔ کئی مصنفین کا یہ کہنا ہے کہ یونان سے بھی قبل ہندوستان میں یہ عقائد اور تصورات موجود تھے۔ بدھ ازم کے مطابق کائنات مسلسل تغیر کا شکار ہے اور کسی بھی چیز کا ایک حالت پر قائم رہنا ناممکن ہے۔ بدھ ازم کے یہ تصورات ہو بہو ہیراکلائیٹس کے نظریہء تغیر سے ملتے ہیں۔

جبکہ دوسری طرف ویدانت کا فلسفہ پارمینیڈیز کے نظریات سے اتفاق رکھتا ہے۔ ان کے نزدیک بھی تغیر کی کوئی حقیقت نہیں۔ ویدانت فلسفے کے ایک فلسفی شنکر اچاریہ ہو بہو پارمینیڈیز جیسا نظریہ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک بھی وحدت کائنات کی اصل ہے کیونکہ خدا بھی واحد ہے۔ پارمینیڈیز کی طرح وہ بھی وحدت الوجود کا قائل ہے۔ شنکر اچاریہ کے مطابق:

"جو کچھ ہم اپنے حواس سے محسوس کرتے ہیں وہ موہوم اور خیال ہے (3)"

"کائنات ایک مایا (فریب) ہے۔ ہمیں وحدت میں جو کثرت نظر آتی ہے یہ ہماری جہالت کا حجاب ہے(4)"

یونان اور ہندوستان کا فلسفہ پڑھنے کے بعد جب یہ شعر دوبارہ غور سے پڑھا اور اس مفہوم سمجھا تو میں حیران تھا کہ غالب اپنے اس شعر میں فلسفۂ یونان اور فلسفۂ ہند کا ایک بڑا موضوع بیان کر رہا ہے یہ بات شاید میرے لیے نئی اور بہت حیران کن تھی:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

....

یعنی غالب کے نزدیک بھی کائنات، ہستی اور زندگی ایک دھوکا اور خیال ہے جو ہمیں حقیقت دکھائی دیتا ہے۔ غالب اپنی شاعری میں اکثر مقامات پر یہ بات کہتے نظر آتے ہیں۔ اس شعر کے علاوہ غالب کا دو اور اشعار دیکھیے:

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی!
ہر چند کہیں کہ "ہے"، نہیں ہے
ہستی ہے نہ کچھ عدم ہے غالب
آخر تو کیا ہے اے نہیں ہے

....

جس حیرت سے غالب کا یہ شعر مجھ پر منکشف ہوا اور یا جس غیر سرسری انداز میں اس کے اثرات میرے دل پر مرتب ہوئے، ممکن ہے کہ عظیم نفسیات دان سگمنڈ فرائڈ (Segmund Frued) کو بھی ہو بہو ایسی ہی کسی حیرانی کا سامنا ہوا ہو، اس کے یہ الفاظ دیکھیے:

"Everywhere I go I find that a poet has been there before me" (5)

غالب کا یہ شعر ہندوستان اور یونان کے تغیر، ثبات اور فریب کے فلسفے کو بیان کرتا ہے۔ جس طرح ہند و یونان کا فلسفہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ کائنات ایک فریب اور دھوکہ ہے چاہے اس کی اصل تغیر ہو یا ثبات، ہو بہو اسی طرح غالب کا یہ شعر کائنات کو فریب اور خیال کے طور پر پیش کرتا ہے۔

حوالہ جات:

History of Western Philosophy by Bertrand russel,P.48(1)

History of Western Philosophy by Bertrand russel,P.55(2)

(3) فلسفۂ ہند و یونان، شفیق عہدی پوری، ص ۵۵

(4) فلسفۂ ہند و یونان، شفیق عہدی پوری، ص ۵۵

In the favour of Sensative Man and other Essays by Anais Nin,P.14(5)

☆☆☆☆☆

ایقان ـــ ایک مجموعی تاثر

تخلیق حادثہ نہیں کہ یونہی بیٹھے بیٹھے رونما ہو جائے- جزیات کو بطریق احسن کچھ خاص تراکیب سے ترتیب دینے کے بعد قابل قدر تخلیق جنم لیتی ہے-ایک تخلیق کار اپنے اندر اور اردگرد ہونے والے عوامل اور ان کے اثرات سے بھرپور متاثر ہوتا ہے اور ان تاثرات کو اپنے فن کے ذریعے سامعین، ناظرین یا قارئین تک پہنچاتا ہے-

تخلیق کار اپنے ماحول سے متاثر ہو کر، انہی محسوسات کو جو تخلیقِ انسان کے ساتھ پیدا ہو گئے تھے،اپنے تئیں ایک خاص ترکیب سے صفحہٴ قرطاس پر اتارتا ہے،میڈیم کچھ بھی ہو، جب تک وہ تخلیق اپنے اندر ایک جداگانہ صفت پیدا نہ کر لے،فوراً یا چند ہی عرصے میں اپنی طبعی موت مر جاتی ہے- تخلیق کی اس خاموش موت کے ساتھ تخلیق کار کا نام بھی گمنامی کے کتبے پر سجا دیا جاتا ہے-

کچھ صدیاں قبل، جب اردو زبان نے سر اٹھایا تو اس کی ترویج و ترقی میں سب سے نمایاں کام اردو زبان کے شعرا اور شاعری نے سرانجام دیا- اگرچہ شروع میں موضوعات غیر متنوع اور مخصوص زاویوں میں قید رہے پر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بات جدیدیت اور ترقی پسندی سے ہوتی ہوئی مابعد جدیدیت اور مابعد ترقی پسندی تک آن پہنچی-

دورِ حاضر میں جبکہ ابلاغ کے تیز ترین ذرائع موجود ہیں اور قریباً ہر ذی النفس whats on your mind کے جواب میں لکھنا اور لکھے جانے کے بعد، اپنے لکھے کی ستائش چاہتا ہے، انفرادیت ایک مشکل امر ہے- شعرا اور شاعری کے اس سیل رواں میں ''ایقان'' کا ادبی منظر نامے پر ظہور، نعیم رضا بھٹی کے انفراد کا ثبوت ہے- چند مثالیں پیش ہیں:

سخن ہے رزق، مجھے بھی ملا مرا حصہ
مرے کہے پہ کسی کی نہیں ہے چھاپ سنو

تو نے جہاں زمیں کو اک نقشِ پا دیا
ایڑھی گھما کے میں نے وہ منظر گھما دیا

پہلی جب ہو کے مسترد آئی
تب کہیں دوسری سند آئی

ہمیں خود اپنے معانی کی کچھ خبر ہی نہیں
اگرچہ ربط ہمارا سخن سے ملتا ہے

....

داخلی و خارجی متحرکاتِ ایقان: نعیم رضا بھٹی عصری شعور سے آراستہ شاعر ہے جو ادب میں یک رنگی کا ہرگز قائل نہیں-اس کی شاعری میں داخلیت پسندی سے خارجیت پسندی کا سفر بدرجہ

میجر عادل ورد

اتم موجود ہے۔ وہ خارجی منظرنامے اور اس کا کائناتی کینوس کو اپنی ذات کے حوالے سے دیکھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ایقان میں داخل اور خارج کا ایک خوبصورت توازن بنائے رکھنے پر نعیم اپنے معاصرین سے کئی فرلانگ آگے ہے۔ چند اشعار:

کھا رہا ہوں میں اپنے لاشے کو
آدمیت کا نادہندہ ہوں

ہر طرف پھیلتا یہ کہنہ نظام
ہر طرف پھیلی رنگتوں کے عکس

....

فلسفے کی رو سے محبت کی تین اشکال ہوتی ہیں۔ ایروز Eros، فیلیا Philia، اور اگاپی Agape ایروز کی اصطلاح بنیادی طور پر شہوانی فن پاروں کے لئے استعمال ہوتی ہے لیکن اس میں دوسرے انسان کے لئے شدید خواہش، تڑپ اور چاہت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے۔

فیلیا سے مراد مفعول کی رفاقت یا شراکت کی نمائندگی ہے۔ اس کی ذیل میں عموماً خاندان، دوستوں اور ساتھ کام کرنے والوں کے لئے محبت کا جذبہ آتا ہے۔

اور خدا سے محبت اور تعلق کے رشتے کو اگاپی کہا جاتا ہے۔

نعیم رضا بھٹی کے ہاں محبت، متذکرہ تینوں سوانگ بھرتی نظر آتی ہے۔ مثلاً ایروز کے ضمن میں کچھ اشعار ملاحظہ ہوں:

آئینوں نے دھوپ کو میرے مقابل کر دیا
اب دیے کے پاس ہوں اور خیر سے میراب ہوں

وہ ہاتھ آئی تو اس کو مزید چکھوں گا
مزاج سے تو وہ نمکین چائے جیسی ہے

....

سب سے عمدہ پھول ہو تم
دنیا کے گلدستے میں

....

فیلیا سے متعلق کچھ اشعار:

جس کو ماں باپ کا خیال نہیں
پھینک کر تھوک اس کے گھر سے نکل

....

میں اس کے سائے میں رہ کر بڑا ہوا ہوں رضا
مرے لئے گلِ احمر ہے مرا باپ سنو

....

ایسے لوگوں کی خیر ہو مولا
جو محبت سے دیکھتے ہیں مجھے

....

جب میں تھک کر گر جاتا ہوں
کہاں چلے جاتے ہو بھائی

....

اگاپی اور ایقان

غم کی تفہیم سے جو راہ کھلے
اس سے ہی رمزِ لا الہ کھلے

....

ورنہ سارے چراغ بجھ جاتے
پرورش کی قسم اٹھائی گئی

....

کون کہتا ہے خیر و شر کے لئے
اس نے دنیا بنائی ڈر کے لئے

اک صدا کھینچ کے کشکول الٹ دیتا ہوں
اور خیرات کسی سمت سے چل پڑتی ہے

....

یہ تمام اشعار نعیم رضا بھٹی میں موجود مختلف محبتوں، جذبوں اور رویوں کے عکاس ہیں۔ اب ہم نعیم رضا بھٹی کی شاعری میں موجود علامتوں پر کچھ بات کرتے ہیں۔

ایقان اور علامت نگاری

شعری علامتیں، احساساتی اور تصوراتی سطح کی حامل ہوتی ہیں۔ جو قاری کو پہلے، احساساتی سطح پر اور پھر تصوراتی سطح پر متاثر کرتی ہے۔ اس اعتبار سے الفاظ کا علامتی استعمال دراصل زبان کا تخلیقی استعمال ہے۔ نعیم رضا بھٹی کے ہاں مظاہرِ فطرت کے ساتھ ایک مضبوط تعلق اور فطرت کے ساتھ وابستہ احساسات بخوبی تفصیل میں آتے ہیں۔ اس کے ہاں موجود بیشتر تصویریں علامتی ہیں، جو قاری کو ایک جاندار، متحرک، جیتی جاگتی اور سانس لیتی محسوس ہوتی ہیں۔

W.B Yeats کے بقول" علامتیں شاعری میں ایک بہت بڑی طاقت کی حیثیت رکھتی ہیں، وہ اس کو تہ دار بنا کر اس میں حسن پیدا کر دیتی ہیں"۔ ہم علامت کو اس پر معنی وجود کا نام دے سکتے ہیں جس کی معنویت اس سے ماورا کسی اور وجود، کسی اور شے سے منسلک ہوتی ہے۔ تہہ در تہہ معنوی پرتوں کو کسی معمولی سے لفظ سے متصف کرنا ہی ایک کامیاب شاعر کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں "جب شاعر کسی شے یا لفظ کو علامت کے طور پر استعمال کرتا ہے تو اپنی تخلیقی جست کی مدد سے اس شے اور اس کے مخفی معنی میں ایک ربط دریافت کرتا ہے۔ شاعر کا سارا جمالیاتی حظ اس کی اسی جست کے باعث ہے"

ایقان میں برتی گئی علامتیں اس لحاظ سے بہت جاندار اور کثیر الجہت ہیں۔ نعیم رضا بھٹی کے ہاں جو علامتیں استعمال کی گئیں اگرچہ مروج ہیں لیکن ان کا برتاو خالصتاً نعیم کا اپنا اور جداگانہ ہیں۔ ہم یہاں ایقان کی صرف ایک علامت "دیے" پہ بات کریں گے۔

دیے کی لو مری سانسیں بحال رکھتی تھی
اسیر ہو کے مجھے انہدام بھول گیا

اسے کہو کہ اٹھائے لووں کے ملبے کو
چراغ اب تہِ دیوار تلملاتے ہیں

اپنا چراغ اپنی طرف موڑ لائے ہم
ہم نے بھی آج جو کے اندھیرے کو کیا دیا

سانس بے ربط ہو تو لگتا ہے
جلتا بجھتا دیا ہوں میں

جلنا مرا نصیب ہے
جلتا رہے دیا ابھی

میں روشنی کے بیج بو کے سو گیا
چراغ اگ رہے ہیں کشتِ خواب سے

بجھ چکے ہیں چراغ اندر سے
اس میں سورج کا کوئی ہاتھ نہیں

میں دیا ہوں رضا کی تربت کا
جلتا بجھتا چراغ ہوں لڑکی

اک دیا دے دیا گیا ہے مجھے
اک دیا سورجوں پہ وارا ہوا

اوک بھر آئینے سے گیان لیا
اور خود کو چراغ مان لیا

پتنگے گھیر لاتا ہوں کہیں سے
دیے کی لو سے پیار اتنا

ورنہ سارے چراغ بجھ جاتے
پرورش کی قسم اٹھائی گئی

....

مذکورہ تمام اشعار میں چراغ ہر جگہ اک نئے اور بھرپور معنی کے ساتھ اپنے ہونے کا مکمل جواز لیے ہوئے روشن ہے۔
علامتی سطح پر نعیم کے ہاں دیگر قوی علامتوں میں اس کی اپنی ذات اور ڈر جا بجا نظر آتے ہیں۔
خدا کا وجود اور اس کے متعلقات کا علم، خدا اور انسان کا تعلق، انسان کا وجود، کائنات میں انسان کی حیثیت، اخلاقی اقدار اور خود آگہی وغیرہ یہ وہ سوالات ہیں جو انسان روز اول سے اپنی پیٹھ پہ لادے ہوئے ہے۔ جن کے بارے میں تاحال کوئی انسان تشفی بخش جوابات تلاش نہیں کر پایا۔ مگر بطور تخلیق کار ان سوالات کا اٹھانا اور اپنے قاری کو شعوری سطح پر جھنجھوڑنا، ایک تخلیق کار کی کامیابی ہے۔ حالانکہ یہ ہرگز لازم نہیں کہ وہ، آگہی کی تمام منازل طے کئے ہوئے ہے اور ان سوالات کے جوابات جانتا ہے۔ وہ تو خود ایک سچ کے بعد ایک اور سچ کی تلاش میں ہمہ وقت حالت سفر میں رہتا ہے۔
نعیم کی شاعری کا ایک نمایاں موضوع اس کے مابعد طبیعاتی سوالات اور اشارات ہیں:

کون کہتا ہے خیر و شر کے لیے
اس نے دنیا بنائی ڈر کے لیے

لوگ جنت میں جا رہے ہوں گے
اور ہم ٹپٹا رہے ہوں گے

سارے منظر ہی دیکھنے کو ملے
اس کی آنکھوں میں بس خدا نہیں تھا

مرنے والے نے صرف اتنا کہا
موت کا کوئی ذائقہ نہیں تھا

میں تماشا ہوں یا تماشائی
ہے یہ درپیش مسئلہ مجھ کو

ہر طرف ہے مبالغہ میرا
میں نے مٹھی میں آسمان لیا

سب سے پہلے دنیا میں
پسلی کی تعظیم ہوئی

....

بڑی بحر ایک دریا کی طرح ہوتی ہے۔ طغیانی میں ہو تو ہر شے کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے پر جیسے ہی روانی میں کمی آ جائے تو بوڑھے راوی کی طرح جگہ جگہ کھڈے بن جاتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں چھوٹی بحر ایک گنگناتی، بل کھاتی ندی کی طرح ہے۔ جیسے کسی دیوقامت پہاڑ کی اوٹ سے جھرنا ایک دم آنکھوں کے سامنے ایک دیدنی منظر لے آتا ہے، اسی طرح چھوٹی بحر میں کی گئی بات دھم سے آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی ہے۔

ایقان میں موجود چھوٹی بحر کے فن پاروں پہ بات نہ کرنا صاحب ایقان کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ بقول نعیم رضا بھٹی:

کم نہیں ہے سخن کی کم کوشی
ساری وسعت ہی اختصار میں ہے

....

بلا تمہید دیگر چند اشعار پیش ہیں:

قتل و غارت پھر سکی
آ رہی ہے سخت نیند

آبشار جی اٹھے
جیسے گرے اگر سفال میں

خالی دامن والوں میں
بے سمتی تقسیم ہوئی

تشخص ہمارا
ہمارا ہے اخبار

شیشے نے انگڑائی لی
اور خود سے دوچار ہوا

پہلے تیر ہمارا
چل جائے تو بہتر

پرچھائی پڑ جانے سے
رنگ اڑتا ہے رنگوں کا

دریا جب ناشاد ہوا
مشکیزہ ایجاد ہوا

سیدھے سبھاؤ بات کر
انگلی نہیں دکھا مجھے

مٹکے بھر جانے کے بعد
کیا بنتا ہے موجوں کا

ان اشعار میں جہاں سادگی اظہار ہے وہیں منظر نگاری اور امیجری کی سطح پر ایک واضح تازہ کاری ہے، وہیں کچھ پرتیں ایسی بھی ہیں جو روزمرہ مشاہدے میں آنے والی تصویروں میں جاگ اٹھتے ہوئے نئے احساس کا پتہ دیتی ہیں۔

غزل کی بابت کہیں پڑھا تھا کہ اس صنف میں موجود مجاز و حقیقت کا ابہام کسی طور بھی

عجز فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ کمال فن کا ثبوت ہے۔ قاری کے علمی و فکری مزاج اور نفسی وجذباتی کیفیت کے مطابق نہ صرف شعر کے مفاہیم میں ایک تنوع آجاتا ہے بلکہ شعر اپنی receivings میں مختلف رنگوں اور ذائقوں کا حامل ہو جاتا ہے۔

کورا ہونے سے پیشتر میں نے
ایک ایک رنگ اختیار کیا

جینے لگتے ہیں تو ہر سانس اکھڑ جاتی ہے
یعنی ہم غم کی روانی کے سبب زندہ ہیں

بدگمانی کو کچھ خبر ہی نہیں
کیسی تسکین اعتبار میں ہے

بہت شرمندگی پڑی کی ہوگی
اتر جائیں اگر انجن ہمارے

....

نعیم رضا بھٹی کو پڑھتے ہوئے کم و بیش ہر دوسری غزل میں مسلسل بدلتی ہوئی کیفیات سے دوچار رہا۔ گاہے کسی منظر، کسی اچھوتے امیج کی سرشاری، گاہے کسی مانوس فضا کے میسر آجانے کی طمانیت۔ ایقان کے بیشتر عمدہ اشعار میں جہاں ایسے فکری زاویے نظر آتے ہیں جو معاصر اردو غزل کے مشترکہ اظہاریے کا حصہ ہیں، وہیں کچھ ایسے اشعار بھی دکھائی دیے جو اپنی بنت اور طرز احساس میں کچھ زیادہ مختلف نہ ہوتے ہوئے بھی اپنی کلیت میں تازگی اور ندرت کے حامل ہیں۔ ذرا یہ اشعار دیکھیے:

کہانی میرے بھائی مختصر ہے
یہ دنیا انتہائی مختصر ہے

دو قدموں پہ منزل پائی
اور پھر میں نے ٹھوکر کھائی

خوف آئے تو کھانس لیتا ہوں
یہ دفاعی عمل ہے مات نہیں

نعیم رضا بھٹی اور اس کا ایقان:

شاعری ایک جوکھم ہے۔ لیکن مصرعہ سازی، تراکیب کا نیا پن، تشبیہات و استعارات کے استعمال میں مہارت، نعیم کے ہاں جابجا دستیاب ہے۔ ذاتی وقلبی وارداتیں، تجربات و مشاہدات کو جس خوبی سے اس نے شاعری میں برتا ہے یہ اس کے فطری تخلیق کار ہونے پر دال ہے۔ ابھی تک نوجوان شعرا کی ٹولی سے تعلق رکھنے والا نعیم رضا بھٹی اصل میں ایک کہنہ مشق شاعر ہے۔ جو اپنی طبعی عمر سے کئی سال بڑا ہے۔ نعیم ایک ملنسار، ادب دوست اور ایک مخلص شاعر ہے۔ جس کا اوڑھنا بچھونا شاعری ہے۔ خالق ارض وسماوات سے ملتجی ہوں کہ وہ نعیم کے ایقان کو مزید مضبوطی دے اور کامرانیوں سے نوازے۔

☆☆☆☆☆

اختر رضا سلیمی کا ناول ''جندر'' ایک خلوت گزیدہ شخص کا نوحہ

عنبرین فاطمہ

''جندر'' کا قصہ ایک ایسے شخص کا قصہ ہے جو ماحول میں آئی تبدیلی کو اپنے مضبوط حافظے میں موجود یادوں کے ذریعے شکست دینے کی کوشش میں موت کا منتظر ہے۔ ''جندر'' میں ''ولی خان'' اپنی یادوں سے کردار اور واقعات کو برآمد کر کے کہانی آگے بڑھاتا ہے ۔ناول میں ''ولی خان'' ہے جو پچھلے پینتالیس دنوں سے مسلسل جاگ کر یہی سوچ جا رہا ہے کہ میری موت کے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہو گا۔ ''ولی خان'' کے علاوہ ''جندر'' بھی مرکزی کردار کی حثییت رکھتا ہے۔ ''جندر'' جوڑیاں ندی کے کنارے پر موجود ایک پن چکی ہے، جو ولی خان کی چار نسلوں کا سہارا اور اُس کی موت کا سبب ہے۔ جندر پوٹھوہاری، ہندکو زبان کا لفظ ہے جس کو چکی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ چکی پانی سے چلتی ہے اور اِس میں اناج پیسا جاتا ہے۔ دراصل ولی خان ایک خاص تہذیب کا آخری وارث تھا۔ اُس کے لیے جندر ایک مشین نہیں بلکہ ایک سانس لیتا، جیتا جاگتا، بولتا ہوا وجود تھا۔ ''میرا یہاں اس طرح مرنا صرف ایک انسان کی نہیں، ایک تہذیب کی موت ہے۔'' ولی خان جانتا تھا کہ گاؤں میں جندر کے خاتمے میں اُس کے افسر بیٹے راحیل (جو اپنے باپ کے پیشے پر شرمندہ تھا) کا بڑا ہاتھ ہے۔ اُس نے گاؤں میں برقی چکی لگانے کے لیے مسجد کے خادم کے ساتھ مالی معاونت کی تھی۔ سماج سے کٹ جانے کے بعد وہ ایک کرب میں مبتلا تھا۔ پینتالیس دنوں سے موت کا انتظار، لاش پر پہنچنے والے پہلے شخص کا معما ناول کے آخری صفحات پر کھلتا ہے کہ برقی چکی کی موجودگی میں کون صرف جندر کے لیے اتنی دور ایک ندی تک جانے کے لیے یہ مشکل راستے طے کرے گا۔ ولی خان نے جہاں اپنی زندگی کو جندر سے جوڑا ہوا ہے اور کہتا ہے کہ میرا کھانا، پینا، پڑھنا، لکھنا، سونا سب کا سب جندر سے جڑا ہوا ہے، تو دوسری طرف وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جب میرے دادا، پردادا کو یہ جندر انعام کے طور پر مل رہا تھا تو تب سے میری موت کا وقت طے ہو گیا تھا۔

ولی خان کی زندگی میں بدلاؤ اُس وقت آیا جب اُس کی شادی ہاجرہ سے ہوئی۔ ہاجرہ ولی خان سے بارہ سال چھوٹی تھی وہ جندر پر آ کر ولی خان کے ساتھ بیٹھ کر کتابیں پڑھا کرتی تھی اور پھر ولی خان، بابا جمال دین اور ہاجرہ کی ان کتابوں پر گفتگو ہوتی۔ میٹرک کے بعد مقامی سکول میں ٹیچر ہونے کے باوجود اُس

نے والدین سے ضد کر کے ولی خان سے شادی کی؛ کیوں کہ اُسے آزاد، بہادر انسان پسند تھے۔ شادی کے بعد جب اُسے معلوم ہوا کہ ولی خان جندر کی کوک کے بغیر سو نہیں سکتا تو وہ ولی خان سے بدظن ہو گئی، اُس کے لیے یہ بات ناقابلِ برداشت تھی کہ میرا شوہر کسی مجبوری میں قید ہو۔

ناول کے اِس پہلو کو پرکھا جائے تو یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ ناول نگار نے ذہنی الجھاؤ کا بھی ایک پہلو نمایاں کیا ہے کہ کس طرح ولی خان ذہنی اُلجھن کے باعث اپنے بیوی، بچوں اور آبائی گاؤں تک کو چھوڑ دیتا ہے؛ اگرچہ اسے اس چیز کا علم ہوتا ہے کہ میرا یہاں جندر پر اس طرح زندگی گزار دینے کا انجام کیا ہوگا۔ اس کردار میں بڑی بے باکی پائی جاتی ہے؛ جب وہ جندروئی کو جندر چھوڑنے کا کہتی ہے اور جندروئی اس کا کہا نہیں مانتا تو وہ اسے چھوڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ کا کردار یہاں مضبوط کردار ہے جو اپنے فیصلے پر شروع سے آخر تک قائم رہتی ہے اور جندروئی سے الگ ہو کر بھی اپنے بیٹے کو اعلیٰ تعلیم دلاتی ہے۔

کائنات جب سے معرضِ وجود میں آئی ہے تو انسان نے مختلف تخلیقات اور ایجادات کی ہیں۔ اور اس جہان کی ایسی ایسی پرتیں کھولی ہیں کہ وہ خود دنگ ہو کے رہ گیا ہے۔ جوں جوں انسان نے ترقی کی تو نئی نئی صنعتیں ایجاد ہوتی رہیں، اور وقت کے ساتھ ساتھ نئی ایجادات پرانی ایجادات جو کہ ثقافت کا وجود رکھتی تھی متاثر کرنے لگیں۔ اس ناول میں اختر رضا سلیمی نے مشینوں سے کچلی جانے والی ثقافتوں کو بہترین انداز میں دکھایا ہے۔ ٹریکٹر کی آمد سے لیتری (تنہائی اور بھائی کے لیے مل کر کام کرنا) اور پھوچھی (مکان کی تعمیر میں چھت بھرائی کی ونگار) جیسی روایات دم توڑ گئیں۔ اس سے صنعتی ترقی کے انسانی معاشرے اور سوچ پر ہونے والے مشینی اثرات کی طرف بھی دھیان جاتا ہے، کہ مشینی زندگی کے مثبت اثرات کے علاوہ منفی اثرات بھی غور طلب ہیں۔

بظاہر تو ناول خلوت گزیدہ شخص کا نوحہ ہے، مگر اس پہلو میں ناول نگار نے ایک اور اہم پہلو معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کو بھی روشن کیا ہے، یہاں اختر رضا سلیمی معاشرے کے آگے سینہ تان کے کھڑا ہو کر یہ سمجھانے کی تگ و دو میں ہے کہ جن روایات اور تہذیب کے تخم سے ہم نکل کر پیڑ بنے ہیں، آج وہ پیڑ خزاں رسیدہ ہو رہا ہے۔ اچھے ادیب کی یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ سماجی زندگی کے اُن پہلوؤں کو اُجاگر کرتا ہے جو مٹ رہے ہوتے ہیں۔ ہر علاقے کے لوگوں کا رہن سہن کا طریقہ دوسرے علاقے سے مختلف ہوگا، مگر ان میں ایسی رسومات بھی شامل ہیں جو سب میں معمولی تبدیلیوں کے علاوہ یکساں ہوں گی، مثال کے طور پر شادی بیاہ، نکاح وغیرہ۔ اختر رضا نے ناول میں مخصوص جگہ کی ثقافت کی عکاسی کی ہے۔ ایک معاشرہ اپنی تہذیب و ثقافت کے بل بوتے پر ہی پھیلتا ہے، لیکن ان پر دوسری اقوام کے اقدار کا اثر ہوتا ہے۔ ناول میں اختر رضا سلیمی نے "جندر" کو بطور علامت استعمال کیا تو ساتھ ہی

اس سے جڑی ہوئی تمام تر رسومات، ثقافت جو ختم ہو رہی تھی پیش کیا ہے۔ جندر میں لڑکیوں کی تعلیم کے فقدان کو بھی دکھایا گیا ہے، کہ اس گاؤں میں پہلی پڑھی لکھی لڑکی ہاجرہ تھی، کیوں کہ یہاں کہ لوگ لڑکیوں کو تعلیم کے بجائے فنِ دستکاری سکھاتے تھے۔ اس کے علاوہ عورتیں بھی مردوں کے شانا بشانہ کام کرواتیں تھیں۔ جندر میں ناول نگار نے لیتری، پھوپھی، ونگار جیسی رسومات کے ساتھ ''ہزارہ'' کے حشرات الارض کو بھی دکھایا ہے۔ ان روایات کے مٹنے اور ٹریکٹر، تھریشر کی آمد نے ولی خان کو سماج سے علاحدہ کر کے جندر تک محدود کر دیا تھا۔ ڈاکٹر شاہد نواز لکھتے ہیں ''جندر'' المیاتی رنگ اور کیفیت میں ڈوبا ہوا ایسا ناول ہے۔ جس نے مٹتی ہوئی مقامیت کو دل آویز بنا کر پیش کیا ہے۔''

جندر کا اُسلوب بیانیہ ہے۔ ناول نگار نے جو زبان بَرتی ہے وہ اُس زمان و مکان سے جڑی ہوئی ہے جسے ناول میں دکھایا گیا ہے۔ مخصوص میدانی علاقے کی مختلف رسموں، پرندوں، جانوروں کو بہتر طور پر پیش کیا گیا۔ ناول میں نامانوس اور بھاری بھرکم الفاظ و تراکیبوں سے اجتناب کیا گیا ہے: ناول میں کوئی ابہام ہے نہ ہی کوئی کی پیچیدگی۔ رموز اوقاف کے خوب صورت استعمال کے ساتھ ساتھ انھوں نے انگریزی ناولوں کی طرح طویل جملوں کو ''جندر'' کی زینت بنایا ہے:

''یہی وجہ ہے گزشتہ پینتالیس دنوں میں، جب سےمیں اپنی ماں اور موت دونوں کا ہاتھ اپنے شانے پر محسوس کر رہا ہوں، میں نے اپنی موت کے بارے میں اتنا نہیں سوچا جتنا کہ اس آدمی کے بارے میں، جو میرے بعد یہاں---اس ویران جندر پر--- آنے والا پہلا شخص ہوگا۔''

مذکورہ بالا ٹکڑے کے علاوہ ناول میں اِس سے زیادہ طویل جملے بھی موجود ہیں۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ تمام سطور رواں ہیں کہ ایک ہی سانس میں آٹھ سے دس لائنوں پر مشتمل طویل جملہ پڑھا جا سکتا ہے۔

انسان کی زندگی میں جو واقعات سرزد ہوتے ہیں، لاشعوری سطح پر وہ اُن سے اثر انداز ہوتا ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی کی دہلیز تک آتے آتے اثر انداز ہونے والے عوامل کا وہ سامنا کرتا ہے اور اس سے متاثر ہوتا ہے؛ اور یہ سب کچھ اُس کے لاشعور میں مختلف صورتوں میں موجود ہوتا ہے۔ فرائیڈ نے لاشعور کے تصور اور نفسیاتی اُصولوں کی آگاہی دی تو ساتھ ہی اُنھوں نے لاشعوری سطح پر پوری نہ ہونے والی خواہشات کو جنسی پس منظر میں ڈھونڈنے کی کوشش کی ہے، اُس نے خوابوں کے اشارات و علامات کی تشریح بھی جنس کو قرار دیا ہے۔

''جاگے ہیں خواب میں'' (اختر رضا سلیمی کا پہلا ناول) لکھتے وقت لاشعور پر بحث کرنے کے لیے ژونگ اور فرائیڈ کے نظریات سے رہنمائی لی ہے، جہاں ''جاگے ہیں خواب میں'' ''زمان'' (مرکزی کردار) اپنے لاشعور میں گزشتہ سے حال اور حال سے مستقبل کو

دیکھتا ہے۔ بعینہ جندر کا ''ولی خان'' بھی گزرے ہوئے زمانے سے ہوتا ہوا حال میں، اور حال میں ہوتے ہوئے مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔ جہاں ''زمان'' یہ سوال کرتا ہے کہ ہم ماضی میں جا سکتے ہیں تو مستقبل میں کیوں نہیں جا سکتے، وہاں ''ولی خان'' ماضی کے قصوں سے پردہ اٹھاتے ہوئے مستقبل کے جہان میں قدم رکھتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد یہاں آنے والا پہلا شخص کون ہوگا۔ فرائیڈ کا نظریہ ہے کہ ایک ادیب کی جو آرزوئیں وقت کے بھنور میں ڈوب جاتی ہیں تو وہ ان کو تخیل کی دنیا میں زندہ کر لیتا ہے، اور جب یہ قاری کی نظر سے گزرتی ہیں تو وہ بھی اس سے راحت محسوس کرتا ہے۔ جو کہ جندر میں ولی خان میں کسی طرح نظر نہیں آتیں۔

''جاگے ہیں خواب میں'' ناول نگار نے جہاں نفسیات، فلسفہ، تاریخ جیسے بکھرے ہوئے علوم کی تسبیح کو اکٹھا کر دیا ہے، تو وہاں ''جندر'' میں انھوں نے فرائیڈ کا نظریہ لاشعور اور اوڈی پس کمپلیکس کی جھلکیاں بھی دکھائیں ہیں، ولی خان اپنے لاشعور میں سوچتا ہے کہ میرے مرنے کے بعد میری لاش کے ساتھ کیڑے مکوڑے کیا کریں گے۔ ناول میں ولی خان اپنے لاشعور میں گزشتہ سے حال، اور حال سے آئندہ کی طرف جاتا ہے، وہ اپنی کمزور ہوتی ہوئی یادداشت میں سوچتا ہے کہ مجھے اب بھی پینتالیس دن پہلے والا وہ لمحہ یاد ہے جب میں آخری چونگ پیس کر جندر کو بند کر رہا تھا تب میری سوچوں کے محور میں ایک ہی چیز گھوم رہی تھی، میں جندر اور اپنی زندگی کا آخری اناج پیس چکا ہوں۔ حال میں ہوتے ہوئے ولی خان ماضی کے بارے میں سوچتے ہوئے مستقبل کے بارے یوں گویا ہوا: ''مجھے یقین ہے کہ جب قیامت کے دن مجھے اٹھایا جائے گا تو میری یادداشت میں سب سے پہلے یہی منظر ابھرے گا۔''

درج بالا اقتباس میں ولی خان ماضی کی تخیلاتی کائنات کی سیر کرتے ہوئے حال اور پھر مستقبل میں جاتا ہے، ولی خان مستقبل کے بارے میں مزید سوچتا ہے، کہ میرا بیٹا (راحیل) جو کہ شہر میں رہتا ہے جب اُسے یہ خبر ہوگی میری موت واقع ہو گئی ہے تو وہ نجانے کس حال میں ہوگا، کسی ضروری میٹنگ میں ہوگا یا پھر دفتر کے کام میں مصروف ہوگا، ساتھ ہی ولی خان نے اس بات کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے کہ جب میرے بیٹے کے افسروں کو پتا چلے گا کہ راحیل کے ابو کی موت ہو گئی ہے تو یقیناً وہ فاتحہ خوانی کو بھی آئیں گے، ظاہر ہے جب وہ گاؤں میں آئیں گے تو انھیں یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ راحیل کا باپ ایک جندروئی تھا؛ تو اُن میں سے کچھ ایسے افسر بھی ہو سکتے ہیں جو یہ کہیں کہ ہمیں جندر دیکھنا ہے۔ اسی کے ساتھ ہی ولی خان یہ بھی سوچتا ہے کہ راحیل کی بیوی کو بھی نہ چاہتے ہوئے رسماً یہاں آنا ہوگا، اور گاؤں والوں سے بغل گیر ہونا ہوگا، جو اس کے لیے ایک مشکل اور ناگوار مرحلہ ہے۔ اس ناول کی یہی خوبی ہے اس کا ایک کردار اپنے حافظے میں دوسرے کردار بھی وا کرتا جاتا

ہے اور کہانی کو پھیلاتا جاتا ہے۔ ناول نگار نے رشتوں کے درمیان منافقت کو بھی دکھایا؛ کہ کیسے ایک سپوت اپنے فائدے کی خاطر، اپنی شان بچانے کی خاطر، اپنے باپ سے اس کی زندگی چھین لیتا ہے اور اسے موت کے دروازے پر پہنچا کر خود عیش کی زندگی گزارتا ہے۔ مگر اس کا باپ جو والدین کی محبت و شفقت کا ثبوت دیتے ہوئے اُسے قبول کرتا ہے، اگرچہ اسے یہ بھی معلوم ہے کہ گاؤں میں مشینی چکی کی روایت کا سلسلہ راحیل ہی نے شروع کیا تھا۔

اختر رضا سلیمی کا پسندیدہ موضوع زمان و مکان ہے۔ جندر کو زمان و مکاں کے لحاظ سے پرکھا جائے تو یہ ناول زمانی لحاظ سے خوب پھیلا ہوا ہے مگر جب ہم اِسے مکانی لحاظ سے پرکھتے ہیں تو یہ ایک ہی مقام، ایک ہی گاؤں، بلکہ ایک جندر تک سمٹا ہوا ہے۔ مکانی سے لحاظ سے یہ ناول اگرچہ محدود ہے مگر ولی خان اپنے لاشعور میں اس کو مزید وسعت دے دیتا ہے، کبھی وہ اپنے ماضی میں جا کر بازار سے کتابیں خریدنے جاتا ہے تو کبھی وہ گاؤں میں ونگار (مشترکہ کام) پر گیا ہوتا ہے۔

بظاہر تو جندر کی کہانی ہمیں صرف ایک شخص کے گرد گھومتی ہوئی نظر آتی ہے مگر دیکھا جائے تو یہ ایک فرد پورے معاشرے سے وابستہ ہونے اور ایک معدوم ہوتی ہوئی تہذیب کا عکاس ہے۔ جندروئی کے علاوہ اُس کی بیوی، بچے، بہو، دادا، پردادا، چچا وغیرہ کا ذکر بھی ہے جس سے ولی خان جڑا ہوا ہے۔ جندر میں جہاں ایک طرف ولی خان پرانی تہذیب کا علم بردار ہے تو دوسری طرف اُس کا بیٹا راحیل گاؤں کی روایتوں کے خلاف ہے، راحیل جب شہر میں منتقل ہوا تو اپنی ماں کو بھی ساتھ لے گیا، اسے اپنے ابو سے زیادہ ماں سے محبت تھی یہاں پر ناول نگار نے فرائیڈ کے نظریہ اوڈی پس کمپلیکس کا سہارا لیا ہے۔

راحیل نے گاؤں کی پرانی روایتوں سے بغاوت کی تو دوسری طرف وہ جدید تہذیب بھی گاؤں میں متعارف کراتا ہے۔ اگرچہ ولی خان نے گاؤں کی یادداشتیں محدود حد تک کی ہیں، مگر جس تہذیب اور ثقافت کا ذکر جندر میں ملتا ہے وہ اُس زماں اور مکاں (ہری پور) کی پوری طرح عکاس ہے، ناول نگار نے بڑی عمدگی سے پرانی رسومات کا باریک بینی سے مشاہدہ کیا اور اسے ناول کے کینوس پر بکھیر دیا: "گاؤں کی تمام فصلوں اور گھاس وغیرہ کی کٹائی اور گاہی لیتری کی صورت میں مشترکہ طور پر ہوتی تھی۔۔۔"

ناول کا پہلا جملہ ہی زندگی اور موت کا تصور ذہن میں اُبھار دیتا ہے، اور ساتھ ہی یہ تجسس بھی ذہن میں بٹھا دیتا ہے کہ آخر ولی خان کی موت کیسے ہوگی، اُس کی لاش کا کیا ہوگا، اور مرنے کے بعد وہ پہلا شخص کون ہوگا جو ولی خان کو مرا ہوا پائے گا اور حواس باختہ ہو کر گاؤں کی طرف بھاگے گا۔ زندگی کی بے ثباتی اور رنج رائیگانی کا یہ تسلسل ناول کے اینڈ تک برقرار رہتا ہے۔ ولی خان کی یہ حسرت ہے کہ کوئی چونگ پسوانے آجائے تاکہ اس کی روح کا سانس سے رشتہ بحال ہو۔ مجید امجد کے کلام

کا بغور مطالعہ کریں تو وہاں بھی موت کے وجودی تصور کی جھلکیاں خوب صورت انداز میں ملتی ہیں۔ اسی طرح اختر رضا سلیمی نے بھی موت جیسی بھیانک حقیقت کو خوش اُسلوبی سے دکھایا ہے۔ اختر رضا سلیمی کا فن یہاں بلندی کو چھوتا ہوا نظر آتا ہے، ولی خان جو اپنے لاشعور میں سوچوں میں گم ہے کہ میری موت کے بعد میری میت پر سب سے پہلے آنے والا فرد کون ہوگا، تو ساتھ ہی جانے پہچانے چہرے بھی اس کے ذہن میں آتے ہیں پہلے پہل اس کے ذہن میں اپنے بیٹے راحیل کا چہرہ آتا ہے، مگر یہ طناب امل بھی ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور کہتا ہے کہ شاید وہ نہ ہو، کیوں کہ اب ان کی شہر سے آمد تین ماہ بعد ہی ہوگی، راحیل کے بعد ولی خان کی سوچ جندر کے پیچھے گزرتے ہوئے تنگ راستے کے راہگیروں پر جاتی ہے۔ مگر یہ خیال بھی اس کے ذہن میں اُمڈ آتا ہے کہ میری لاش پر آنے والا پہلا شخص راہگیر بھی نہیں؛ کیوں کہ اب یہاں سے لوگوں کا گزر بسر کم ہو گیا ہے کوئی اِکا دُکا بندہ اگر گزرتا بھی ہے تو وہ مجھے پاگل سمجھتے ہیں، انجانے چہروں کے علاوہ وہ دوبارہ شناساؤں کی طرف آتا ہے قیاس آرائیوں اور خیالوں کی اسی رَو میں ولی خان کے ذہن میں ایک نورانی چہرہ آشکار ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر بابا جمال دین زندہ ہوتے تو میری لاش پر آنے والا پہلا بندہ وہی ہوتا کیوں کہ وہ جب تک زندہ تھے ہر دوسرے، تیسرے دن جندر پر آیا کرتے اور مجھ سے کہانیاں سُنا کرتے تھے۔ ناول نگار ایک کردار کے ذریعے مزید کرداروں کو واضح کرتے ہوئے ان کی تفصیلات کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ پوری کہانی مرقع کی صورت میں آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے۔ اختر رضا نے جندر کو وقت اور زندگی کی علامت کے طور پر بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ولی خان کی زندگی کو جندر سے جوڑ کر ناول کو آگے بڑھایا ہے، جب تک جندر پر چونگ آتی رہی تو اُس کی کوک ولی خان کی طاقت بنی رہی مگر جیسے ہی چونگ کا آنا کم ہوا تو ولی خان کی زندگی کا پہیہ بھی جام ہونے لگا؛ اصل میں یہاں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ جب تک جندر اور ولی خان کی جوانی کا دور دورہ تھا تو ان دونوں نے ایک دوسرے کا مکمل اور بھرپور ساتھ دیا جب تک یہ جوانی کے نشے میں رہے ان کو کسی کا خیال نہ آیا مگر جب بڑھاپا چھایا تو ولی خان اپنے لاشعور میں ماضی کی یادوں کا سہارا لے کر اپنے آخری لمحات کاٹ رہا ہے اور ساتھ ہی اپنی کمزوریوں سے بھی پردہ اٹھا رہا ہے۔ ولی خان ایک نظریاتی آدمی تھا اس کے نزدیک جندر کے مٹ جانے کا مطلب ایک تہذیب کا مٹنا ہے۔ اسی لیے وہ اپنی ساری زندگی بیوی بچوں کے بغیر جندر کے دامن میں گزار دیتا ہے۔ وہ اپنی معدوم ہوتی یادداشتوں میں یہی سوچتا رہتا ہے کہ میں نے پینتالیس دن پہلے جو چونگ پیسی تھی اور جندر کو بند کیا تھا؛ تو اس سمے میں زندگی کے آخری پل گزار چکا تھا۔ وہ اپنی موت کا عندیہ

اس طرح دیتا ہے:

"مجھے یقین ہے کہ جب پو پھٹے گی--- تو پانی سر سے گزر چکا ہوگا اور میری سانسوں کا زیر و بم--- کائنات کی اتھاہ گہرائیوں میں گم ہو چکا ہوگا اور پیچھے صرف بہتے پانی کا شور اور جندر کی اداس کوک ہی رہ جائے گی۔"

اختر رضا سلیمی نے اس ناول کے ذریعے دو تہذیبوں کا تقابل کیا ہے کہ کس طرح نو تشکیل یافتہ مشینی نظام کی آمد نے جہاں معاشرے کو ترقی کی راہ گامزن کیا ہے وہیں اس نے معاشرے کے اقدار کو پامال کیا ہے۔ یہاں ناول نگار نے پرانے دور کی معاشرت دکھائی ہے، کہ کیسے پرانے وقتوں میں لوگ انفرادیت کے بجائے اجتماعی زندگی گزارتے اور ایک دوسرے کے ساتھی بھی تھے۔ ناول نگار نے بڑی چابکدستی سے یہاں معاشرے پر طنز کیا ہے کہ پہلے لوگ کٹائی کے لیے صبح سویرے مسجد میں پہنچ جاتے تھے؛ اور جو لوگ جو شہر میں رہتے تھے وہ بھی کٹائی کے دنوں میں گاؤں آجایا کرتے تھے، گاؤں کے بزرگوں کو بڑا مان تان دیا جاتا تھا، گندم یا مکئی کی کٹائی سے پہلے گاؤں کے ایک بزرگ کو فصلوں کو معائنہ کروایا جاتا تھا اور جس مقام کا وہ تعین کرتا وہیں سے گندم یا مکئی کی کٹائی شروع کر دی جاتی؛ کٹائی کا یہ سلسلہ بڑی ترتیب کے ساتھ ہوتا تھا کہ اگلی قطار میں درانتی بردار ہوتے تھے جب کہ ان کے پیچھے ایک چھوٹی سے قطار میں گٹھڑیاں بنانے والے ہوتے تھے۔ کٹائی کے آغاز سے پہلے دعا کروائی جاتی اور پھر اگلی صف کے ساتھ میراثی ڈھول بجاتا ہوا درانتی برداروں کے ساتھ گندم میں اتر جاتا۔ ولی خان بتاتا ہے کہ ناشتے اور دن کے کھانے کا انتظام وہی کرتا جس کی فصل کاٹی جا رہی ہو؛ دن کا کھانا سادہ اور رات کے کھانے میں دیسی گھی، مرغ یا بکرے وغیرہ کے گوشت سے تواضع کی جاتی۔ مگر اب یہ حال ہے کہ لوگ اپنے بیل بیچ کر ٹریکٹر کے ذریعے کاشت کاری میں مصروف ہیں ہر کسی کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ رہی ہے اور خوشی کے مارے پھولے نہیں سما رہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اب وہ سہولت کے ساتھ کاشت کر سکیں گے اور بیلوں کو سال بھر کھلانا بھی نہیں پڑے گا۔

ناول کے ان موضوعات پر اگر نظر ڈالیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ جو لوگ مشقت کیا کرتے تھے، وہ اب سکون سے بیٹھ کے کھائیں گے مگر ان کا دھیان اس طرف نہیں گیا کہ جو کام ہم مل کر کرتے تھے اس میں برکت بھی ہوتی تھی اور آپس میں پیار بھی بڑھتا تھا؛ ولی خان بتاتا ہے کہ اگلے چند سالوں میں گاؤں کا نقشہ تبدیل ہو گیا ہے لوگ شادی بیاہ کا وہ سامان جو تمام گاؤں والوں کے گھروں سے اکٹھا کیا کرتے تھے، اب وہ ٹینٹ سروس کی دکانوں سے آنے لگا یہاں تک کہ قبریں بھی مزدوری پر کھودائی جانے لگیں۔ ولی خان ان رسومات کو بھلا وقت گردانتا تھا اس کے نزدیک اس کا اچھا وقت یہی تھا جب گاؤں میں لوگ مشین جیسی آفت سے آشنا نہیں تھے۔

ناول نگار نے یہاں لوگوں کی ترقی اور پہلو بہ

پہلو برسوں سے چلی آتی روایتوں اور کلچر کے معدوم ہونے کو بھی دکھایا ہے۔
جندر میں ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' کا ذکر اس بات کا شاہد ہے کہ اختر رضا سلیمی ان دو ناولوں سے متاثر ہیں۔ ''آگ کا دریا'' میں یہ دیکھنے کو ملتا ہے کہ لوگ طبقاتی کشمکش کا شکار ہو گئے تھے، اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ ہونا شروع ہو گئے تھے، یہ عمل مخصوص لوگوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ لوگوں کی بڑی تعداد تفریق کے عمل سے گزر نے لگی۔ ''اداس نسلیں'' میں طبقاتی کشمکش اور تقسیم ہند کے اثرات بھی دیکھنے کو ملتے ہیں، اس کے علاوہ لوگ جدید مشینری یعنی گاڑیاں، موٹریں وغیرہ کو عجوبہ سمجھتے تھے اور بڑے اشتیاق سے انھیں دیکھتے تھے۔ ان دو ناولوں میں طبقاتی کشمکش کے علاوہ مایوسی و حسرت کے پہلو کو بھی اُجاگر کیا گیا ہے۔ جندر میں بھی ناول نگار نے طبقاتی ناہمواری کے ساتھ موت کی حسرت کے منظر کو بھی پیش کیا ہے۔ اُن دو ناولوں کی نسبت جندر میں ٹریکٹر اور تھریشر کی آمد کے آثار مختلف ہیں، یہاں پر لوگ اُسے سہولت سمجھتے ہیں جب کہ ''اداس نسلیں'' میں نچلے طبقے کے لوگ اِسے دیکھنے کی حسرت میں تڑپ رہے ہوتے ہیں۔ ناول میں معاشرے کی عکاسی اہم گردانی جاتی ہے، ناول میں جس معاشرے کی عکاسی کی جاتی ہے، اس میں کردار اور واقعات کا مقام وہی ہوتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے جس معاشرے کو جندر کا حصہ بنایا ہے وہ ہری پور (ایبٹ آباد) کا معاشرہ ہے۔ اُنھوں نے اس کے پس منظر میں ہونے والے تاریخی واقعات کے ساتھ ساتھ لوگوں کے طرزِ عمل کو بھی باخوبی بیان کیا ہے۔ ''آگ کا دریا'' اور ''اداس نسلیں'' پر تقسیم ہند کے اثرات ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے تقسیمِ ہند کے بجائے اپنے علاقے تک محدود رہ کر نئے انداز اور نئے خیالات کو جندر کا حصہ بنایا ہے۔ طبقاتی کشمکش کی جھلک بھی اس ناول کے ذریعہ ہوتی ہے، معاشرے میں ہونے والی ناہمواریوں کا ذکر بھی ولی خان کی زبانی سننے کو ملتا ہے؛ ولی خان بتاتا ہے کہ جب اس کے دادا اور اس کا بھائی لوگوں کے ساتھ مل کر تڑشوائے گئے پاٹ لاتے ہیں تو راجا ان کی خاطر مدارت کرتا ہے مگر ان دو بھائیوں کو علاحدہ بٹھا کر سوکھی روٹی اور لسی دی جاتی ہے، راجا کے اِس روّیے نے ان کو اشتعال دلایا، وہ جب گھر پہنچتے ہیں تو غصے کے مارے سو نہیں پاتے، دونوں بھائیوں نے مشورہ کیا کہ اس ہتک کا بدلہ لینے کا حل یہی ہے کہ جہاں سے ہم پاٹ اٹھا کر لائے تھے اسے واپس وہیں رکھ آتے ہیں؛ سو انھوں نے بھی کیا اگلے دن جب جندر لگانے کے مستری آئے تو جندر کا ایک پاٹ غائب تھا۔ پورے علاقے میں اور گاؤں کے ہر اک فرد سے پوچھنے کے باوجود جب پاٹ کا پتا نہ چلا تو اچانک راجا کا ایک رشتہ دار بتاتا ہے کہ چوری انھیں دو آدمیوں نے کی ہو گی جنھیں ہم نے باقی

لوگوں سے علاحدہ دکھا کر کھانا دیا تھا۔ طبقاتی کشمکش کے ساتھ ساتھ بغاوت کا رنگ بھی ناول میں نظر آتا ہے: ''راجا کو غصہ پاٹ واپس لے جانے۔۔۔ پر نہیں تھا۔۔۔ اسے غصہ ان کے گردن اکڑ کر بات کرنے پر تھا۔''

اختر رضا سلیمی چوں کہ شاعر بھی ہیں، اسی مناسبت سے انھوں نے جندر میں شاعرانہ طرز کے جملوں کا استعمال کیا ہے، طرز ادا اور حسن بیان کو بہتر طور پر پیش کرنے کے لیے تشبیہ نہایت اہم ثابت ہوتی ہے۔ طویل بحث سے بچنے اور کلام میں خوب صورتی پیدا کرنے کے لیے تشبیہ استعمال کی جاتی ہے۔ بعینہٖ استعارہ کے ذریعے بھی مبہم، پیچیدہ خیالات کو پر اثر انداز میں بیان کیا جاتا ہے۔ اختر رضا نے جندر میں تشبیہ و استعارہ جیسی اصطلاحات کو خوب صورت انداز میں پیش کیا ہے۔ انھوں نے روایت شکنی کو استعاراتی انداز میں دکھایا ہے۔ ناول نگار نے جندر میں نئے اور جدید تشبیہ و استعارے کو متعارف کروایا ہے، کبھی وہ ولی خان کی آنکھوں کو سفید آٹے سے تو کبھی اس کے ڈھانچے کو ہسپتال کے کمروں میں لٹکے انسانی ڈھانچوں کی تصویر سے جوڑ دیتا ہے تو کبھی وہ ولی خان کی آنتوں کو ہاتھوں سے بنی ہوئی سویٹر سے یا پھر ولی خان کے باپ کے اندر ہونے والے احساسِ تنہائی کو جنگلی انار کے بوسیدہ پودے سے جوڑ کر پیش کر دیتا ہے۔ ''چاند مشرقی پہاڑی کی چوٹی والے کاہو کے درخت کی سب سے اونچی پھنگوں سے یوں منہ نکال رہا تھا، جیسے کوئی دوشیزہ ندی کے پانی کو آئینہ کیے اپنے منہ پر بکھرے بال سنوار رہی ہو۔''

جندر میں جو کردار دکھائے گئے ہیں وہ ایک مخصوص علاقے اور معاشرے کے عکاس ہیں۔ ''ولی خان'' جو کہانی کا ہیرو ہے ایک طے شدہ کردار ہے جس کی ہیئت سارے ناول میں ایک ہی جیسی رہتی ہے۔ البتہ جب اُس کے ماضی کو پرکھا جائے تو وہاں تھوڑے سے وقفے کے لیے اس کردار میں تحرک پیدا ہوتا ہے مگر مستقل طور پر وہ ایک طے شدہ کردار ہے۔ یوں کہہ سکتے ہیں کہ ولی خان ارتقا سے محروم رہ گیا ہے۔ مگر ولی خان کا کردار حقیقی زندگی کا عکاس ہے، ناول نگار کرداروں کی حرکات و سکنات کے ذریعے معاشرے کے اُن پہلوؤں کی طرف توجہ دلائی ہے جن سے لوگ آنکھیں موند کر چلے جاتے ہیں، جندروئی اپنی قدیم تہذیب و روایات سے دل و جان سے مانوس ہے اس لیے وہ قدامت پرستی کا ثبوت دیتے ہوئے جندر کو اہم سمجھتا ہے اور اس کے مدِ مقابل نئی مشینی ترقی کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اختر رضا سلیمی نے آٹے کی پسائی کے وقت پیدا ہونے والی دھول میں سے اس کردار کو واضح کر کے اپنے جذبات اور احساسات کے رنگ سے نکھار دیا ہے۔ ناول نگار کی کامیابی کا راز اسی میں پوشیدہ ہے کہ جہاں اتنے سارے کردار کی ضرورت محسوس ہوتی تھی انھوں نے فقط ایک کردار کے

ذریعے کہانی کا سارا خلا پُر کر دیا۔ ناول کو پڑھتے ہوئے کہیں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا کہ اس کہانی میں مزید کرداروں کی ضرورت ہے کیوں کہ ولی خان کا کردار ایسا ہے کہ وہ اپنے اندر کائنات سموئے ہوئے ہے۔

جندروئی کی بیوی ایک اہم اور مضبوط کردار ہے؛ جو آخر تک مضبوط رہتا ہے۔ اس کا کردار حقیقی زندگی کے بالکل قریب ہے۔ اس کے ذریعے ناول نگار بتاتا ہے کہ جیسا ہم سمجھتے ہیں ویسا نہیں ہوتا اور جیسا آپ چاہتے ہیں وہ مل نہیں پاتا۔ ہر انسان اپنی فطرت کے تابع ہوتا ہے اور فطرت کو تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ ہاجرہ سمجھتی تھی کہ ولی خان ایک بہادر انسان ہے، مگر معاملہ اس کے برعکس تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ ولی خان جندر کو چھوڑ کر گاؤں میں کوئی اور کام کرے مگر جندر کی کوک ولی خان کی نس نس میں خون کی طرح دوڑ رہی تھی جس سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا مطلب ولی خان کو فنا کرنے کے مترادف تھا۔

راحیل کا ذکر ناول میں وقفے وقفے سے چلتا رہتا ہے۔ راحیل ایسا کردار ہے جو روایات سے بغاوت اور توہم پرستی پر یقین نہیں رکھتا۔ راحیل کے ذریعے ناول نگار نے یہ ثابت کیا کہ پرانی روایات کے تابع رہو گے تو اس کا انجام ولی خان کے جیسا ہوگا۔ اگر آپ پرانی روایات کے ساتھ ساتھ نئی روایات کو بھی ساتھ لے کر چلیں گے تو کامیابی آپ کے قدم چومے گی۔

بابا جمال الدین یہ ایک مثالی کردار ہے جو تمام تر اچھائیوں سے بھرا ہوا ہے، وہ روحانی طاقتوں کے ساتھ ساتھ ناول میں ادبی شخصیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جس کے ذریعے ناول نگار کہانی کا رُخ موڑ کر اس کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ بابا جمال الدین فوق الفطرت شخصیت کا مالک ہوتا ہے اگرچہ فوق الفطرت عناصر داستان کا حصہ ہوتے ہیں مگر ناول میں بھی کہانی کے معاون ہو سکتے ہیں مگر ان کے استعمال کے لیے ایک وجہ پیدا کرنی ہوگی جس کے تحت ان کو پیش کیا جائے گا۔ ولی خان کی زندگی میں بدلاؤ بابا جمال الدین کے کردار کے تحت پیدا ہوتا ہے، جمالدین بچپن میں ہاجرہ اور ولی خان کو کہانیاں سُنایا کرتا تھا۔ پھر جب ولی خان کا اپنا دل اس طرف راغب ہوا تو پھر بابا جمال دین ان سے کہانیاں سُنا کرتے تھے۔

جندر کا پلاٹ سیدھا سادہ اور منظم ہے ناول کے ابتدا سے انتہا تک کسی جگہ یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہاں مصنف کا قلم تھک گیا ہے انھوں نے جس جذبے کے ساتھ آغاز کیا، اسی طرح ہی اس کا اختتام کیا ہے۔ جندر کا پلاٹ گٹھا ہوا ہے؛ بڑی سادگی اور مہارت کے ساتھ بہت بڑے موضوع کو 119 صفحات پر سمیٹا گیا۔ جندر میں ترتیب سے ایک کے بعد دوسرا واقعہ بیان ہوا ہے جو بالکل فطری ہے۔ تمام واقعات ایک دوسرے میں پیوست ہیں۔ اختر رضا سلیمی نے مختصر موضوعات میں ان

موضوعات کو چھڑا جو مدتوں سے بھنور کی تہہ میں گھوم رہے تھے۔ بھنور کی تہہ میں اچھے موضوع کو ڈھونڈنا اور پھر اسے فنی چابکدستی سے کینوس پر بکھیرنا ایک مشکل کام تھا جسے اختر رضا نے بڑی مہارت کے ساتھ پیش کر دیا۔

جندر میں اختر رضا سلیمی نے ولی خان کے کمرے کا جو منظر بیان کیا اس سے پورے کمرے کا نقشہ آنکھوں میں بھر جاتا ہے۔ جندر میں منظر کو جزئیات اور بڑی خوب صورتی اور اثر انگیزی کے ساتھ دکھایا ہے، کیوں کہ ناول میں جس تہذیب، معاشرت، اور واقعات کا ذکر ملتا ہے وہ اس سے پوری طرح آشنا ہیں۔ ہری پور (ایبٹ آباد) کی ثقافت کا نقشہ کھینچتے ہوئے انھوں نے چھوٹی سے چھوٹی چیز کو بھی مد نظر رکھا ہے۔ زمان و مکان کی شناخت، موسموں کا حال، اوقات، مکانوں، آبادیوں کا نقشہ منظر نگاری سے مجوا ہوا ہے۔ ناول میں اختر رضا سلیمی نے ''ولی خان'' کا بستر مرگ پر پڑا ہونا اور اس کے جسم کے ساتھ پیش آنے والے متوقع واقعات کو دل آویز انداز میں پیش کیا ہے۔ ''ولی خان'' کے پردادا کا راجا کے ساتھ شرط لگانے اور جندر کے پاٹ کو ایک میل تک اُٹھا کے لے جانے کا منظر اور اس کے ساتھ جندر کی ایجاد کے بارے میں جو ناول نگار نے جو نقشہ کھینچا ہے اس سے ایک مرقع سا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ حشرات کا ذکر ہو یا پھر موت کا منظر ان سب کے بیان میں اختر رضا سلیمی کو کمال حاصل ہے۔ ناول کا اقتباس دیکھیے میں جہاں ناول نگار نے بڑی مہارت کے ساتھ منظر کو جزئیات سمیت دکھایا ہے، جندر میں ناول نگار نے مناظر فطرت کے پس منظر میں انسان کے احساسات اور جذبات کو بھی اُجاگر کیا ہے:

''یہ آگ جو ابھی آتش دان میں بھڑک رہی ہے اور جس کے شعلوں سے نکلنے والی سپید و سرخ روشنی نے، میرے وجود سمیت، اس کمرے میں موجود ہر شے کو سائے کا اعتبار بخش رکھا ہے، میری موت واقع ہونے تک مکمل طور پر بجھ جائے گی۔۔۔''

اختر رضا سلیمی کا تعلق چوں کہ سرسبز و شاداب گاؤں سے ہے تو اس مناسبت سے ناول میں بیان کیے جانے والے تمام مناظر کا تعلق بھی ان کے آبائی گاؤں سے ہے۔ ناول کا مطالعہ کرتے ہوئے قاری آبشار پر لگے ہوئے جندر کی خاموشی اور پہاڑ سے گرتے ہوئے پانیوں میں کھو جاتا ہے۔ ناول نگار نے جہاں منظر نگاری میں جزئیات کا استعمال کیا ہے تو وہاں انھوں نے جزئیات میں سے دوسرے مناظر کو آشکار کر کے کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ وہ منظر و بے ساختگی اور فطری انداز میں دکھاتے ہیں ان کے بیان کردہ منظروں میں ایسا کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ مبالغہ آرائی یا پھر لفاظی کے ذریعے منظر کو بیان کیا ہے، وہ منظر کو بیان کرنے میں سادہ اور بغیر مبالغے کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ جندر میں قدرتی مناظر کے علاوہ معاشرتی تقاریب شادی بیاہ، اموات، ونگار وغیرہ کے مناظر کو دلکش انداز میں دکھایا ہے۔

اختر رضا سلیمی کے بیان کردہ مکالمے کرداروں کی

حیثیت کے مطابق اور فطری ہیں انھوں نے طویل مکالموں کے برعکس مختصر مکالے کو زیادہ اہمیت دی۔ جندر میں مکالموں کی ضرورت ناول نگار کو بہت کم محسوس ہوئی ہے کیوں کہ یہ ایک بیانیہ ناول ہے، بیانیہ ہونے کے علاوہ اس میں ہمیں خود کلامی کی مثالیں بھی نظر آتی ہیں؛ ولی خان کے پاس جب بوڑھا آٹا پسوانے آتا ہے تو وہ دل ہی دل میں حساب کتاب کرنے لگتا ہے، ولی خان کو خیالوں میں گم دیکھ کر بوڑھا اسے کہتا ہے کہ:

"آپ کچھ پریشان دکھائی دے رہے ہیں؟:

وہ جی میرے پاس اس وقت صرف پچاس کلو کے قریب آٹا ہے باقی تو میں آج ہی بیچ چکا ہوں۔میں نے مایوسی سے کہا۔"

مذکورہ بالا اقتباس میں ناول نگار نے بڑی خوب صورتی کے ساتھ مکالمے کے انداز کو دکھایا ہے ساتھ ہی انھوں نے ولی خان کے دل میں پیدا ہونے والے سوالات کو بھی اجاگر کیا ہے۔پورے ناول میں ولی خان خود کلامی کرتا رہتا ہے، موت کا منتظر ولی خان کبھی اپنی موت کے بارے میں خود سے کلام کر قیاس آرائیاں کرتا ہے تو کبھی وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ایک چونگ اب بھی میسر آ جائے تو میں اور میرے جندر کی زندگی کا پہیہ پھر سے چل دوڑے گا؛ اختر رضا سلیمی کا یہی کمال ہے کہ وہ ایک چیز کو بیان کرتے ہوئے اس موضوع سے جڑی دیگر چیزوں کو بھی کہانی جگہ دیدیتے ہیں اور وہ بالکل گتھا ہوا محسوس ہوتا ہے اس میں کوئی جھول نظر نہیں آتا۔ جندر میں اختر رضا سلیمی نے حشرات الارض، مافوق الفطرت عناصر اور معاشرے میں موجود توہمات کی بھی عکس بندی کی ہے۔ انھوں نے ذات پات کے نظام کے ساتھ اعتقادات کے نکتے کو بھی اُجاگر کیا۔

ناول نگار نے جندر میں کئی نفسیاتی نکتے بھی دکھائے ہیں۔ناول نگار نے ہاجرہ کے ذریعے عورتوں کی نمائندگی کی، اور دکھایا کہ عورت اپنی محبت کے درمیان کسی اور وجود کو برداشت نہیں کرتی خواہ وہ عورت ہو یا جندر۔ اسی طرح ولی خان کے والد کے دل میں مچلتا ہوا تنہائی کا احساس بھی شامل ہے۔ولی خان اپنے باپ کے اس کرب سے بہت دیر بعد آشنا ہوتا ہے مگر اُسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ میرا والد تو میری ماں کے غم میں یکسوئی کا شکار تھا اور خود اس کے اندر جندر کی کوک سرایت کر چکی تھی جو اس کے جسم کو خون اور سانس مہیا کر رہی تھی۔ ہاجرہ سے شادی کے باوجود بھی اُس کے اندر کی تنہائی ختم نہ ہوئی۔ حسرت اور تجسس سے شروع ہونے والا یہ ناول آخری لمحے تک قاری کو جکڑے رکھتا ہے۔ اختر رضا سلیمی کا نقطۂ نظر معدوم ہوتی ثقافتوں کو پھر سے زندہ کرنا ہے ۔ اختر رضا سلیمی نے کرداروں کے مکالموں کے ذریعے (ہری پور) کی ثقافت کو دکھایا ہے۔ جندر اُسلوب اور تخلیق کے لحاظ سے ایک گتھا ہوا ناول ہے، اختر رضا سلیمی نے نئے نئے موضوعات کو جندر کا حصہ بنا کر نہ صرف اس میں تنوع پیدا کیا ہے بلکہ ناول کی دنیا میں ایک نرالے اور انوکھے باب کا اضافہ کیا ہے۔

☆☆☆☆☆

اردو ناول میں دیہی معاشرت پر ایک تجزیہ

ناول نگاری کا فن ویسے ہی آج کل زوال پزیر ہے، ایسے میں ''اردو ناولوں میں دیہی معاشرت 1947 تا 1960'' لکھ کر جناب ڈاکٹر طارق مجید نے اردو ناول نگاری کے باب میں ایک نیا اضافہ کیا ہے- یہ کتاب جہاں اردو ادب کے طالب علموں کے لیے ایک تحقیقی درجہ رکھتی ہے وہیں ناول کے رسیا قارئین کے لیے ایک نئی چیز ہے-

جناب طارق مجید کا انداز اور پیشکش نہایت سادہ اور رواں ہے- ان کا اسلوب خالص تحقیقی ہے اور اس میں جاذبیت کی ایسی چاشنی ہے جو دل موہ لیتی ہے- جب یہ گہرائی میں جاتے ہیں تو کوئی نہ کوئی نئی بات پیش کرتے ہیں یا جب کوئی بات مختلف تحقیقی تجزیوں سے گنجلک ہو جاتی ہے تو یہ اس کی تشریح موثر انداز میں پیش کر دیتے ہیں- اس کتاب کا انداز نیا اور جدا ہے جس سے پڑھنے میں دلچسپی برقرار رہتی ہے-

عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ بہت سے تحقیق کرنے والے صاحبِ علم نے عام چلتے ہوئے موضوعات کو اس لیے اپنایا ہے کہ زیادہ گہرائی میں نہ اُترنا پڑے- ظاہر ہے اس سے ان کی تحقیق بھی اُسی معیاری کی ہو گی- اصل میں اردو ادب میں ایسے بہت سے موضوعات ہیں جنھیں آج تک چھیڑا نہیں گیا- یہاں جناب ڈاکٹر طارق مجید کی ہمت کی داد دینی پڑے گی کہ انھوں نے اردو ناول نگاری میں ''دیہی معاشرت'' کو اپنی تحقیق کا موضوع بنا کے، اپنی علمی بصارت و اُجاگر کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں- 1960 سے آگے کی کتاب کا ہمیں شدت سے انتظار رہے گا-

اس تحقیقی کتاب سے بہت سی نئی باتیں اور اُن نئی باتوں کے بارے میں پتہ چلا ہے، جو ناول پڑھتے ہوئے قاری کی آنکھ اور ذہن سے اوجھل رہتے ہیں- جناب طارق مجید نے اپنی کتاب میں آسان اور رواں زبان میں بڑی سادگی اور دلچسپی کے رنگ میں ہی نہیں بلکہ رنگا رنگ تحقیقی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی ہے- جوان کے مطالعے میں وسعت کی نشاندہی کرتا ہے-

جناب ڈاکٹر طارق مجید نے اس کتاب میں کہیں بھی سرسری گفتگو نہیں کی ہے- انھوں نے گہرائی میں اُتر کر تجزیہ کیا ہے اور اصل حقائق سامنے لائے ہیں- ان کا معیار کڑا ہے-

اردو ناول میں ''دیہی معاشرت'' کو زیرِ بحث لاتے ہوئے انھوں نے ہر موضوع پر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ان کے حوالے بھی درج کیے ہیں- تا کہ اردو کے طالب علم اور قاری اس سے استفادہ حاصل کر سکیں- بلاشبہ یہ کتاب ایک اہم دستاویز ہے- اس میں جناب ڈاکٹر طارق مجید نے صرف اور صرف حقائق پیش کیے ہیں اور جہاں ضرورت پڑی ہے اُن حقائق پر گفتگو کی ہے- ہم انھیں اس کتاب کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ مستقبل قریب میں جناب ڈاکٹر طارق مجید 1960 کے بعد کے ادیبوں کے لکھے گئے ناولوں پر بھی اسی قسم کی بہترین کتاب اپنے قارئین کے لیے پیش کریں گے-

نعمان منظور

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔
مصطفیٰ زیدی نے کہا ”افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔
شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلک کمیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔
ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب ’شاہ داشان‘ تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

بارڈر ڈسپیوٹ: سرحدی جھگڑے ملکوں کے درمیان ہی نہیں ہوتے، بسا اوقات ایک ملک کے صوبے بھی ایک دوسرے سے سینگ اڑا بیٹھتے ہیں۔ کچھ اس قسم کا جھگڑا پنجاب اور سندھ کے درمیان بھی تھا۔ گو دونوں صوبوں کا بارڈر تو کوٹ سبزل کے مقام پر ہے اور ریتی آخری ریلوے اسٹیشن ہے لیکن سرحدی لائنیں بالکل سیدھی نہیں ہیں۔ رحیم یار خان کے علاقے میں جانے کے لئے سندھ میں داخل ہونا پڑتا ہے۔ ان دونوں صوبوں کے درمیان وجہ نزاع وہ جنگل ہے جو قریباً آدھا پنجاب اور نصف سندھ

میں ہے۔ سندھ کا موقف یہ ہے کہ بڑا بھائی ہونے کے ناطے پنجاب کو فراخ دلی کا مظاہرہ کرنا چاہیئے اور تحفتاً ہی سہی وہ شجران سرسبز کا ذخیرہ چھوٹے بھائی کی جھولی میں ڈال دینا چاہیئے۔ پنجاب ففٹی ففٹی کی بات کرتا ہے۔ جنگل سنسان ہے۔ اس کو پنجاب ہاتھ لگا سکتا ہے اور نہ سندھ چھو سکتا ہے۔ اس کشمکش میں دو مسائل کھڑے ہو گئے ہیں، اس علاقے میں اگر کوئی واردات ہو جائے تو لوگوں کو پتہ نہیں چلتا کہ پرچہ کس تھانے میں درج کرایا جائے۔ پنجاب جائیں تو وہ سندھ دھکیل دیتے ہیں اور سندھی تھانے میں جائیں تو وہ دھتکار کر پنجاب بھیج دیتے ہیں۔ علاقے کے لوگ غریب ہیں، کچھ دے دلا تو سکتے نہیں اس لئے پولیس ''مشورہ فیس'' نہیں لے سکتی۔ اس گومگو کی کیفیت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے ڈاکوؤں نے مستقل ٹھکانے بنا لئے ہیں۔ صادق آباد اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بے شمار لوگ اغوا ہو جاتے ہیں جنہیں اس جنگل میں بطور یرغمال رکھا جاتا ہے۔ اگر تاوان مل گیا تو مغوی کو چھوڑ دیا نہیں تو پانچ روپے کی ایک گولی ٹھنڈی کرنا پڑتی ہے۔ ڈاکو تاوان کی رقم ہمیشہ خاندان کی مالی حیثیت سے بڑھ کر طلب کرتے ہیں۔ متاثرہ خاندان رعایت کی درخواست کرتا ہے۔ وہ تو بھلا ہو اپنی پولیس کا جو اس مذاکراتی عمل میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ بڑی ایمان داری اور خلوص نیتی سے فریقین میں سودا کرا دیتی ہے۔ تھوڑی بہت کمیشن دونوں اطراف سے مل جائے تو اسے رشوت نہیں گردانتی بلکہ محنتانہ سمجھ کر قبول کر لیتی ہے۔ علاقے میں بھی واہ واہ ہو جاتی ہے کہ بڑی مستعد پولیس ہے جس نے مغوی کو برآمد کرا کے ہی چین کا سانس لیا ہے۔ اس سلسلہ جنابی کا ایکسپرٹ انسپکٹر صادق تھا۔ دیدہ دلیر، چالاک، ہوشیار لوگ اُسے پیار سے صادق ڈکیت کہتے تھے۔ اسی طرح سکھر میں ایک پنجابی ایس ایس پی تھے۔ بڑے اصول پرست تھے۔ ڈاکوؤں سے منتھلی وصول نہ کرتے بلکہ ہر مغوی کا الگ الگ حساب کتاب رکھتے۔ ڈاکے میں لوٹی ہوئی رقم کا کچھ حصہ بھی مال مسروقہ کی بازیابی سمجھ کر وصول کر لیتے۔ اس سلسلے میں ان کی شہرت اس قدر بڑھی کہ آئی جی کو آخر خود سکھر آنا پڑا۔ معطلی تو خیر ہونی ہی تھی، کچھ عرصہ کے لئے انہیں حفاظتی حصار میں بھی رکھا گیا۔

اس تناظر میں بارڈر میٹنگز ہوتی رہتی تھیں۔ ڈی سی رحیم یار خان اور ڈی سی سکھر کاغذوں کا پلندہ لے کر ایک دوسرے کو قائل کرنے کی ناکام کوشش کرتے۔ جب ملاقات ختم ہوتی تو پتہ چلتا کہ نتیجہ آمدن، نشستند، گفتند، خوردن اور برخاستند نکلا ہے۔

ایک دن کمشنر ملک عبدالمجید کہنے لگے "شاہ صاحب! ہمیں بھی کبھی سکھر کی سیر کرائیں، سنا ہے دریائے سندھ کے کنارے آباد شہر بہت خوبصورت ہے۔ چنانچہ ان کی حسب خواہش ہم نے سکھر میں میٹنگ رکھی جس میں ڈی آئی جی اور ایس ایس پی بھی شامل تھے۔

ان دنوں سیّد روشن ضمیر سکھر کے کمشنر تھے۔ ان کے دفتر میں میٹنگ ہوئی۔ نتیجہ کیا نکلنا تھا وہی ڈھاک کے تین پات۔ فریقین اپنے اپنے موقف پر اڑے رہے چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اگلی میٹنگ رحیم یار خان میں رکھی جائے اور گفت وشنید کے علاوہ معزز مہمانوں کو لیور برادرز کا کارخانہ بطورِ خاص دکھایا جائے۔ جب ملک عبدالمجید نے میرا تعارف کرایا تو روشن ضمیر کہنے لگے انہیں کون نہیں جانتا۔ میں نے ان کی کتاب "اجنبی دیس میں" دو دفعہ پڑھی ہے۔ رات کو انھوں نے ہمیں کھانے پر بلایا۔ نہایت ملنسار اور ہنس مکھ انسان تھے۔ مجھے جس چیز نے زیادہ متاثر کیا وہ ان کا خُلق نہیں بلکہ سندھی زبان میں گفتگو تھی۔ اہل زبان تھے لیکن جب سندھی میں گفتگو کرتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے زبان بول نہیں رہے رس گھول رہے ہیں، اس کو لوریاں دے رہے ہیں۔ ہمارے اردو دان بھائی علاقائی زبانیں بولنے سے حتی الامکان اجتناب برتتے ہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ روم میں رہنا ہو تو پھر رومنوں کا سا طرزِ تکلم اختیار کرنا چاہئے۔ شام کو ان کے رابطہ افسر نے ہمیں موٹر لانچ پر دریا کی سیر کرائی۔ سکھر بیراج اور لینسڈاؤن برج کے درمیان پیر بابا کا مزار اور ہندوؤں کا مندر آمنے سامنے ایک جزیرے میں بقائے باہمی کا اصول اپنائے کھڑے ہیں۔ دریا میں جزیرہ ہے۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں انگریز فوجیں لینڈ کر گئی تھیں۔ انگریز کی چالاکی ملاحظہ فرمائیں۔ اس نے میرانِ سندھ سے معاہدہ کیا کہ اسے نیوی گیشن کی اجازت دی جائے۔ اس کی فوجیں Will not land on either side of river indus معاہدے کی پاسداری بھی ہو گئی اور فوجیں بھی اُتار دیں۔ معاہدہ کرتے وقت حاکمانِ سندھ سوچ بھی نہ سکتے تھے کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ یہی وہ ذہانت، مکاری اور حکمت عملی تھی جس کے بل بوتے پر انگریز نے آدھی دنیا پر راج کیا۔ جب سر ٹامس مور نے جہانگیر کے بیٹے کا علاج کیا تو جہانگیر نے خوش ہو کر کہا "اسے سونے میں تول دیں۔"

اس نے دست بستہ عرض کی "حضور کا اقبال مزید بلند ہو۔ خاکسار کو سونے کی حاجت نہیں بس ذرا تجارت کی اجازت دے دیں۔"

مینا بازار کے رسیا، انار کلی فہیم بادشاہ کو اس کے مضمرات جاننے کی فرصت کہاں تھی۔ مندر اور مزار کا ایک ہی جزیرے میں آباد

ہونا سندھیوں کی روایتی رواداری کا ثبوت ہے۔ سندھ میں کافی ہندو بستے ہیں لیکن کسی کو مذہب کی بنیاد پر کبھی گزند نہیں پہنچی۔ سکھر بیراج کے چونسٹھ دروازے ہیں کیونکہ یہاں سے دریائے سندھ پوری آب وتاب اور طمطراق سے گزرتا ہے۔ یہ اکیلا نہیں ہوتا اس کے شانہ بشانہ رفیقان دیرینہ، جہلم، چناب اور راوی ہوتے ہیں اور کبھی کبھی ستلج بھی ان سے بغلگیر ہو جاتا ہے۔ یہاں سے چھ نہریں نکال کر سندھ کی زمینوں کو سیراب کیا گیا ہے۔ بیراج بہت پرانا ہو گیا تو فوج کے انجینئروں نے دن رات کام کر کے اسے نئی استقامت بخشی۔ لینسڈاؤن برج بھی بہت پرانا ہے۔ اس کی جگہ نیا پل بن گیا ہے۔ اس کا شمار اب آثار قدیمہ میں ہوتا ہے لیکن اب بھی جو شان وشوکت لوہے کے اس Cage کی ہے وہ رتبہ بلند نئے پل کو حاصل نہیں ہو سکا۔

اگلے دن میں پارٹی کو خیرپور لے گیا۔ پرانی یادیں تازہ کرنے کا ایک نادر موقع ہاتھ آیا تھا۔ ملک مجید صاحب تو ویسے ہی فرلو کے موڈ میں تھے۔ میں انہیں سیدھا فیض محل لے گیا۔ مقصد یہ بتانا تھا کہ میں بھی اس محل میں کچھ عرصہ رہا ہوں۔ محل میں پہنچ کر بڑی ندامت ہوئی۔ میں نے راستے میں کچھ زیادہ ہی قصیدہ خوانی کر کے ان کی آتش دید کو بھڑکا دیا تھا۔ کیا ایسا بھی ہو سکتا ہے؟ وہ محل نہیں محل کا کھنڈر لگتا تھا، وہ مخملی گھاس، وسیع وعریض لان، گلاب کے پھولوں کی روشیں، گل ولالہ ونرگس ونسترن کچھ بھی نظر نہ آیا۔ کدھر گئی وہ مخملی گھاس جس پر صبح کو سیر کرتے کرتے میں اکثر سو جایا کرتا تھا۔ محل کی ویرانی دیکھی نہ گئی۔ سرخ اینٹیں اپنا رنگ روپ کھو چکی تھیں۔ چار سو عنکبوت کے جالے نظر آتے تھے۔ وہ مرکزی ہال جس میں دنیا کا بہترین فرنیچر رکھا تھا، جس کے بھاری شینڈ لیرز فرانس سے امپورٹ کیے گئے تھے اور جن کی دیواروں پر میران خیرپور کے قد آدم پورٹریٹ آویزاں تھے، سب غائب تھے۔ ملک مجید نے ایک معنی خیز مسکراہٹ سے میری طرف دیکھا۔ یہی تھے وہ محل جس کی تعریف کرتے کرتے تمہاری زبان نہ تھکتی تھی۔ لگتا ہے بچپن میں تم نے ضرور کوئی خواب دیکھا ہوگا۔ اگر وہ خواب بھی تھا تو اس کی تعبیر نکل آئی تھی۔

ایسا کیونکر ہوا؟ کریدنے پر پتہ چلا کہ سابق والئی ریاست میر علی مراد خان نے درویشانہ روش اختیار کر لی ہے اور مذہب سے اس قدر لگاؤ ہو گیا کہ دنیاداری کی پروا نہیں رہی۔ وہ محرم میں عزاداری پر تو لاکھوں روپے خرچ کر دیتا ہے لیکن اپنی شان و شوکت کو قصہ پارینہ بنا دیا۔ یہ وہی علی مراد خان تھا جس نے انگلینڈ کی بہترین درس گاہوں میں تعلیم پائی تھی۔ جس کے محل سے نکلنے کے وقت چاروں برجوں میں بگل بجتے تھے، سو مسلح موٹر سائیکل سواروں کی معیت

میں کوٹ ڈی جی جاتا تھا رولز رائس سے کم گاڑی میں نہ بیٹھتا تھا اور جس کے مطبخ میں سینکڑوں آدمیوں کا کھانا پکتا تھا۔
ویسے بھی ریاستیں ختم ہونے کی وجہ سے والیان کی وہ سج دھج کہیں بھی نہ رہی تھی۔ جو ہوشیار تھے انھوں نے بچی کھچی جاگیر بیچ کر کارخانے لگا لیے۔ باقی عظمت گم گشتہ کا داغ سینے سے لگائے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ مرکزی حکومت نے کچھ نہ کچھ وظیفہ تو ضرور مقرر کیا جس سے زندگی تو بسر ہوسکتی تھی پہلی سی سج دھج اور طمطراق ممکن نہ تھا۔
ڈی سی نے ریسٹ ہاؤس میں چائے کا بندوبست کیا تھا۔ میں انہیں بٹھا کر شہر دیکھنے چلا آیا۔ شہر خاصا پھیل چکا تھا۔ پرانے مکانوں کی جگہ پلازے بن گئے تھے۔ اپنی پرانی کوٹھی دیکھی تو سینے میں ایک ہوک سی اٹھی۔ وہ منظر آنکھوں کے سامنے آ گیا جب تایا جی کا جنازہ اٹھا تھا۔ کوٹھی کے بالمقابل سبزہ زار میں جنازہ پڑھا گیا۔ وزیر اعلیٰ ممتاز حسن قزلباش، وزیر تعلیم، ایم اے سیال، فاروق حیدر درانی سب موجود تھے۔ سینکڑوں باوردی سپاہیوں نے انہیں آخری سلامی دی تھی۔ میری پھوپھی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ گرتے آنسو رکتے ہی نہ تھے۔ خالہ عصمت انہیں تسلیاں دے رہی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر دوبار کورامین کے انجکشن لگا چکی تھی۔ نوکر، نوکرانیاں آہ و بکا کر رہے تھے اور میں حیران ہو رہا تھا کہ ہنستا مسکراتا شخص اچانک مر کیسے جاتا ہے۔
ناز ہائی سکول کی پرانی عمارت کو گرا کر اس پر کثیر المنزل عمارت کھڑی کر دی گئی تھی۔
بازار البتہ وہی تھا۔ اس میں کوئی نمایاں تبدیلی نہ آئی تھی۔ ہندو حلوائیوں کی دکان پر انواع و اقسام کی مٹھائیاں سج دھج کے ساتھ رکھی تھیں، ملنگ سوٹوں پر گھنگھرو باندھے اور رنگ برنگی جھنڈیاں سجائے لنگریوں میں خشخاص گھوٹ رہے تھے۔ بجلی گھر، ہائی کورٹ کی عمارت، پولیس لائن، لقمان میں ناز ہائی سکول کی نئی عمارت ہر چیز اسی طرح تھی۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے: کسی بھی فعال ڈپٹی کمشنر کی سوشل لائف خاصی محدود ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس کی وجہ پندار مناصب نہیں بلکہ احساس ذمہ داری ہے۔ چھوٹے ضلعوں میں تو بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے۔ بالفرض آپ نے بازار جا کر ٹوتھ پیسٹ بھی خریدی تو اگلے دن شہر میں مختلف قصے مشہور ہو جائیں گے۔ کوئی کہے گا کہ ڈی سی نے کل ہزاروں روپے کی شاپنگ کی ہے، کوئی چسکا لیتے ہوئے دوسروں کو بتائے گا کہ سب کچھ مفت خریدا گیا ہے۔ دکاندار کی کیا مجال کہ صاحب بہادر سے قیمت مانگتا۔ دوسرا اس کی تصحیح کرتے ہوئے کہے گا کہ بھائی قیمت تو ادا ہو گی لیکن اس کا بوجھ بے چارے

پٹواریوں پر پڑا ہے۔ اکثر ویسے ہی حیران ہوں گے کہ کیا ڈپٹی کمشنر تو تھ پیسٹ خریدنے خود چل کر آ سکتا ہے، کیا سارے نوکر اور خدمت گار مر گئے تھے۔ ایک دن میں صبح سیر پر نہ جا سکا۔ شام کو اکیلا ریلوے لائن کی طرف نکل گیا۔ جب اوور ہیڈ برج کے نزدیک پہنچا تو پیچھے سے ایک کار کے اچانک بریک لگنے کی آواز سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک وکیل صاحب کالا کوٹ پہنے گاڑی سے اُتر کر بڑی حیران کن نظروں سے مجھے مسلسل دیکھے جا رہے تھے۔

''خیریت تو ہے؟'' میں نے سمجھا کہ مجھ سے کوئی کام ہے جو رک گیا ہے۔

بولا ''آپ اکیلے اس وقت، اس ویرانے میں سیر کر رہے ہیں؟''

''کچھ ایسا ہی ہے'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''کیا کوئی خاص بات ہے؟''

کہنے لگا ''بات تو کوئی خاص نہیں البتہ حیرانی ضرور ہو رہی ہے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی ڈپٹی کمشنر کو یوں اکیلے بغیر گارڈ کے گھومتے ہوئے دیکھا ہے۔''

شہر میں کوئی کام کا ہوٹل یا ریسٹورنٹ بھی نہیں تھا جہاں کبھی کبھار فیملی کے ساتھ کھانا کھایا جا سکتا۔ صادق کلب تھا جس کا بلحاظ عہدہ میں چیئرمین تھا۔ دیگر کلبوں کی طرح وہاں بھی ٹینس، سکواش، بلیرڈ اور سوئمنگ کے علاوہ شام کو تاش کی بازیاں لگتی تھیں۔ تاش کھیلنے والوں میں اکثریت وکیلوں کی تھی۔ میں کرکٹ، ہاکی اور فٹ بال تو کھیلتا رہا ہوں لیکن اتفاق سے ٹینس یا سکواش کبھی نہ کھیلی تھی۔ سوئمنگ بھی صرف گاؤں کے تالابوں میں کی تھی اس لئے کلب بھی کبھی کبھار ہی جانا ہوتا۔

جب بھی فرصت ملتی رات کو مرزا یاسین ایس ایس پی اور میں لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے کے ایل پی روڈ پر نکل جاتے۔ شہر سے پندرہ میل دور ایک پٹھان کا ہوٹل تھا۔ وہاں جا کر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس سے چائے کے دو کپ منگواتے۔ پتہ نہیں نام تو اس کا کیا تھا لیکن ہم اسے حاجی مٹھا کہہ کر بلاتے کیونکہ چائے کی پیالی کے ساتھ وہ سفید مٹھائی بھیجنا نہ بھولتا۔ ہم نے اس کے ہوٹل کا نام بھی ویران شیزان رکھا ہوا تھا۔

چوہدری ہدایت اللہ: اس کے علاوہ چوہدری ہدایت اللہ سے بھی کبھی کبھار ملاقات ہو جاتی۔ چوہدری ہدایت اللہ چوہدری منیر کے والد تھے۔ ارائیں برادری کے ایک اعتبار سے سربراہ تھے۔ میں انہیں ارائیوں کا پوپ پال کہتا۔ ترقی کرنے میں منیر کی محنت کے علاوہ ان کی تربیت کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ انھوں نے زندگی کی اُونچ نیچ دیکھ رکھی تھی اسی لئے ہر مشکل مرحلہ پر اپنی اولاد کے لئے ڈھال بن جاتے۔ کتابوں کے رسیا تھے۔ میری ہر کتاب کو انھوں نے کئی مرتبہ پڑھا اور اس پہ بے لاگ تبصرہ فرماتے۔ ایک اعتبار سے

رحیم یار خان کے مؤرخ بھی تھے۔ مخادیم کی رنگینیوں، بوالعجبیوں، بدحواسیوں اور رعونت کے قصے چٹخارہ دار زبان میں سناتے۔ ان کا دسترخوان بڑا وسیع تھا۔ شام ہی ان کے ڈیرے پر ملاقاتیوں کا جمگھٹا لگ جاتا۔ ان کے باورچی ویسے تو سارے کھانے نہایت عمدہ بناتے لیکن مچھلی پکانے میں خصوصی مہارت تھی۔ جب بھی مرزا صاحب اور میرا مچھلی کھانے کو جی کرتا تو انھیں اطلاع دے دیتے۔ بڑے اہتمام سے پانچ چھ قسم کی مچھلی تیار کراتے اور ہماری آمد سے قبل ہی سب ملاقاتیوں کو رخصت کر دیتے۔ ان کا گھر رحیم یار خان کے خوبصورت ترین گھروں میں سے ایک تھا۔ اس میں چوہدری منیر کی جمالیاتی حسوں کا بھی بڑا عمل دخل تھا۔ منیر کے علاوہ ان کا چھوٹا بیٹا بھی تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ بھائیوں کے مزاجوں میں بعد المشرقین تھا۔ چوہدری منیر دنیا دار اور بڑی لبرل سوچ کے "مخیر" انسان ہیں۔ جبکہ بڑے بھائی نے دنیا کو یکسر تج دیا تھا۔ چوہدری ہدایت اللہ چاہتے تو بڑی آسانی سے ممبر قومی اسمبلی منتخب ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے شاہ بننے کی نسبت بادشاہ گر بننا زیادہ پسند کیا۔

سردار اسلم جلوانہ: سردار اسلم جلوانہ کا فارم شہر سے خاصا دور تھا۔ سردار صاحب ریاست بہاولپور میں اکاؤنٹنٹ جنرل رہے۔ جب ریاست کا الحاق ہوا تو کچھ دیر بعد نوکری چھوڑ دی۔ وہ مولوی اختر علی کے داماد تھے۔ مولوی صاحب نے انھیں بھی بیس پچیس مربعے زمین الاٹ کی جو اس وقت محض ریت کا ٹیلہ تھا۔ سردار صاحب کی شب و روز کی محنت نے اسے گل و گلزار میں بدل دیا۔ ریلوے اسٹیشن سے اونٹ پر سفر کر کے زمینوں تک پہنچتے۔ جمالیاتی ذوق پایا تھا، پھولوں کی کوئی ایسی قسم نہ تھی جو ان کے سرسبز و شاداب لان میں موجود نہ ہو۔ ان کے ماڈرن ولا میں فرنیچر، کراکری اور قالین بھی منفرد تھے۔ سارے بہاولپور ڈویژن میں دو لوگ پھولوں کی افزائش کے لیے مشہور تھے۔ ایک تو یہ خود تھے اور دوسرا شخص بھی کوئی اور نہیں تھا ان کے چھوٹے بھائی سردار افضل جلوانہ تھے جن کا فارم دیکھنے کی خواہش چیف جسٹس لاہور ہائی کورٹ غلام مجدد مرزا صاحب نے بھی کی تھی۔

سردار اسلم جلوانہ ایوب خان کی کنونشن لیگ کے سیکرٹری جنرل بھی رہے۔ انھیں محلاتی سازشوں کا علم تھا جو ایوب کے آخری دور میں ہوئیں۔ صدارتی الیکشن کا ذکر کرتے ہوئے بتانے لگے ایوب کو اس کے مشیروں نے قائل کر لیا تھا کہ اس کے مقابلے میں پہلے تو کوئی کھڑا ہی نہیں ہوگا اور بالفرض کسی نے جسارت کر بھی لی تو اسے عبرت ناک شکست ہوگی۔ چنانچہ الیکشن کا اعلان ہو گیا۔ اس کے سان و گمان میں بھی یہ بات نہ تھی

کہ نواب زادہ اینڈ کمپنی محترمہ فاطمہ جناح کو اس کا مقابلہ کرنے کے لئے آمادہ کر لیں گے۔ چنانچہ جب وہ الیکشن کمپین پر نکلیں تو ایک بھونچال آ گیا، عوامی سطح پر اُن کی جو پذیرائی ہوئی اس نے ایوب کو جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ پہلے تو اس نے اپنے ان کاسہ لیسوں کو بے نقط سنائیں جنھوں نے اسے سہانے خواب دکھائے تھے اور پھر الیکشن میں جھرلو پھیرنے کا منصوبہ بنا۔ ساری انتظامیہ کو متنبہ کیا گیا کہ نتائج ''مثبت'' آنے چاہئیں۔ یوں لگتا تھا کہ کمشنر، ڈپٹی کمشنر، ایس ڈی ایم اور مجسٹریٹ سرکاری ملازم نہیں بلکہ ایوب خان کے پولنگ ایجنٹ ہیں۔ پولیس نے مخالفین کی پکڑ دھکڑ شروع کی۔ پرچیوں کے پلندے بیلٹ بکسوں میں ٹھونسے گئے۔ محترمہ کے ایجنٹوں کو ڈرا دھمکا کر بھگا دیا گیا۔ ہر چہ باد باد ہو گیا۔ سرکاری افسروں میں ریس لگ گئی کہ زیادہ پرچیاں کون ڈالتا ہے۔

کہنے لگے ''ایوب خان نے ناجائز ہتھکنڈے تو استعمال کیے ہی تھے نجی محفلوں میں ہرزہ سرائی پر بھی اُتر آتا اور محترمہ فاطمہ جناح کے لئے نہایت نازیبا الفاظ کہتا۔ وہ اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ الیکشن کمشنر کو رزلٹ فی الفور اناؤنس کرنے کا کہا اور اس کے بعد الطاف گوہر کی لکھی ہوئی تقریر بھی ریڈیو پر پڑھ ڈالی۔ مختصر تقریر میں یہ فقرہ حاصل غزول تھا۔

I am also thankful to those who differed with me. They too have served the cause of democracy.

ایک طنز آلود مسکراہٹ سردار صاحب کے چہرے پر اُبھری۔ اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہنے لگے ''منافقت ہماری ثقافت، صحافت اور سیاست کا سکہ رائج الوقت بن گئی ہے۔ جو کچھ ان دنوں ایوان صدر میں ہوا میں اس کا عینی گواہ ہوں لیکن شہادت دینے کی نوبت شاید کبھی نہ آئے۔ کون سی ایسی عدالت ہے جو وطن عزیز میں ایک آمر کو سزا دے سکتی ہے۔ سردار صاحب اسی کے پیٹے میں تھے۔ گہرا گندمی رنگ اور لمبا قد تھا۔ چہرے پر جھریوں نے جال تو نہیں بنایا تھا لیکن تانے بانے بننے شروع کر دیے تھے۔ اس خوبصورت ولا میں اکیلے رہتے تھے۔ بیگم اور ان کی بیٹی کراچی میں مقیم تھیں۔ ایک بیٹا کیلگری (کینیڈا) اور دوسرا بھی آئل کمپنی میں ایگزیکٹو تھا۔ انہیں دراصل کھلی فضاؤں اور تازہ ہواؤں سے اُنس ہو گیا تھا۔ پراگریسو فارمر تھے، سارا دن زمینوں پر کھڑے ہو کر کاٹن کاشت کراتے۔ گھر تک آتی ہوئی طویل سڑک کے دو رویہ یوکلپٹس کے درخت لگا رکھے تھے۔ جب گاڑی ان کے درمیان سے گزرتی تو نفسیاتی طور پر ہی صاحب خانہ کا امیج ذہن پر نقش ہو جانا شروع ہو جاتا۔

نواب کالا باغ کے ایوب خان سے اختلافات کا ذکر چھڑا تو بتانے لگے آخری دنوں میں نواب صاحب نے اسے زچ کر دیا تھا۔ امیر محمد خان کی طبیعت میں ضد تو پہلے ہی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، اب چڑچڑا پن آنا بھی شروع ہو گیا تھا۔ حبیب اللہ پراچہ کیس تو بہانہ بن گیا دراصل چوہدری ظہور الٰہی کے متعلق جو گل افشانی کی تھی اس سے ایوب کی طبیعت مکدر ہو گئی تھی۔ جب صورت حال اس قسم کی ہو جائے تو پھر مخالفین کو بھی کھل کھیلنے کا موقعہ مل جاتا ہے اور وہ حسب استطاعت کان میں کچھ نہ کچھ پھونکتے ہی رہتے ہیں۔ نواب صاحب نے تو مخالفین کی پوری فوج کھڑی کر رکھی تھی۔ دبنگ انسان تھے کسی کی پرواہ کرتے، کسی کو خاطر میں بھی نہ لاتے۔ ایوب خان نے ان کو فارغ تو کر دیا لیکن نہ جانے کیسے اُسے باور کرایا گیا یا ازخود یہ بات اس کے ذہن میں بیٹھ گئی کہ نواب منتقم مزاج آدمی ہے اس پر کسی نہ کسی رنگ میں حملہ آور ہو گا۔ اتفاق سے ان دنوں محمد خان ڈاکو کا بڑا چرچا ہوا۔ ایک تو وہ اعوان تھا پھر نواب صاحب کا ہم نام تھا۔ ایوب خان کو بتایا گیا کہ نواب صاحب کوئی نہ کوئی ''کارخیر'' اس سے بھی کروا سکتے ہیں۔ چنانچہ سارے صوبے کی پولیس حرکت میں آ گئی۔ امیر محمد خان کے حواریوں کو چن چن کر پکڑا گیا، اس کی زد میں ان کا سابقہ ریلوے منسٹر سردار محمد حیات ٹمن بھی آ گیا جس کو گرفتار کر کے پولیس نے خفیہ راز اگلوانے کی کوشش کی۔ اگر کوئی راز ہوتا تو وہ بتاتا لیکن اس تفتیشی مرحلے میں سردار صاحب کی خاصی سبکی ہوئی۔ ایس پی نے نہ صرف انہیں تھپڑ مارا بلکہ لکڑیوں کے ٹال سے ترازو منگوا کر ان کا وزن بھی کرایا۔ دیسی علاقوں میں تذلیل وتضحیک کا یہ آخری حربہ ہے۔ امیر محمد خان کے قتل کے ڈانڈے بھی اسی مناقشت سے جا ملتے ہیں۔ اگر اس کے بیٹوں کو رائی بھر بھی گمان ہوتا کہ انہیں باپ کے قتل کے جرم میں سزا ہو سکتی ہے تو بھول کر بھی یہ حرکت نہ کرتے۔ انہیں کسی طور یقین تھا کہ وہ صاف بچ جائیں گے۔ اسلم جلوانہ صاحب کے چہرے پر کرب کی ایک لکیر اُبھری۔ اس پوزیشن پر پہنچ کر حکمران صرف شکی مزاج ہی نہیں بلکہ کانوں کے کچے اور کافی حد تک بزدل بھی ہو جاتے ہیں۔

ہفتے میں ایک بار میں ان کے فارم پر ضرور جاتا۔ کچھ دیر تو ہم باہر لان میں بیٹھ کر گلہائے رنگارنگ کا نظارہ کرتے۔ ان کی خوشبو سے مشام جاں کو تروتازہ کرتے اور پھر اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر سردار صاحب کے انکشافات سے مستفید ہوتے۔

[جاری ہے۔]

پاکستانی غزل 2010 کے بعد
دیواروں سے ہوتی ہے نموداری ہماری

شاعرِ امروز
اعجاز رافع

شاہد ماکلی

اعجاز رافع کے تخلیقی لاشعور کی فعالیت حیرت انگیز اور امکانات گیر ہے۔ اس فعال تخلیقی لاشعور کے پیچھے ان کا تنقیدی شعور کھڑا ہے۔ یہ شعور گہرا، وہبی اور غیر اکتسابی ہے۔ اعجاز رافع کی شاعری ایک متجسس اور سیماب روح کا سیاحت نامہ ہے۔ وہ اپنے سوالوں کے جواب کھوجنے کے لیے ایک طویل مگر صبر آزما سفر پر نکلے ہوئے ہیں۔ ان کی تخلیقی اٹھان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اعجاز رافع اگر اپنے بیش از بیش امکانات کو، جانفشانی اور اخلاص کے ساتھ، تصرف میں لاتے رہے تو ان کے بابِ فردا پر ایک تابناک شعری بشارت کی دستک صاف سنی جا سکتی ہے۔

اعجاز رافع۔ 29 نومبر 1995 کو فورٹ عباس میں پیدا ہوئے۔ 2022 میں اسلامیہ یونیورسٹی آف بہاولپور سے ایم فل کیا۔ ’’شکیب جلالی کی غزل کے جدید اردو غزل پر اثرات‘‘ کے عنوان سے تحقیقی مقالہ برائے ایم فل تحریر کیا۔ ان دنوں گورنمنٹ گریجوایٹ کالج فورٹ عباس میں تدریسی فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب:

وہ تو اچھا ہوا، اس سمت میں تُو تھا ہی نہیں
ورنہ ہم دوسرے لوگوں سے بہت پیچھے تھے

ہمارے ہجر میں ہوتی ہیں کس کی آنکھیں سفید
کسی کو فائدہ کیا ہو ہمارے کرتے سے

ہماری آنکھ بنائی گئی ہے مٹی سے
سو اشک روک کے رکھیں تو گارا بنتا ہے

پھل اترنے کی توقع میں جو بیٹھے ہیں، سنیں
پیڑ کو صرف ہلاتی ہے ہوا پانی میں

سمے اس پار جانے میں لگے گا
ہمارے سامنے دریا نہیں ہے

جنبشِ لب جو ہوئی، اس نے کیا خود سے کلام
اور ہم بات سمجھنے کو ذرا آگے ہوئے

کوئی ستارہ ہی ہوتا ہمارا سمت نما
یہ کن درختوں کے سائے میں شب نے آلیا ہے

ہر اک امید کا حاصل پتا ہے پہلے سے
پہاڑ کاٹنے جاتا نہیں میں تیشے سے

یہ کائنات مسخر ہوئی پڑی ہے یہاں
جو اس کو دیکھ رہے ہیں، وہ کیا تلاش کریں

سوچا تھا جہانوں میں توازن کا بھی ہم نے
پھر اپنے مسائل کی ہی ترتیب بنا لی

کھڑکی سے ٹپک پڑتی ہے دھوپ اپنی جبیں پر
چھت ہو بھی تو پردے کی سہولت نہیں ملتی

آسماں ٹکڑوں میں تقسیم ہوا چاہتا ہے
دائرہ کھینچا جاتا ہے کوئی پانی پر

غیر ملبوس بدن ذہن میں رہ جاتے ہیں
کھل کے ہم گفتگو کرتے نہیں عریانی پر

سلطنت زیرِ نگیں اس کے چلی جاتی ہے
جس کو معمور کیا جاتا ہے دربانی پر

جب اس قبیلے کے روزہ داروں میں بیٹھتے ہیں
شراب کی تیز بُو سے گھٹتا ہے دم ہمارا

بہت بہادر سمجھ لیا ہے ہمیں سبھی نے
ستارہ ٹوٹے تو ٹوٹتا ہے بھرم ہمارا

ہم لوگ محبت میں کسی کے نہیں ہوتے
یاد آئے گی اک روز وفاداری ہماری

تم صحن سے کاٹو بھی تو ہم ایسے شجر ہیں
دیواروں سے ہوتی ہے نمو داری ہماری

بھلی تو لگتی تھی خوش منظری تیقن کی
ہوا نکلنے لگی ہے اب اس غبارے سے

عجب عذاب ہے یکسانیت کی بیزاری
لگائے رکھے گی کب تک ہمیں کلیجے سے

بہت ہے فائدہ دربان کا بھی
کوئی دیوار پر لکھتا نہیں ہے

سپہ سالار کو سمجھائیں کیسے
یہاں پر جنگ کا خطرہ نہیں ہے

یہ کس نروان کے نشے میں ہوں میں
کوئی بھی معتبر لگتا نہیں ہے

نظر سے کاٹیے ہر شب خلا کو
یہ تیشہ اتنا بھی تیکھا نہیں ہے

گلال مَل لیا سوتیلے پن کی چادر پر
جوان ماں نے کئی رنگ دیکھے بیٹے میں

جشن منانے والو! کوئی تو ایسا ہو
جنگ میں جیت کا مطلب جس نے سمجھا ہو

آپ کی حرمت سے ٹکراتی ہے ہر سوچ
اس دیوار میں چھوٹا سا دروازہ ہو

ماں تصویر سے ایسے باتیں کرتی ہے
جیسے بیٹے نے واپس بھی آنا ہو

کبھی کبھی اس جنت میں دم گھٹتا ہے
دل کہتا ہے بھاگیں کوئی رستہ ہو

اس قدر زور لگاتی ہے ہوا پانی میں
آسماں تک کو ہلاتی ہے ہوا پانی میں

خاک کا علم تو محدود ہوا کرتا ہے
آگ ہی فرق بتاتی ہے ہوا پانی میں

قرب اک چڑچڑا پن طاری کیا کرتا تھا
تھوڑا خوش رہنے کو ہم لوگ الگ رہتے تھے

کوئی نہیں اپنا جو بچھڑ کر چلا جائے
افسردہ ہی کر سکتی ہے بس ریل کی سیٹی

یہ وقت اپنی روانی میں بہتا رہتا ہے
یہ ہم جو ڈوب رہے ہیں بھنور بنائیں گے

ہمیں ملی ہے محبت کی اک کٹی ہوئی شاخ
اسے لگائیں گے دل میں شجر بنائیں گے

صحیح سمت میں چلنا نصیب ہو سب کو
بھٹکنے والے کوئی راستہ تلاش کریں

یہ زرد پیڑ مصیبت میں کام آتا ہے
اسی کے سائے کے اندر ہرا تلاش کریں

ہم ہیں سرمایہ ان بزرگوں کا
سوچتے ہیں جو تاجروں کی طرح

میں کس فضائے تسلط میں پھنس گیا یارب
کہ تیرا نام بھی دل سے نہیں لیا میں نے

منصفِ ازل مجھ کو داستاں سنا میری
ہوش میں نہیں تھا میں خودکشی سے پہلے تک

کاٹنا رات تارے گن گن کر
پھر پتنگیں اڑانے لگ جانا

یونہی رہنا کسی سے رابطے میں
پھر محبت جتانے لگ جانا

کسی کو پہلی محبت ہوئی کسی کے ساتھ
لباس پہنا کسی نے کسی کا اترا ہوا

سخن طرازیاں کر کے زمیں کی تنگی پر
وہ کشتی بان جزیرے پہ سب کو لے گیا ہے

خمار ایسا ہے ہستی کے کچھ مسائل کا
شراب پینے سے تھوڑا نشہ اترتا ہے

اسی فلک میں ڈوب گیا ہے کیا کچھ ہم ملاحوں کا
جسے بلندی کہتے ہو تم وہ بھی تو گہرائی ہے

سب کی اپنی مجبوری ہے اسے برہنہ کون کہے
پہلے ہم کو بھی شک ہوتا تھا اپنی بینائی پر

پتھر ہیں نہ دیوار کی نعمت ہے میسر
آواز لگاؤں بھی تو واپس نہیں آتی

بقا کی جنگ میں اتنا تو ہم نے سیکھا ہے
کوئی چراغ تو کوئی دھواں بناتا ہے

جو گاڑی چھوٹ گئی ہے وہ جیسے آئی نہ ہو
ہمارے آگے رہے گا یہ وقت گزرا ہوا

جنھیں کسی کی محبت سے کچھ نہیں ملتا
وہ اپنے جیسا کوئی دوسرا تلاش کریں

سب اپنی اپنی کتھا لے کے چپ کھڑے ہیں یہاں
کسی کا شعر کسی کو سنا رہا ہے کوئی

سو دیکھنا ہے کہ کیسا نظارہ بنتا ہے
اگر زمین کا نقشہ دوبارہ بنتا ہے

دعا کو دیر سے سننے کی مصلحت سمجھو
خدا بھی سوچ سمجھ کے سہارا بنتا ہے

☆☆☆☆☆

غزل

[حبیب جالب کے لیے]

ابھی تاریخ ہیں ، تاریخ کا اظہار نہیں ہیں
نقشِ محفوظ ہیں ہم نقش بہ دیوار نہیں ہیں

اپنے پیَروں میں پڑے ہیں کہ عدّو کھوج نہ پائے
ہم تو زنجیر ہیں ، زنجیر کی جھنکار نہیں ہیں

وہ صدا ہیں کہ پروئی نہ گئی سلکِ دُعا میں
سایۂ اَبر ہیں ہم سایۂ دیوار نہیں ہیں

کیا کیا جائے کہ یہ شہر تو زنداں بھی نہیں ہے
کیا کہیں ، کیسی اسیری کہ گرفتار نہیں ہیں

آنکھ کی تہہ میں تموّج کی فضا جاگ چکی ہے
ہم جو چُپ ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ بیدار نہیں ہیں

سنگ و سر چھاؤں کے مانند برستے ہی رہیں گے
یوں تو شانوں پہ ہیں لیکن تہِ دستار نہیں ہیں

خالد احمد

غزل

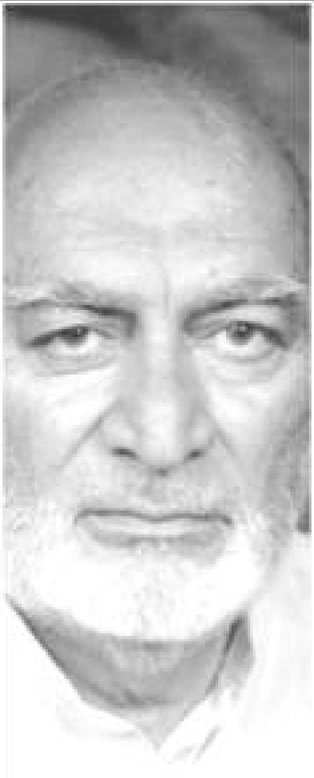

ہے اب آنکھوں کا تارا دوسرا کوئی نہیں
وہی جی ہے ہمارا دوسرا کوئی نہیں

سمجھتے ہیں تمھاری جنبشِ ابرو کو ہم
محبت کا اشارہ دوسرا کوئی نہیں

خدا کے سامنے کرتے ہیں ہر دم عاجزی
دعاؤں میں سہارا دوسرا کوئی نہیں

تمھاری یاد میں رہنا پڑے گا سربسر
جب اپنا پیارا پیارا دوسرا کوئی نہیں

ہوئے ناکام ہم تو ہو گئے ہیں سرخ رو
وفا کا کھیل ہارا دوسرا کوئی نہیں

غزل کی لاج رکھتا ہے ہمیشہ بے گماں
بیاض ایسا شمارہ دوسرا کوئی نہیں

کہاں جائیں گے ثاقب اپنی بستی چھوڑ کر
زمانے میں ''ہزارا'' دوسرا کوئی نہیں

آصف ثاقب

غزل

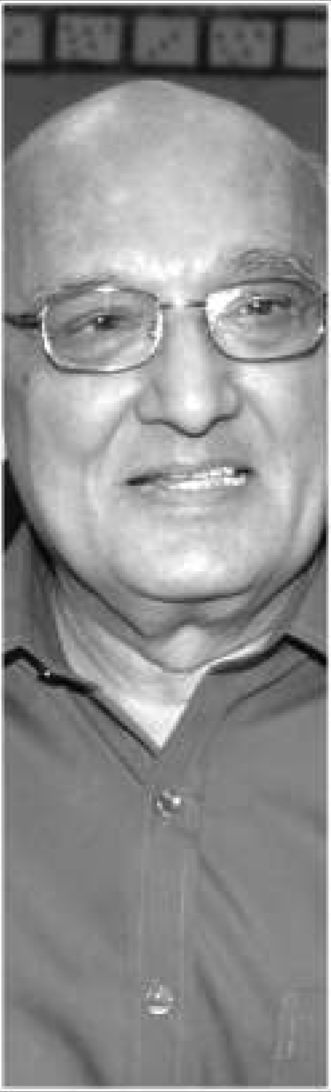

امجد اسلام امجد

درد کی رہگزر
اور تنہا سفر

جتنے تھے راہ زن
بن گئے راہبر

یک نفس اور بس
بات ہے مختصر

ڈھونڈنا تھا کسے؟
آ گئے ہیں کدھر!

زندگی کی سدا
موت ہے ہم سفر

وہ جو آگے گئے
کوئی اُن کی خبر؟

وہم در وہم تھا
جو تھا پیشِ نظر

صبح کے واسطے
جاگئے رات بھر

غزل

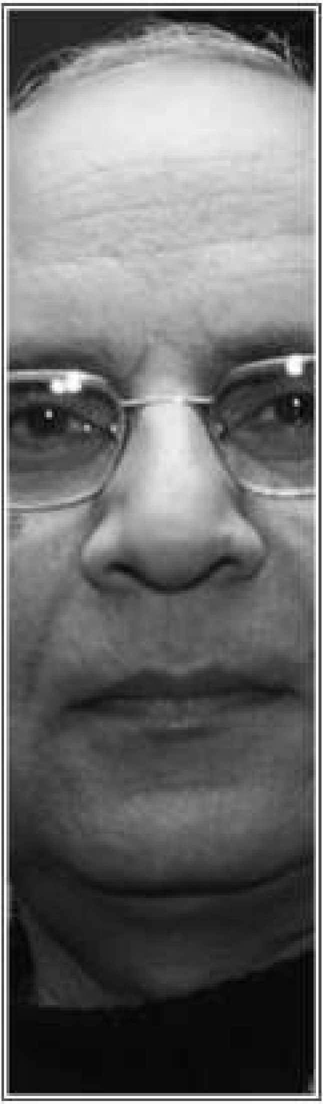

تمام عمر جو اک واردات جی جائے
بہشت اُس کی نگاہوں میں دیکھ لی جائے

سحر کے کھوکھلے نعروں کی آندھیوں سے ہے ڈر
نہ ہاتھ سے یہ دِیوں کی بھی روشنی جائے

رُکے اگر تو یہ جاں بھی نثار ہے، ورنہ
وہ جا رہا ہے تو جائے خوشی خوشی جائے

کوئی تو ضبطِ انا کی بھی آخری حد ہے
کہاں تک آدمی تحقیرِ ذات پی جائے

عجیب ڈر لیے آنکھوں میں عمر بیت گئی
نہ نیند آئے نہ تاریک رات ہی جائے

مفاہمت میں وہ آگے بہت نکل گیا ہے
اب اُس کے ساتھ کہاں تک بھلا کوئی جائے

کسی طرف کا کوئی ہوش کب رہا ہے مجھے
چلا چلوں اُسی جانب جدھر پری جائے

کدھر کدھر وہ روانی میں جا نکلتا ہے
جو اصل بات ہے عالی وہی رہی جائے

جلیل عالی

غزل

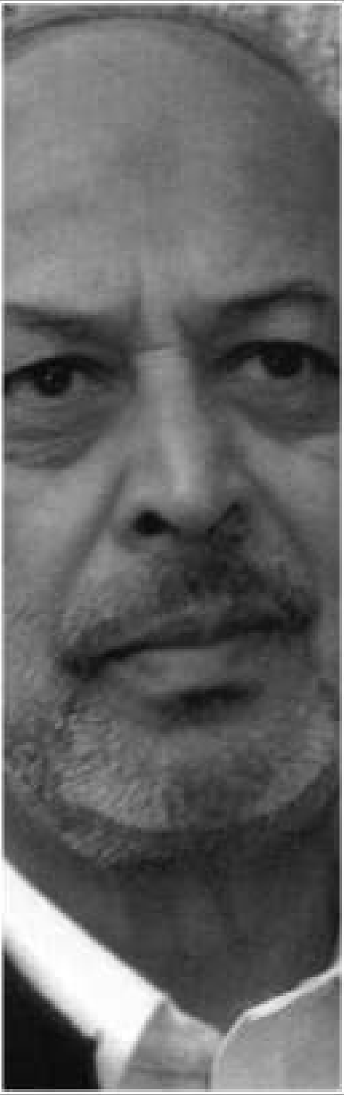

دل و نظر میں سمایا رہا جمال غزل
خیالِ یار کی صورت رہا خیالِ غزل

ہر ایک نکتے پہ دل جھوم جھوم جاتا ہے
یہی ہے حاصلِ تخلیق اور مآلِ غزل

نثار حسنِ تغزل پہ فکرِ انساں ہے
یہی غزل کا ہے ماضی یہی ہے حالِ غزل

یہی وہ صنفِ سخن ہے جسے عروج ملا
مرا یقین ہے ممکن نہیں زوالِ غزل

مشامِ جاں میں یہ جھونکا کہاں سے آیا ہے
کھلا کہ اور بھی صحرا میں ہیں غزالِ غزل

غزل میں بات ہو، لہجہ بھی منفرد ہو حسن
مری نظر میں ہر اک شعر ہے کمالِ غزل

حسن عسکری کاظمی

غزل

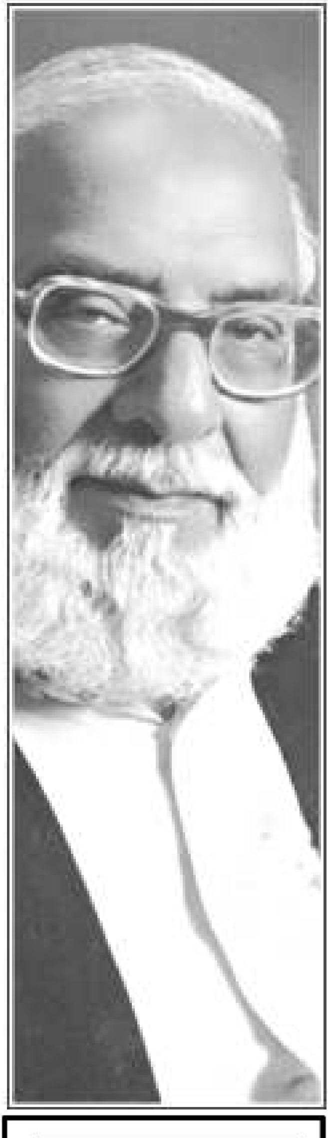

دِل نے سینچا ، خیال کو بھایا
ہے یہ عرضِ ہنر گراں مایا

سر پہ چھائیں گے پھر خُنک سائے
خُوش دِلی سے عبور ہو صحرا

نہیں ممکن دوام ظلمت کو
مات ہے اُس کی ضَوفشاں تارا

متن کی جو بھی رُوح میں اُترے
اَزبر ہو گا اُسے سبق سارا

جب نکھرتے ہیں سوچ کے تیور
مُکھ دکھاتا ہے پھر ادب پارا

دل میں محفوظ ہو گئیں یادیں
ساری دنیا کو میں کما لایا

ہے ریاضت ریاضؔ کا مسلک
غم کو سہنے کا اُس میں ہے یارا

سیّد ریاض حسین زیدی

غزل

ہم نے کچھ رنگ آسماں کے لئے
اپنے بے رنگ خاکداں کے لئے

جانے کیوں لوگ اب دُعاگو ہیں
آمدِ موسمِ خزاں کے لئے

ہم یہاں پر مکیں تو ہیں لیکن
ہیں کسی دوسرے جہاں کے لئے

وہ بھی ہم نے کسی کی نذر کیئے
جو ستارے تھے کہکشاں کے لئے

دلِ محدود میں سمیٹے ہیں
غم جو کافی تھے دو جہاں کے لئے

اب سنا ہے کہ ہو رہا ہے تلاش
اَور کوئی مکیں مکاں کے لئے

ہر یقیں اس لئے کیا ہے قبول
کُھل سکیں در نئے گماں کے لئے

شاید اس واسطے ہیں ہم زندہ
ہو کوئی یادِ رفتگاں کے لئے

آگ میں ہم نے خود ہی پھینک دیئے
وہ جو تنکے تھے آشیاں کے لئے

عمر بھر ہم نے صرف کر ڈالی
صرف اِک سعیٔ رائیگاں کے لئے

جانے ممنوع ہو گیا کیسے
ذکر اُس کا مری زباں کے لئے

عمر بھر دھوپ میں جلے ہیں بہت
سر پہ ہم ایک سائباں کے لئے

شعر ہم نے کہے ہیں خوب نسیمؔ
اپنے اِک یارِ مہرباں کے لئے

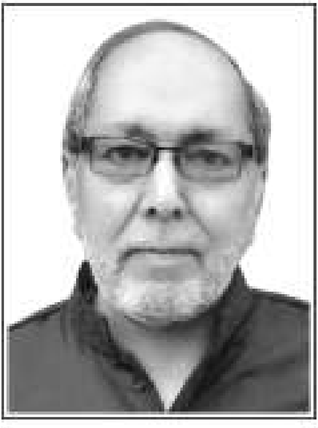

نسیمِ سحر

غزل

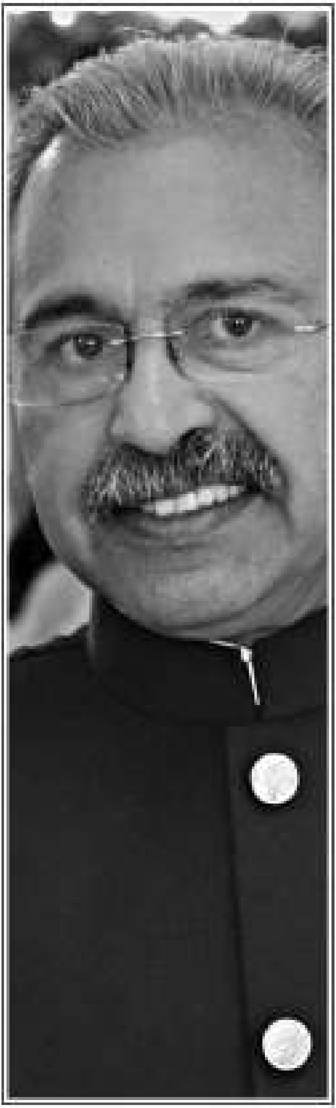

کوئی تو ان سے بچائے دہائی دیتا ہوں
میں کور چشموں کو شاید دکھائی دیتا ہوں

زیادہ دیر چھپایا نہ جا سکے گا مجھے
میں گر دکھائی نہ دوں تو سنائی دیتا ہوں

ہے یہ تمھارا ستارہ جو میرے ساتھ ہو تم
کسی کو کم ہی یہاں تک رسائی دیتا ہوں

پڑے گی رائے بدلنی کہ جب کھلیں گے کنول
تمھیں اگر ابھی کائی دکھائی دیتا ہوں

قفس میں ایسا بھی کیا ہے مجھے نہیں معلوم
کہ لوٹ آتے ہیں جن کو رہائی دیتا ہوں

کسی کے خالِ سرِ لب کی مہربانی ہے
میں اپنے لفظوں کو جو روشنائی دیتا ہوں

بھگت رہا ہوں محبت کی پیشیاں راحت
الجھتا جاتا ہوں جتنی صفائی دیتا ہوں

راحت سرحدی

غزل

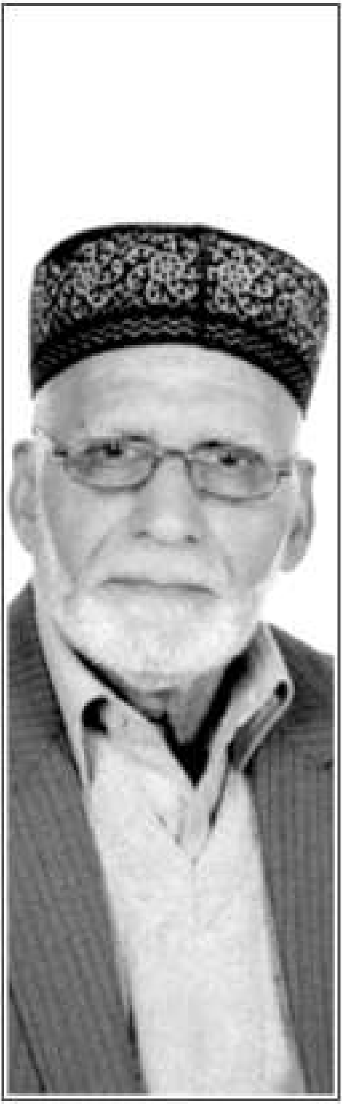

اہلِ جنوں جہان میں کیا کام کر چلے
سر کاٹ کر خرد کا بیاباں میں دھر چلے

جب بھی زباں کھلی ہے کبھی حق کی راہ میں
پھر کب رُکی ہے لاکھ ہی تیغ و تبر چلے

منزل پہ جا پہنچنے کا دِل کو یقیں ہوا
رستے میں چھوڑ کر مجھے جب راہبر چلے

اُس در پہ جان و دل کی حقیقت نہ پوچھیے
جادو جہاں نہ کوئی بجز سیم و زر چلے

سکہ جہاں رواں ہو فقط حرص و آز کا
کیسے وہاں پہ سکۂ اہلِ ہنر چلے

کیا بات ہے کہ دور تھی منزل کی روشنی
جب تک کہ میرے ساتھ مرے ہم سفر چلے

لو ہم نے سنگ وخشت کی جا شعر چن دیے
اِک یادگار پیار کی تعمیر کر چلے

اے آفریں! مقامِ تحیر ہے یہ جہاں
حیراں ہی آئے دہر میں حیراں گزر چلے

رشید آفرین

غزل

خوش جمالوں کی نے غزالوں کی
ہے یہ دُنیا مِرے خیالوں کی

زندگی ! جی رہے ہیں ہم لیکن
خیر ہو تم پہ مرنے والوں کی

ذہن ماؤف ہوتا جاتا ہے
بھیڑ ہے اِس قدر سوالوں کی

ہم وہ رفتہ کے لوگ ہیں جن پاس
روشنی ہے سفید بالوں کی

کاش ہم تک بھی کوئی پہنچائے
کچھ خبر ہم خراب حالوں کی

کاش ہم اُن کا تجزیہ کرتے
جو وجوہات ہیں زوالوں کی

کاش کانٹوں کی بات بھی سُنتے
صرف کہتے نہ اپنے چھالوں کی

ق

کیا عجب اُس کے پاس جا پہنچے
کوئی فریاد پائمالوں کی

ورنہ اِس زندگی کے صحرا میں
کیا حقیقت ہے ہم غزالوں کی

آنکھوں میں کوئی شے تھی یہاں کی نہ وہاں کی
اِک عکس پہ بنیاد رکھی دونوں جہاں کی

کھا جاتی ہے جس طاق میں بھی کوئی دِیا ہو
بستی میں اُتر آئی ہے یہ رات کہاں کی

آ جاتی ہے لکنت سی زباں میں دمِ تعریف
توصیف بیاں ہوتی نہیں ہم سے شہاں کی

ہر بار کمی سی کوئی لگتی ہے بیاں میں
تفسیر تو ہو پاتی نہیں دردِ نہاں کی

فرصت اُسے مِلتی نہیں شیریں سخنوں سے
خسرو کو پڑی کیا کہ سنے تلخ دہاں کی

خاور اعجاز

غزل

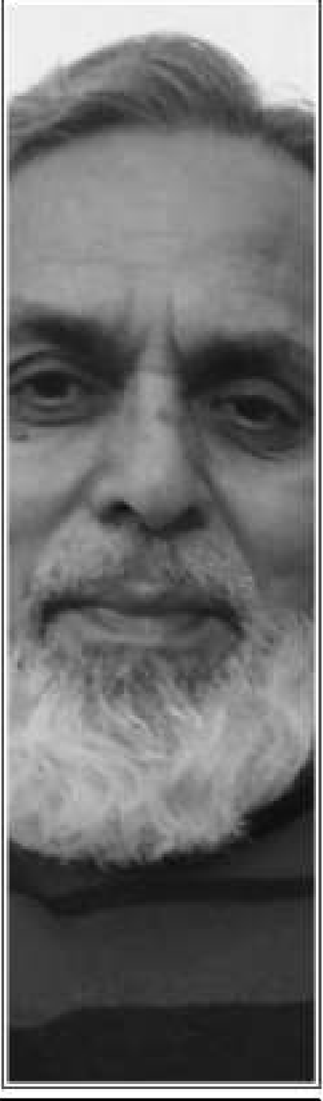

اگرچہ دشت کی آنکھ سارباں پر تھی
پہ ایک چشم رواں گردِ کارواں پر تھی

زمین ہٹتی چلی جا رہی تھی محور سے
مری نگاہ ابھی پہلے آسماں پر تھی

فقط ہوا نے سُنی تھی ہماری سرگوشی
ذرا سی دیر میں وہ بات ہر زباں پر تھی

وہاں میں اپنی صفائی میں بولتا کیسے
جہاں یقین کی بنیاد ہی گماں پر تھی

مرے بھی ہاتھ میں تھا میرا نامۂ اعمال
یہ کامیابی کسی اور امتحاں پر تھی

غروب ہوتی ہوئی زندگی کی آخری سانس
رُکی ہوئی کسی آوازِ رفتگاں پر تھی

تمھارے شہرِ ملامت گراں سے کیا گزرا
ہر اک گناہ کی تہمت انیسؔ جاں پر تھی

محمد انیس انصاری

غزل

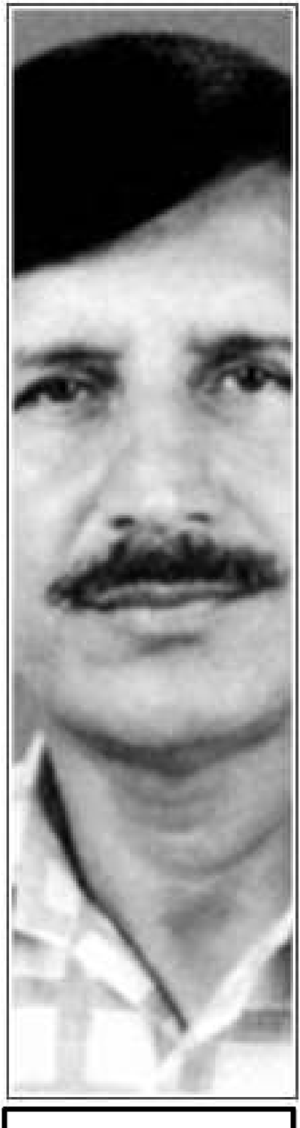

اتنی لاپروائی ایسی دوری جانی یاروں سے
تجھ کو تنہا کر ڈالے گی روگردانی یاروں سے

فرض ہے تجھ پر سنبھل کے چلنا پتھریلی ڈھلوانوں پر
ساتھ نبھانا سہل نہیں ہے کوہستانی یاروں سے

تجھ پر سب کچھ وار کے آخر کیا پایا خوش فہموں نے
تو نے مانگی ہے کس منہ سے پھر قربانی یاروں سے

جب تک یہ مہمان ہیں تیرے تجھ سے پیار جتائیں گے
بعد میں کچھ امید نہ رکھنا دسترخوانی یاروں سے

صف بندی کی صورت نکلی مات سے بچنے کی خاطر
ربط بڑھانے لگے ہوئے ہیں سب امکانی یاروں سے

پھولوں کا رس چوس کے بھنورے شاخوں سے اُڑ جاتے ہیں
باندھ نہیں سکتی نیچوں کو فیض رسانی یاروں سے

کبھی دریدہ ہو جاتا ہے اپنے زعم کا دامن بھی
بعض اوقات الٹ پڑتی ہے کھینچا تانی یاروں سے

موسم ہے افسانہ گری کا پراسرار فضاؤں میں
سنتے ہیں گلزار انوکھی روز کہانی یاروں سے

گلزار بخاری

غزل

یہ مت سمجھنا کہ دل سنبھالے پڑے ہوئے ہیں
میاں ہمیں زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہیں

وہیں پہ انسانیت کا کوئی سراغ ہو گا
جہاں پہ ٹوٹے ہوئے پیالے پڑے ہوئے ہیں

یہ خواب ہے ، یا تو واقعی اس ہجوم میں ہے
کہ جن کے سرخم ہیں، چہرے کالے پڑے ہوئے ہیں

دکھوں کو اپنے پلٹ کے دیکھو خوشی ملے گی
انہی اندھیروں کے گھر اجالے پڑے ہوئے ہیں

لکھا نہیں کچھ ، جلا نہیں کچھ ، چھوا نہیں کچھ
نہ جانے کیوں انگلیوں پہ چھاپے پڑے ہوئے ہیں

ہمارے حق میں کوئی نہیں بات کرنے والا
لبوں پہ مہریں ، ہوا پہ تالے پڑے ہوئے ہیں

یہ لوگ کیا ہیں ، نہ گھر پتہ ہے ، نہ تیرا رستہ
اور اپنے ہاتھوں پہ دل نکالے پڑے ہوئے ہیں

ہر ایک تصویر تیری تصویر لگ رہی ہے
نظر نظر میں ترے حوالے پڑے ہوئے ہیں

تبھی نہیں اسکی محفل میں اک شاہنواز زیدی
بڑے بڑے شعر کہنے والے پڑے ہوئے ہیں

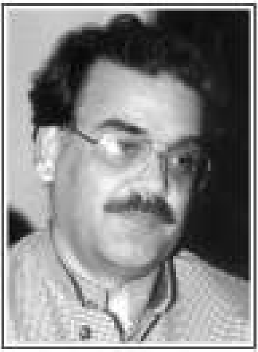

شاہنواز زیدی

غزل

کوئی سنگت تلاش کرتے ہیں
ہم طبیعت تلاش کرتے ہیں

مختلف سوچ رکھنے والوں میں
کوئی وحدت تلاش کرتے ہیں

حکمرانی کا جن کو لپکا ہو
وہ رعیت تلاش کرتے ہیں

جنگ کرتے ہیں دوسروں سے اور
خود محبت تلاش کرتے ہیں

مذہب و نسل و جنس کی جا ، ہم
آدمیت تلاش کرتے ہیں

لبِ گویا میں ثاقب اکثر لوگ
کوئی لکنت تلاش کرتے ہیں

منظور ثاقب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چند رفیق مطمئن ، چند حریف دنگ بھی
ایک فریبِ صلح بھی ، ایک فریب جنگ بھی

غزل

راستے جب سے کیے اس نے حوالے میرے
تب سے جاتے ہی نہیں پیروں سے چھالے میرے

شہر واپس بھی کیا اس نے تو چالاکی سے
تخت پر نصب کیے مارنے والے میرے

دیکھتا کچھ ہوں نظر آتا ہے کچھ ہے کچھ اور
ہائے یہ آنکھیں مری ہائے اجالے میرے

ایسی تضحیک تصور میں نہیں تھی میرے
جس طرح آپ نے ہیں درد اچھالے میرے

دیکھتے جاتے تھے مڑ مڑ کے مری آنکھوں میں
میرے ہی سینے میں گڑتے ہوئے بھالے میرے

ورنہ کیا کیا نہ کیا اپنوں نے مجھ قبر کے ساتھ
بیچنے والوں نے حالات سنبھالے میرے

مر چکا ہوں تو بس اب ایک ہی خواہش ہے مری
کوئی تو بکھرے ہوئے زخم اُٹھالے میرے

کتنا شاطر ہے مجھے پالنے والا فرحت
گنتا رہتا ہے صبح و شام نوالے میرے

فرحت عباس شاہ

غزلیں

مسافتیں طویل ہو کے رہ گئیں
طبیعتیں علیل ہو کے رہ گئیں

وفورِ حرص و آز تیرے قہر سے
قناعتیں قلیل ہو کے رہ گئیں

شکستِ فاش ہو گئی اصول کو
ضرورتیں دلیل ہو کے رہ گئیں

عجیب وقت آ پڑا ہے عدل پر
کدورتیں وکیل ہو کے رہ گئیں

لگے ہیں کان صورِ اسرافیل پر
سماعتیں ثقیل ہو گئے رہ گئیں

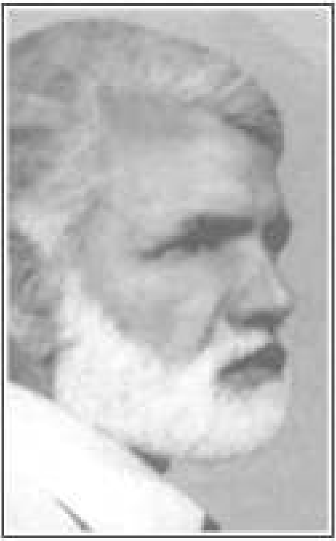

یعقوب پرواز

کس کو چلتا کروں
کس کا پیچھا کروں

آنکھ ویران ہے
اس کو دریا کروں

چشمِ بینا نہیں
آئینہ کیا کروں

بات کوئی تو ہو
جس کا چرچا کروں

عقل آ جائے گی
عشق پیدا کروں

اپنی آواز کو
تھوڑا اونچا کروں

برگدوں کی طرح
تجھ پہ سایا کروں

میں بُرا ہی سہی
کچھ تو اچھا کروں

غزل

وہ بچپن وہ پہلا باب کہانی کا
بہہ نکلا پھر آنکھ سے چشمہ پانی کا

جس کو اپنے آپ کا بھی معلوم نہیں
پتہ ٹھکانہ کیا ہے اس سیلانی کا

اس مندر میں کب سے ایک ہی مورت ہے
دل پر قبضہ ہے تصویر پرانی کا

کس نے آخر کار فریضہ سونپا ہے
ایک چراغ کو سورج کی نگرانی کا

یادوں میں خوشبو وہ سوندھے پوچے کی
آنگن میں اک پودا رات کی رانی کا

سناٹوں کی رونق وہ دروازوں پر
اندر باہر رقص وہی ویرانی کا

دائیں بائیں پوچھے کون فرشتوں سے
مقصد کیا اس ساری کھینچا تانی کا

کل کی بات ہے پنچھی اور پردیسی میں
ایک تعلق تھا پیغام رسانی کا

یاد آیا تو سب آنکھوں میں گھوم گیا
دھیرے دھیرے منظر نقل مکانی کا

دل مصروف ہے آخری سطریں لکھنے میں
ہونے کو ہے بالکل انت کہانی کا

یوں آتا ہے جیسے چاند جھروکے سے
وہ ماضی وہ دھندلا عکس جوانی کا

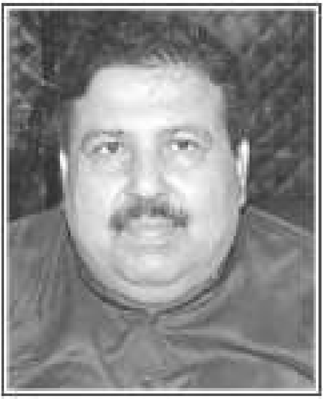

مسعود احمد

غزل

یہ بات کیا ہے کہ دل کو ذرا لگاتے ہیں
لگانا ہو تو پھر اچھی طرح لگاتے ہیں

دبا کے رکھا ہے گہری گھٹن میں تو نے اسے
ادھر تو آ، ترے دل کو ہوا لگاتے ہیں

وہ بات کرتے تھے میری وفا پرستی کی
مجھے لگا کہ وہ الزام سا لگاتے ہیں

عجیب ڈھنگ نکالا ہمارے یاروں نے
بتاتے کچھ نہیں، دل میں گرہ لگاتے ہیں

سنا ہے تیرا بھی دنیا میں جی نہیں لگتا
شرابِ ناب ادھر لے کے آ، لگاتے ہیں

سوال نامہ محبت کا ہم نے سہل کیا
سوال دو ہیں اور ان میں بھی ''یا'' لگاتے ہیں

ہمارے شعر اداسی کی چیخ بن کے اٹھے
جہاں بھی دل نہیں لگتا، صدا لگاتے ہیں

جو قیدِ خانہء دنیا میں جی نہیں لگتا
نقب فلک کی فصیلوں میں جا لگاتے ہیں

ہمارے جیسے یہاں خال خال ہیں نیر
جو عکسِ یار کو دل کی جگہ لگاتے ہیں

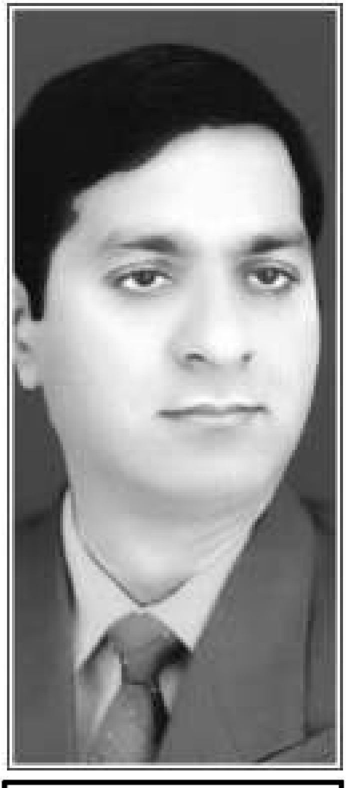

شہزاد نیرّ

غزلیں

آنکھوں میں آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں رہا
دِل میں اداسیوں کے سوا کچھ نہیں رہا

وابستہ ایک شخص سے تھیں گھر کی رونقیں
اب گھر میں وحشتوں کے سوا کچھ نہیں رہا

جو کچھ تھا لٹ چکا ہے محبت کی راہ میں
قسمت میں حسرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا

تم ڈھونڈنے چلے ہو محبت کی بستیاں
دنیا میں نفرتوں کے سوا کچھ نہیں رہا

اقبال اب خوشی کی تمنا کروں تو کیا
جب غم کے راستوں کے سوا کچھ نہیں رہا

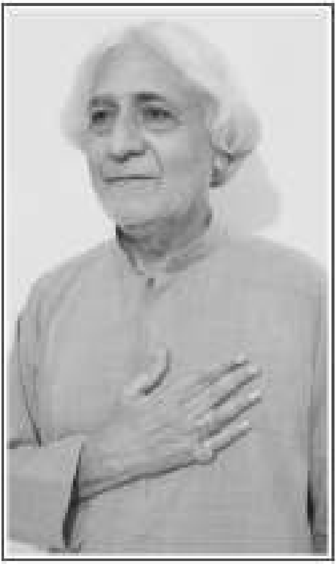

اقبال سروبہ

کسی کی یاد میں جلتا ہوا شجر تنہا
کھڑا ہوا ہے کڑی دھوپ میں مگر تنہا

مکین زلزلہ سن کر مکان چھوڑ گئے
پڑا ہوا ہوں ابھی تک میں اپنے گھر تنہا

عجیب بات ہے منزل بھی ایک ہے لیکن
میں اس کے، ساتھ بھی ہوں اور ہمسفر تنہا

نجانے کون سی خواہش میں گھر سے نکلا تھا
پھرا ہوں قریہ بہ قریہ، نگر نگر تنہا

اگرچہ سامنے فنکار تھے بہت سے مگر
ہوا ہے شہر میں اقبال معتبر تنہا

غزل

دنیا بولے ایسا سچائی سے جھوٹ
کون پکڑ سکتا ہے گہرائی سے جھوٹ

سچی بات کہی ہے دھیمے لہجے میں
عالم سمجھا اس کو ، دانائی سے جھوٹ

میں بیزار ہوں یا خوش رہتا ہوں اس میں
سچ بولوں یا بولوں تنہائی سے جھوٹ؟

عشق نے مجھ کو ہر پل ہے تعلیم کیا
بولوں کیسے دل کی دارائی سے جھوٹ

سچ سمجھے گی اس کو ، دنیا کی فطرت
بولے جو بھی حسنِ زیبائی سے جھوٹ

چہرے نے بھی اس کا پورا ساتھ دیا
آنکھ نے بولا پوری بینائی سے جھوٹ

ایسے لوگ بھی بستے ہیں اس دنیا میں
ایک پہاڑ بنا دیں جو رائی سے جھوٹ

سچ کو جھوٹا ثابت کرنا ہے آسان
بول رہے ہیں سارے دانائی سے جھوٹ

داد پہ داد ملے جب اسے انیس احمد
پھلتا پھولتا رہے پذیرائی سے جھوٹ

ذات میں پھیلی سیلن چپ انیس احمد
ٹھہرا پانی کیا بولے کائی سے جھوٹ

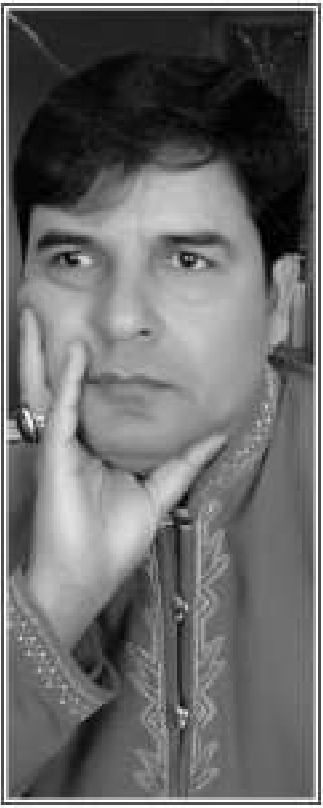

انیس احمد

غزل

دھند باقی ہے خواب باقی ہے
راستوں کا سراب باقی ہے

ڈھل گیا وقت کا حسیں سورج
حُسن کی آب و تاب باقی ہے

اُٹھ گئے درمیاں سے دیوانے
واعظوں کا خطاب باقی ہے

لکھی ہے ہم نے زندگی کی کتاب
بس محبت کا باب باقی ہے

آج تک یاد کی ہتھیلی پر
رنگ ، خوشبو ، گلاب باقی ہے

شبہ طراز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جانے کِس رَو نے بجھا ڈالی ہیں
جانے کس دُھن میں تھیں ساری آنکھیں

غزل

کب ہے آساں محبتیں کرنا
چھوڑ دیں یہ حکایتیں کرنا

کیا ضروری ہے اِس تعلق میں
پیش ہر پل وضاحتیں کرنا

یہ تو الفت کی خوبصورتی ہے
شکوے کرنا ، شکایتیں کرنا

کتنا آسان تھا محبت میں
اک صدی کو بھی ساعتیں کرنا

خاک اڑاتے تھے ان کی گلیوں کی
اب کہاں وہ حماقتیں کرنا

شرطِ اول ہے دوست داری میں
ساتھ دینا ، حمایتیں کرنا

میرا مسلک ہے اُس خدا کے لیے
سر جھکانا ، عبادتیں کرنا

زندگی ہے مری نظر میں فقط
درد سہنا ، ریاضتیں کرنا

دلِ ناداں نے اب بھی چھوڑا نہیں
رائیگاں سی یہ چاہتیں کرنا

بچپنے میں بہت ضروری ہے
چھوٹی چھوٹی شرارتیں کرنا

خالدہ انور

غزلیں

شوکت محمود شوکت

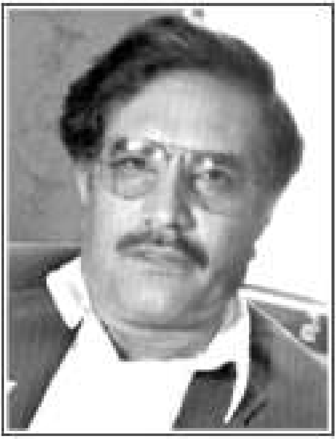

محبت کا شجر بھی بے ثمر تھا
یہی دکھ تھا کہ جو دردِ جگر تھا

اسے گوشہ نشینی راس ہے اب
کسی کے عشق میں جو دربدر تھا

مری جیبوں میں سکّے بولتے تھے
مری باتوں میں ورنہ کب اثر تھا

نقیبِ منزلِ نو ، منزلیں تھیں
سفر کے خاتمے پر ، پھر سفر تھا

میسر ہجر میں تھا وصل کا لطف
کسی کی یاد سے یوں بہرہ ور تھا

ہوا معلوم شوکت دل گنوا کر
کہ یہ پتھر ، اساسِ بحر و بر تھا

فضائے کوچۂ دل ماتمی تھی
مکینِ دل ، کہ دل سے باخبر تھا

زمستانی ہوا ہے اور میں ہوں
دسمبر جا رہا ہے اور میں ہوں

لبوں پر اک دعا ہے اور میں ہوں
خدا کا آسرا ہے اور میں ہوں

نظر آتا نہیں کچھ بھی دھوئیں میں
مکدر سب فضا ہے اور میں ہوں

محبت گم ہوئی ہے نفرتوں میں
عجب ماحول سا ہے اور میں ہوں

کسی کی یاد کا دل میں ابھی تک
کوئی جلتا دیا ہے اور میں ہوں

جہانِ آب و گِل سارے کا سارا
مشینوں میں گھرا اور میں ہوں

مہک بکھری ہے چاروں اور شوکت
بہارِ جاں فزا ہے اور میں ہوں

غزل

اب کہاں وقت کی رفتار سنبھالی جائے
یہی ممکن ہے کہ دستار سنبھالی جائے

آج اجلاس میں یہ اہلِ چمن طے کر لیں
پھول مرجھائے تو مہکار سنبھالی جائے

سہل مت جانیے ہو جائے نہ پھر رزقِ ہوا
درد کی بات ہے سرکار سنبھالی جائے

نئی آنکھوں میں نئے خواب بسانے کے لیے
رونقِ گلبن و گلزار سنبھالی جائے

کر لیا سودا تو اے اہل گلستاں کیونکر
لاش احساس کی بیکار سنبھالی جائے

یعنی لمحات خزاں پتے ہیں اڑ جائیں گے
ساعتِ وصل شبِ زار سنبھالی جائے

اب کہ وہ رشکِ چمن بہرِ وفا آئے گا
فصلِ گل دوستو اس بار سنبھالی جائے

گر گئے کتنے ہی شہتیر کڑے سالوں کے
کیسے اب جسم کی دیوار سنبھالی جائے

یہ بھی ممکن ہے رضا اس کا بھی کل کال پڑے
غم کی دولت مرے غم خوار سنبھالی جائے

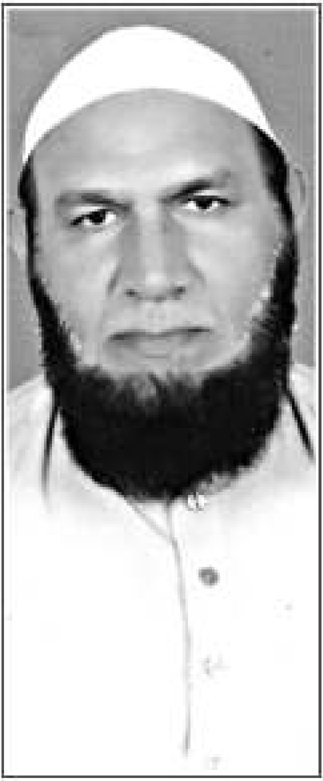

رضا اللہ حیدر

غزل

ترے چہرے کی تابانی نہ جائے
ہماری شکل پہچانی نہ جائے

تجھے جب سے پریشاں حال دیکھا
مرے دل سے پریشانی نہ جائے

دلِ ویراں یہ سب سازش ہے تیری
ہمارے گھر سے ویرانی نہ جائے

زمانوں کی مسافت پر ہے کربل
مگر یہ مرثیہ خوانی نہ جائے

فراتِ اشک پورے جوش پر ہے
کسی صورت بھی یہ پانی نہ جائے

وہ سیلِ آب کب کا تھم چکا ہے
مگر آنکھوں سے طغیانی نہ جائے

مداوا ہو چکا درد و الم کا
مگر یہ اشک افشانی نہ جائے

اگرچہ لاکھ ڈھانپا تن بدن کو
مگر من کی یہ عریانی نہ جائے

بھرے شہروں میں اُٹھ کر آ گئے ہیں
مگر غولِ بیابانی نہ جائے

میں ایسے جھمگٹے میں رہ رہا ہوں
جہاں میری کوئی مانی نہ جائے

مثالِ صورتِ دیوار اصغر
مری آنکھوں سے حیرانی نہ جائے

اصغر علی بلوچ

غزل

وہ جن کے واسطے قائم کیا جہانوں کو
چراغ رکھتے ہیں روشن، ان آستانوں کو

یہاں پہ دوست ہیں سارے کوئی حریف نہیں
یہ کن پہ تان کے رکھتے ہو تم کمانوں کو

جنہیں اجاڑا گیا ظلم و بربریت سے
کریں گے کس طرح آباد ان مکانوں کو

یہ شہرِ کذب ہے سب جھوٹ سننا چاہتے ہیں
یہ کاٹ ڈالیں گے سچ بولتی زبانوں کو

بدل گئے ہیں یہ موسم، بدل گئے ہیں لوگ
نئی طرح ذرا ترتیب دے زمانوں کو

ترا ہی ساتھ میسر رہے اگر ہر دم
تو کون روک سکے گا مری اڑانوں کو

وہ جن کے ہاتھ میں پرچم ہے حق پرستی کا
مرا سلام ہے ملت کے ان جوانوں کو

سید فرخ رضا ترمذی

غزلیں

آواز دے کے قریۂ جاں سے الگ نہ ہو
گُل رنگ چاہتوں کے جہاں سے الگ نہ ہو

سورج کے زیرِ سایہ بقا کی اُمید ہے
بجھتے ہوئے چراغ یہاں سے الگ نہ ہو

اک عمر اس فریب میں رہ کر گزار دی
کِس نے کہا تھا، کارِ جہاں سے الگ نہ ہو

اس میں بسی ہوئی ہے بزرگوں کی بھی مہک
تُو ہے مکین اس کا مکاں سے الگ نہ ہو

موقع ہے بچ نکلنے کا دشمن کے واسطے
جب تک یہ تیر میری کماں سے الگ نہ ہو

مُرجھا نہ جائے پیڑ کی صورت کہیں نوید
تشنہ لبی میں آبِ رواں سے الگ نہ ہو

جس میں چھپی ہوئی ہوں کئی تلخیاں نوید
ایسا کوئی بھی حرف زباں سے الگ نہ ہو

محمد نوید مرزا

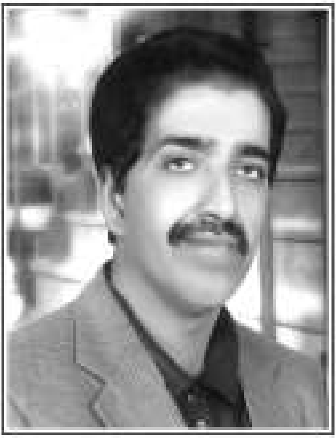

سفر حیات کا اس کی رضا کا حصہ ہے
اسی لیے تو فنا بھی بقا کا حصہ ہے

ہمیں خبر ہی نہیں وقت کے گزرنے کی
یہ ابتدائے سفر انتہا کا حصہ ہے

اسی لیے تو یہ وسعت میں کم نہیں ہوتی
یہ کائنات جمالِ خدا کا حصہ ہے

قدم اُٹھائیں تو ہم لڑکھڑانے لگتے ہیں
یہ خاکداں بھی شاید خلا کا حصہ ہے

ذرا سی بھول پہ جنت گنوا کے بیٹھے ہیں
یہ زندگی بھی ہماری سزا کا حصہ ہے

حسینیت کے مقابل یزید آج بھی ہیں
کہیں کہیں سے زمیں کربلا کا حصہ ہے

بدل رہا ہوں مزاج اپنا میں رُتوں کی طرح
مرے لیے یہ گھٹن بھی ہوا کا حصہ ہے

غزلیں

اوصاف شیخ

خوف ایسا ہے گھر نہیں سوتا
نیند آتی ہے پر نہیں سوتا

یہ تو اب ہجر ہے نا یہ بھی سہی
یوں بھی میں رات بھر نہیں سوتا

سو بھی جاؤں اگر سمٹ کر میں
میرے اطراف ڈر نہیں سوتا

چھوڑ دے میرے خواب میں آنا
ارے پاگل میں گھر نہیں سوتا

یوں بھی ہوتا ہے زندگی میں کبھی
رستہ سوئے ، سفر نہیں سوتا

شہر کرتا ہے سائیں سائیں تو کیا
جانتا ہوں وہ در نہیں سوتا

جس کو ہو روگ جاگتا ہے دل
جو ہو شوریدہ سر نہیں سوتا

اک پرندہ بھٹک گیا اوصاف
اک شجر رات بھر نہیں سوتا

نیند کو روگ سا لگا ہوا ہے
خواب دہلیز پر کھڑا ہوا ہے

مجھ کو جینا ہے تیرے بعد بھی سو
میں نے اک دائرہ چنا ہوا ہے

ہم سے چنوائی جو گئی ہے ہمیں
اسی دیوار میں چنا ہوا ہے

چلتے سکے کا ایک رخ ہے تو
اک مری جیب میں پڑا ہوا ہے

اس کا دریا کے پار کوئی نہیں
بس ترے واسطے گھڑا ہوا ہے

غزل

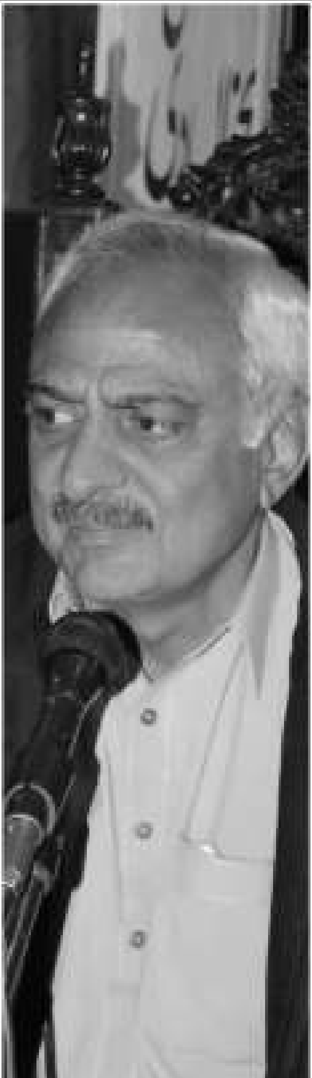

یہ سچ ہے کہ پھر تجھ کو پکارا بھی نہیں ہے
ہاں طوق ترے غم کا اتارا بھی نہیں ہے

جو شب کے مسافر ہیں اسی سوچ میں گم ہیں
جگنو بھی نہیں کوئی ستارا بھی نہیں ہے

دشمن تو کبھی پُشت سے حملہ نہیں کرتا
یہ وار مگر یار تمہارا بھی نہیں ہے

اُس سمت چلے جاتے ہیں عُشاق تمہارے
جس سمت کیا تم نے اشارا بھی نہیں ہے

کمبخت جدائی بھی گوارا نہیں کرتا
اور دل کا مرے ساتھ گزارا بھی نہیں ہے

یہ رزقِ سخن مجھ پہ اتر آتا ہے ورنہ
یہ رزق کمانے کا تو یارا بھی نہیں ہے

جو عشق سمندر ہے بہت گہرا ہے شاہد
اور اس پہ ستم اس کا کنارا بھی نہیں ہے

افتخار شاہد

غزل

رخشندہ نوید

مری طرف سے کسی روز مل تو آنا اسے
مجھے تو دیکھے ہوئے ہو گیا زمانہ اسے

وہ زندگی سے کبھی لطف بھی اٹھا نہ سکا
پڑا ہے مہنگا بہت رات دن کمانا اسے

وہ بے وفاؤں کا سردار کب یقیں کرے گا
اس آئینے کے کبھی روبرو تو لانا اسے

تمام عمر کے بعد آخرش سکھا دیا ہے
کھلنڈرے کسی بچے نے مسکرانا اسے

بلندیوں پہ ہوئی جا کے پاش پاش آواز
زمین گھومی مگر کب ملا ٹھکانہ اسے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک شجر کے کوئی دو پتے بھی اک جیسے نہ تھے
میری دنیا میں کسی شے کا کوئی ثانی نہیں

غزل

انتہا ہونے سے پہلے سوچ لے
بے وفا ہونے سے پہلے سوچ لے

بندگی مجھ کو تو راس آ جائے گی
تُو خدا ہونے سے پہلے سوچ لے

کاسۂ ہمت نہ خالی ہو کبھی
تُو گدا ہونے سے پہلے پہلے سوچ لے

یہ محبت عمر بھر کا روگ ہے
مبتلا ہونے سے پہلے سوچ لے

بچ رہے کچھ تیرے میرے درمیاں
فاصلہ ہونے سے پہلے سوچ لے

زندگی اک ساز ہے لیکن کنول
بے صدا ہونے سے پہلے سوچ لے

آسناتھ کنول

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس شان سے اُٹھے تھے بگولے جہت جہت
کیوں ٹوٹتے ہی سحرِ ہَوا، خاک ہو گئے

غزلیں

خود ساختہ جنت سے نکالے مجھے کوئی
خوش رنگیٔ غفلت سے نکالے مجھے کوئی

شہکار سا ہوں راہ کے پتھر میں مقیّد
جب چاہے نفاست سے نکالے مجھے کوئی

یاروں کی قطاروں نے کیے راستے مسدود
صد کامِ رفاقت سے نکالے مجھے کوئی

میں بامِ فلک سے نہیں نظروں سے گرا ہوں
کیا قعرِ مذلت سے نکالے مجھے کوئی

ڈستی ہے شب و روز کسی خوف کی ناگن
بے نام اذیت سے نکالے مجھے کوئی

مُند کر بھی شہاب آنکھوں نے رونا نہیں چھوڑا
جل تھل ہوئی تربت سے نکالے مجھے کوئی

جز خار و خس و خاک میسر نہیں کچھ بھی
اس قریۂ وحشت سے نکالے مجھے کوئی

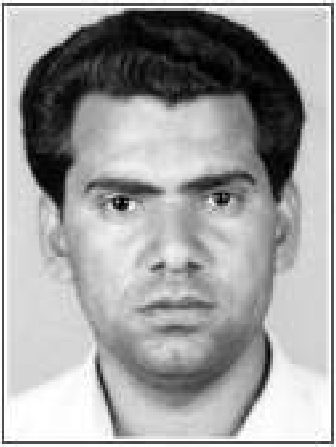

شہاب صفدر

چارۂ درد ___ کیا رہ گیا
صرف حرفِ دعا رہ گیا

اڑ گیا وہ افق سے پرے
اس کے پیچھے خلا رہ گیا

کر گئے کوچ قیدی مگر
شورِ زنجیرِ پا رہ گیا

آخری ہے صدائے جرس
جو یہاں رہ گیا، رہ گیا

اور سب کچھ ہوا نذرِ آب
ایک نامِ خدا رہ گیا

پاسدارِ انا موت تک
زندگی سے خفا رہ گیا

میں تھا حیرت سے پتھر شہاب
آئنہ دیکھتا رہ گیا

غزل

نام دے رکھا ہے لوگوں نے جسے تدبیر کا
درحقیقت وہ بھی ہے اک زاویہ تقدیر کا

بن ادب کے، علم سارا، ورثۂ ابلیس ہے
ایک پہلو یہ بھی ہے قرآن کی تفسیر کا

عالمِ فانی کو سمجھے بیٹھے ہیں گنجِ دوام
دیکھتے ہیں خواب ہی میں جلوہ ہم تعبیر کا

آئنے کا عکس بن کے رہ گیا اصل الاصول
یُوں تصوّر پر گماں ہونے لگا تصویر کا

وُہ قیامت ڈھا رہا ہے حشر سے بھی پیش تر
اب خُدا حافظ ہے اے دِل! اُس بُتِ بے پیر کا

لفظ کاغذ پر اداکاری کریں افسوس ہے
کام ہم تحریر سے لینے لگے تقریر کا

میں ''ہُو الظّاہر'' کا اک مظہر ہوں اے فتویٰ گرو!
کس لئے مجھ کو سرو سودا نہ ہو تشہیر کا

ابرِ رحمت چھا گیا، بخشش کی بارش ہوگئی
مٹ گیا نام و نشاں سب دفترِ تقصیر کا

جوہرِ ذاتی ہمیشہ معتبر ہے ہر کہیں
اس میں کُچھ چکّر نہیں تقدیم اور تاخیر کا

آگ اور بارُود ہیں فردوس درآغوش، یا
حُسن گہنایا ہُوا ہے جنّتِ کشمیر کا

میں تو ہُوں فیضاؔن کیا، اقباؔل جیسے دَم بھریں
حضرتِ غالبؔ کی شعری عظمت و توقیر کا

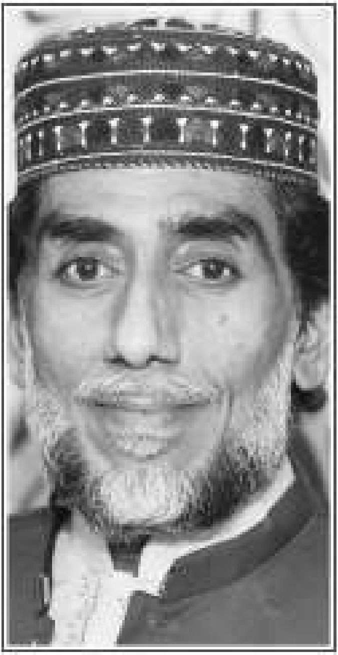

فیض رسول فیضان

غزل

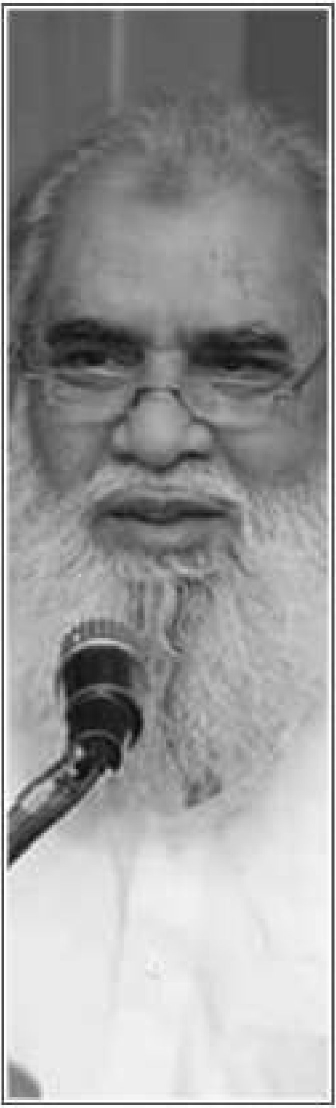

رہے گا دیکھیئے کب تک ستارہ گردش میں
کہ اک زمانہ ہے ہم نے گزارا گردش میں

مجھے سکون کی دولت سے وہ نوازتا ہے
کہ میں نے جب کبھی اس کو پکارا گردش میں

مجال ہے جو کوئی بھی کسی سے ٹکرائے
نظام ہستی اگرچہ ہے سارا گردش میں

بھنور تو ہوتے ہی گردش میں ہیں، میں حیراں ہوں
کہ کیسے آ گیا ہے اب کنارہ گردش میں

اگر چہ اس کی اشاعت کو ساٹھ سال ہوئے
مگر ہے آج بھی جیون شمارہ گردش میں

مرے خدا مرے مزدور پر کرم کی نظر
کہ آج بھی ہے یہ قسمت کا مارا گردش میں

ہمیں نکالے گا کیا گردشوں سے یہ اکرم
نظام عدل ہے خود ہی ہمارا گردش میں

اکرم ناصر

غزل

اس لیے تو ہم بڑے ہوتے نہیں
اپنے قدموں پر کھڑے ہوتے نہیں

کچھ نگینے ہوتے ہیں پاپوش پر
سب انگوٹھی میں جڑے ہوتے نہیں

پھر بھی دل میں چلتی ہیں کچھ رنجشیں
دوست آپس میں لڑے ہوتے نہیں

فرق مٹ جائے جہاں طبقات کا
شہر میں ایسے تھڑے ہوتے نہیں

اب محبت میں گھڑی کا دور ہے
اب محبت میں گھڑے ہوتے نہیں

ہاتھ تیرے آئے ہیں تو قدر کر
ہم تو رستے میں پڑے ہوتے نہیں

ہوں اگر ماں کی دعائیں افتخار
وقت مشکل بھی کڑے ہوتے نہیں

افتخار شوکت

غزل

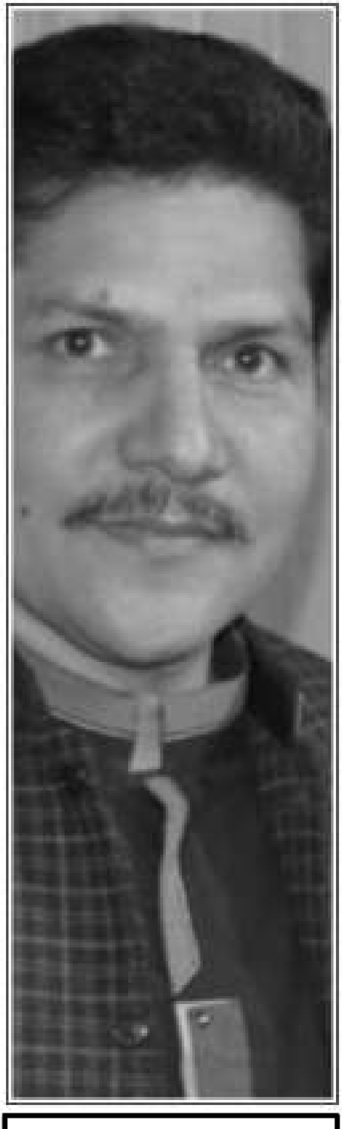

اس نے پوچھا کہ محبت میں زیاں ہوتا ہے
میں نے ہنس ہنس کے کہا، یار کہاں ہوتا ہے

تم جسے اشک سمجھتے ہو حقیقت میں کہوں؟
وہ تو جلتے ہوئے خوابوں کا دھواں ہوتا ہے

دکھ کبھی چیر کے دل کو نہیں ناپا جاتا
کرب چہرے کے مساموں سے عیاں ہوتا ہے

اس محبت نے عجب حال کیا ہے اب تو
وہ کہ ہوتا ہی نہیں جس کا گماں ہوتا ہے

لاکھ چاہو بھی بھلانا تو نہ بھولا جائے
جو کہ رگ رگ میں لہو بن کے رواں ہوتا ہے

یار اس طرزِ تخاطب پہ کبھی غور تو کر
تلخ لہجے میں کہا لفظ گراں ہوتا ہے

بے سبب تو نہیں اس دل کا مچلنا ارشد
عشق برسات کے موسم میں جواں ہوتا ہے

ارشد محمود ارشد

غزل

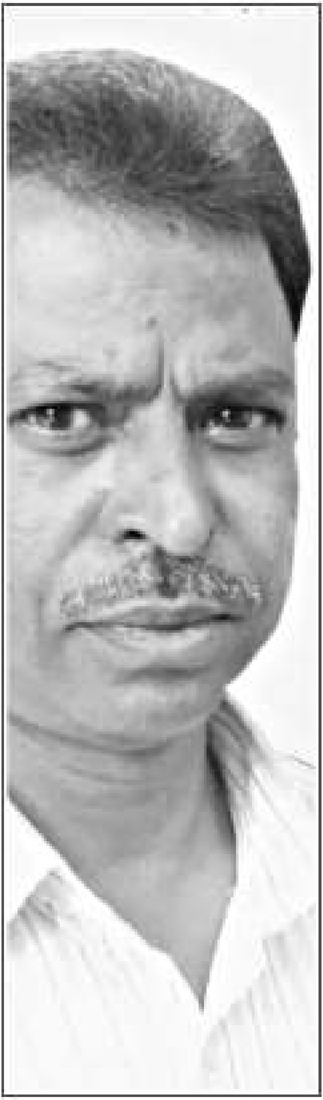

غمِ فراق میں للہ مبتلا نہ کریں
ہمارے واسطے تجویز یہ سزا نہ کریں

گریں گے اشک جو پتھر پہ بے اثر ہونگے
جو سنگ دل ہو کبھی اس سے التجا نہ کریں

تڑپ رہا ہوں میں دیدارِ یار کی خاطر
بس اس کو لا کے دکھا دیں مری دوا نہ کریں

ہے خوف مجھ میں تکبر کہیں نہ آ جائے
میں خاک ہی ہوں بھلا مجھ کو کیمیا نہ کریں

میں مانتا ہوں کہ دشوار ہو گیا جینا
یہ وقت بدلے گا دل آپ غمزدہ نہ کریں

خدا نے اس کو بنایا ہے بے پناہ حسیں
تو کیا کریں اگر اس پہ یہ دل فدا نہ کریں

کچھ ایسے راز ہیں جن کو چھپانا بہتر ہے
ہر ایک بھید زمانے پہ آئنہ نہ کریں

ذرا سی دیر میں ہی جاں نکلنے لگتی ہے
حضور آپ کہ مجھ سے خفا ہوا نہ کریں

ذکی طارق

غزل

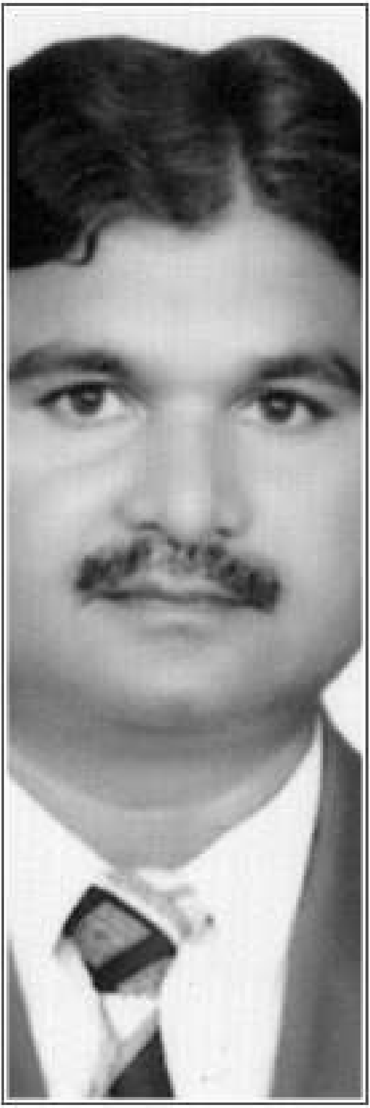

کبھی جو باہر نہ در سے نکلا
وہ میرے کہنے پہ گھر سے نکلا

عجب تو یہ ہے ، نہ موت آئی
نہ تیر میرے جگر سے نکلا

میں اپنی آنکھیں نکال دوں گا
اگر وہ میری نظر سے نکلا

صدائیں دیتا ، دعائیں دیتا
فقیر تیرے نگر سے نکلا

کسی کی صورت نہ دل سے نکلی
کسی کا سودا نہ سر سے نکلا

ابھی وہ اپنے ہی سائے میں ہے
کہاں وہ اپنے اثر سے نکلا

خوشی سے اپنی چلا گیا ہے
نہیں کسی کے وہ ڈر سے نکلا

انصر حسن

غزل

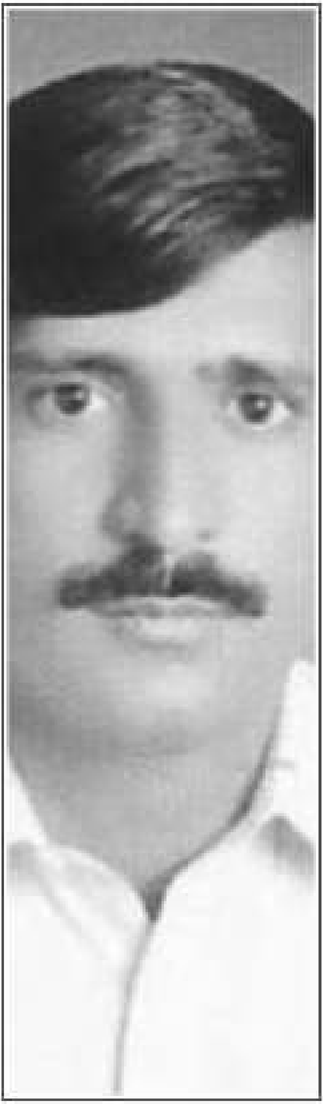

ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے ڈر لگتا ہے
غم کی تفسیر سناتے ہوئے ڈر لگتا ہے

میں ترے عیب و ہنر کا ہوں شناسا لیکن
آئنہ تجھ کو دکھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

اس طرح خوف نے زنجیر کیا ہے مجھ کو
کہیں جاتے، کہیں آتے ہوئے ڈر لگتا ہے

جب سے ٹوٹا ہے مرے ضبط کا بندھن مجھ سے
اشک آنکھوں میں چھپاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

یوں نہ ہو تجھ کو کہیں میری نظر لگ جائے
تیری تصویر بناتے ہوئے ڈر لگتا ہے

اس قدر عشق نے بدنام کیا ہے مجھ کو
ربطِ دل اس سے بڑھاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

بدگمانی کا یہ عالم ہے کہ اب تو دانش
دل کی ہر بات بتاتے ہوئے ڈر لگتا ہے

اعجاز دانش

غزل

ان بجھتے چراغوں نے وفا خوب نبھائی
تا دیر ہواؤں سے رہی ان کی لڑائی

ہر دور میں ہم نے کیا سچائی کا پرچار
ہم نے تو بہرطور روایت یہ نبھائی

آسانیاں بانٹو سدا بکھراؤ اجالے
یہ بات اندھیروں میں تھی جگنو نے سجھائی

یہ عدل کی زنجیر دکھاوے کے لیے ہے
مظلوم کی سنتا ہے یہاں کون دہائی

ناکام رہا پھر بھی ہزاروں کا وہ لشکر
کیا خوب بہتر نے شجاعت تھی دکھائی

ہاتھوں کی لکیروں سے الجھتی رہی آنکھیں
بگڑی ہوئی تقدیر نہ کاتب نے بنائی

سنتے ہیں کہ کل آئیں گے وہ بہرِ ملاقات
کیا جانیے کس نے یہ ہوائی ہے اڑائی

دن رات مگن رہتا تھا جو حرص و ہوس میں
اس نے بھی چلو پیار کی محفل تو سجائی

برسات میں جلتے ہوئے گھر نوحہ کناں تھے
آخر میں جلیل اشکوں نے یہ آگ بجھائی

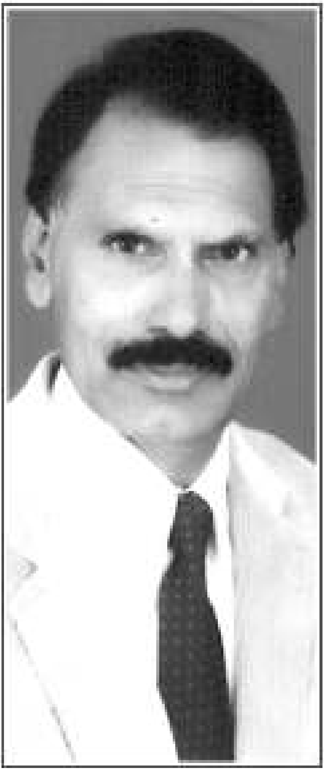

احمد جلیل

غزل

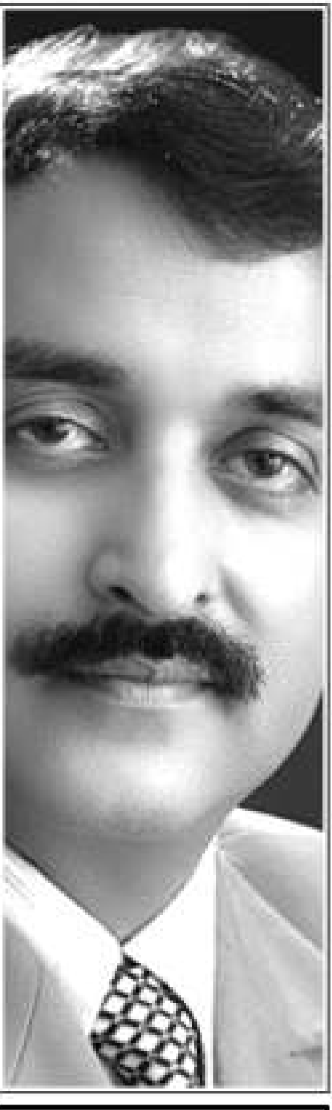

روز مٹی کے چراغوں کو ستارا کرتے
کس طرح شہر کے لوگوں میں گزارا کرتے

سننے والوں کو گوارا ہی نہیں تھا ورنہ
کس قدر شوق تھا ہم ذکر تمھارا کرتے

دیکھ لیتے وہ اگر ایک جھلک عکس ترا
آئنے خود کو کئی بار سنوارا کرتے

ایک ہی بار جو دیکھا تو گنوا بیٹھے ہوش
کس طرح چشمِ تماشا سے نظارا کرتے

کوئی تو ہوتا یہاں بات سمجھنے والا
کوئی تو ہوتا جسے جان سے پیارا کرتے

شہر کا شہر مخالف تھا، محبت کا کمال
ہم جو کرتے بھی تو کس کس سے کنارا کرتے

اشرف کمال

غزل

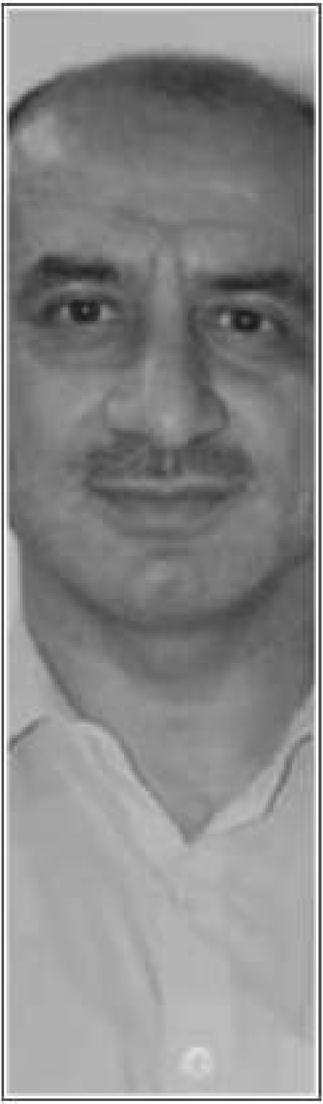

بارش میں جا نکلتا ہوں اور اک جہان میں
قوسِ قزح ہے پُل کی طرح درمیان میں

کردار ہیں کچھ ایسے جو ہم میں نہیں رہے
مل لیتا ہوں میں جا کے اُنھیں داستان میں

تم دُکھ کا ترجمہ نہ کرو ، تجربہ کرو
دُکھ منتقل نہ ہو گا کسی بھی زبان میں

اک روشنی کا حافظے میں انعکاس ہے
سورج کہیں نکل نہ چکا ہو گمان میں

لکھ لکھ کے خواب پھینکتا رہتا ہوں رات بھر
لاحاصلی کے دُکھ سے بھرے کوڑے دان میں

جی لگ گیا جزیرۂ تنہائی پر مرا
کشتی شجر میں رکھ دی ہے مورت چٹان میں

شاہد ماکلی

غزل

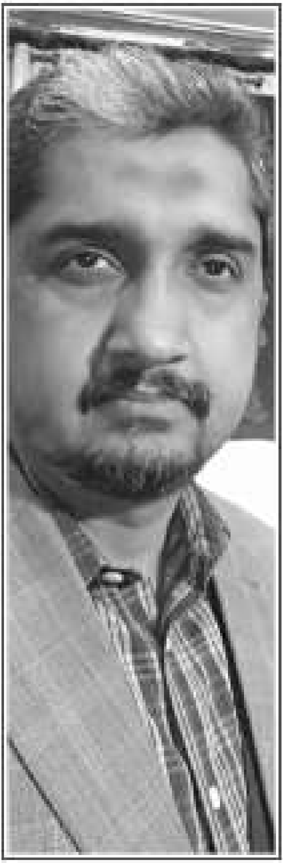

فیصل زمان چشتی

پانی بھی نہیں ہے ہمیں لاکر جہاں مارا
کہتا تھا کہ دوچار قدم پر ہے کنارا

اچھا ہے کہ اُس نام کے دھوکے سے نکل آئیں
جینے میں خسارا یہاں مرنے میں خسارا

جس شخص کو کچھ پردہ نشیں تخت پہ لائے
تسلیم کریں کیوں ہے وہ ہمدرد ہمارا

آئی کوئی امداد ، تسلی نہ دلاسا
لگتا ہے کہ بے سود ہی ہے تم کو پکارا

کشتی کے نہ ملنے کا یقیں تھا ہمیں فیصل
ہم ڈھونڈتے پھرتے رہے تنکوں کا سہارا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد! چھلنی جانیں، خاک کہاں تک چھانیں
دل پر جو کُھلتے ہیں! وہ آفاق کہاں ہیں

غزلیں

اکرم جاذب

وہی کہا کہ جو دیکھا ہے زندگانی میں
کوئی فسانہ نہیں ہے مری کہانی میں

کنارِ آبجو محوِ خرام ہے وہ شوخ
کہ ماہتاب رواں دیکھتا ہوں پانی میں

کس انہماک سے سچ جان کر میں سنتا رہا
وہ جھوٹ بول رہے تھے بڑی روانی میں

یہ بحرِ عشق تھا اور بے خبر چلا آیا
میں ساحلوں کی طلب لے کے بیکرانی میں

یہ لفظ ان کی زباں سے ادا ہوئے اور میں
لگا ہوں ڈھونڈنے پہلو نئے معانی میں

بیاضِ شوق کا ہر شعر جس پہ تھا جاذب
اسی کو دے کے چلا آیا ہوں نشانی میں

دکھا رہی ہے محبت بھی معجزے کیا کیا
امر ہوئے ہیں کئی پل حیاتِ فانی میں

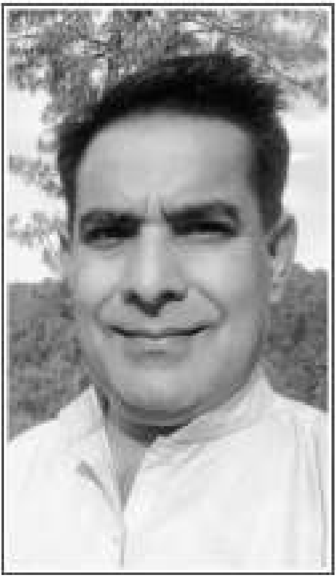

خود کو تقدیر کا قائل نہیں رہنے دے گا
سنگ اب راہ میں حائل نہیں رہنے دے گا

طے وہ کر جائے گا معیارِ رفاقت ایسا
سفرِ تازہ پہ مائل نہیں رہنے دے گا

شہر میں بانٹتا پھرتا ہے محبت ایسے
جیسے اب کوئی بھی سائل نہیں رہنے دے گا

ڈھونڈ کے لاتا رہوں لاکھ میں تریاق مگر
وہ اثر زہر کا زائل نہیں رہنے دے گا

مجھے معلوم ہے پسپائی پہ رونے والا
پیش قدمی کے وسائل نہیں رہنے دے گا

چڑ ہے منطق سے جسے سوچ رہا ہے جاذب
کسی کے پاس دلائل نہیں رہنے دے گا

غزل

کون آیا ہے شبِ غم میں ستانے کے لئے
نیند خود ہی آ گئی مجھ کو جگانے کے لئے

تیرا جانا جانِ جاناں وہ گراں گزرا مجھے
ایک دفعہ لوٹ کے آ پھر سے جانے کے لئے

ان میں سرخی بھی تھی شوخی بھی تھی اور تھا عجز بھی
لے گیا آنسو میں جب اس کو دکھانے کے لئے

شمع روشن کی میں نے اے رہ گزر تیرے لئے
تو نہ پلٹا آس میری کو بجھانے کے لئے

جادو کر دے جو اچانک میرے دل پر بس وہی
چاہیے سرسوں ہتھیلی پر جمانے کے لئے

جب چلے گی سرخ آندھی لوگ تو پوچھیں گے یہ
تم کہاں سے آئے ہو ملبہ اٹھانے کے لئے

لیتے ہیں کچھ آنسو چلو اپنے ہی دل پر گرا
عالمِ حیرت میں ہر غم کو مٹانے کے لئے

گہری شب پر تھی جو لازم پردہ داری اس لئے
نکلی ہے دن کی طرح پردہ ہٹانے کے لئے

وہ نظر سے گرتے ہیں احمد نہیں اس میں ہے شک
نیچ حرکت کرتے ہیں نیچا دکھانے کے لئے

علی رضا احمد

غزل

آپس میں ہوئے برسرِ پیکار ہیں دونوں
دل ایک ہی ہے جس کے خریدار ہیں دونوں

دشمن ہیں مری جان کے، جان ایک ہے میری
لڑ لڑ کے نہ مر جائیں کہ حق دار ہیں دونوں

مشترکہ مصیبت سے عداوت بھی ہوئی ختم
اک دوسرے کے آج طرف دار ہیں دونوں

وہ شخص دُکھی ہے تو سُکھی میں بھی نہیں ہوں
اک کربِ محبت میں گرفتار ہیں دونوں

وہ تیرے نہیں، رتبہ و منزل کے ہیں خواہاں
کل تک تو نہیں تھے جو طلب گار ہیں دونوں

اک عشق ہے اور دوسرا ہے شاعری کرنا
یہ کام اگر دیکھیں تو بے کار ہیں دونوں

دونوں جو رضامند نہیں ساتھ میں رہنا
کیا کیجیے اک ساتھ ہی درکار ہیں دونوں

فخر عباس

غزل

اگر مرے درد میں کسی کی مسرّتوں کا ہے راز پنہاں
خدا سے میری یہ التجا ہے مری شبِ غم دراز کردے

مٹا سکیں دل کی حسرتوں کو یہ حُسن کی بے حجابیاں کیا
جو جلوۂ آتشیں تمھارا نگاہ کو بھی گداز کر دے

یہاں کسی باوفا کا ملنا تلاش پر منحصر نہیں ہے
یہ بخت کا سب معاملہ ہے خدا جسے سرفراز کر دے

وہ جامِ صہبائے بیخودی دے، میں تیری ساقی گری کے قرباں
کہ میری سرمستیوں میں پیدا سرورِ ذوقِ نماز کردے

غمِ محبت میں جلنے والے بتا تو اس وقت کیا کرے گا
یہ کوششِ ضبطِ رازان کواور بھی بے نیاز کردے

یہ شوق افزا خموش خلوت، یہ جذبۂ التفات اُن کا
ہر آرزو مجھ سے کہ رہی ہے کہ آج افشائے راز کردے

جی اے نجم

غزل

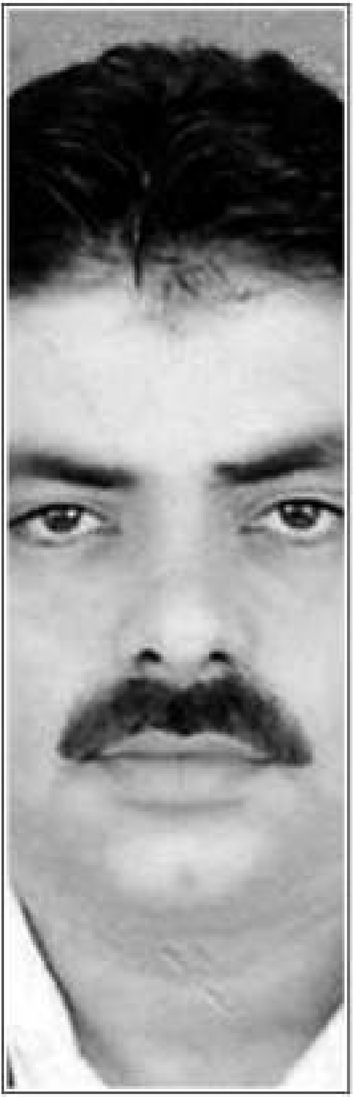

پڑ گئی شام جب اس راہ میں بیٹھے بیٹھے
موجہ گرد نے پوچھا یہاں کیسے بیٹھے

ہر مسافر پہ ہمیں تیرا گماں ہوتا تھا
گرد کے ساتھ کئی بار ہیں اٹھے بیٹھے

ہم ہی تھے محفل یاراں ترے بنیاد گزار
رہ گئے ہم ہی سر شام اکیلے بیٹھے

اسے معلوم تھا یہ شامِ جدائی ہے سو ہم
آخری بار بہت دیر اکٹھے بیٹھے

میں نے کیا کرنا ہے اس قیمتی گلدستے کو
دوست ہے وہ تو مصیبت میں سرہانے بیٹھے

تو گھنا پیڑ سہی پر مرے دشمن کا ہے
اب مرے جیسا ترے سائے میں کیسے بیٹھے

بیٹھے ہیں اگلی نشستوں پہ تجھے دیکھنے کو
ورنہ ہم خالی کلاسوں میں بھی پیچھے بیٹھے

کیا مکدر تھی فضا دل کی مگر اب دیکھو
چند بوندیں پڑیں اور کیسے بگولے بیٹھے

سجاد بلوچ

غزل

آرزوئے بے کراں کا یوں احاطہ کر لیا
اپنی ساری جستجو کو ایک چہرہ کر لیا

اک تمنا نے مجھے ہر درد سے ملوا دیا
اپنے غم کو لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کر لیا

گو تمنا ایک تھی لیکن ہزاروں روپ تھے
میں نے اپنے بخت کا تم کو ستارہ کر لیا

شوق تھا آوارگی کا اور رستے مختصر
لمحۂ تفریق میں ہم نے گزارا کر لیا

ایک ہی خواہش میں ہم نے خرچ کر دی زندگی
اُس کو رسوا کر دیا اپنا خسارہ کر لیا

محفلوں کی جان تھے تم تو بشیر احمد حبیب
کیا ہوا؟ کیوں باغِ دل کو ایک صحرا کر لیا

بشیر احمد حبیب

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

شہر بدر کیے گے ، مہبطِ زر نگار سے
خالدِ کم عیار سے بَرہنہ سر، بَرَہنہ پا

غزل

صغیر احمد صغیر

میں کون ہوں کیسا ہوں یہ اب پوچھ رہے ہو
میں نے کبھی پوچھا ہے جو سب پوچھ رہے ہو

جب میں تھا کبھی جان بہ لب کیوں نہیں پوچھا؟
خواہش ہے نہ اب خواب یہ تب پوچھ رہے ہو

مانو کہ تمھیں عشق کا مطلب نہیں آتا
یہ تم جو مرا نام و نسب پوچھ رہے ہو

اچھا مری آنکھوں میں نظر کچھ نہیں آیا
اچھا تو مری کیا ہے طلب پوچھ رہے ہو

حیراں ہوں کہ تم نے مجھے حیران کیا ہے
تم ہی مری حیرت کا سبب پوچھ رہے ہو

وہ عشق و محبت وہ جوانی وہ کہانی
میں بھول چکا سب یہ جواب پوچھ رہے ہو

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خوبیاں ناقدِ فن کیوں دیکھے
دشت کی آنکھ چمن کیوں دیکھے

غزل

بارِ گراں سے تنگ تھا، خود سے کہا کہ پھینک
سامانِ جسم و جان اٹھا اور اٹھا کے پھینک

دیکھ ، اے ہوائے غم! مرے معیار کو سمجھ
بازار سے اٹھا، پسِ دیوار لا کے پھینک

چپ چاپ کر رہا ہوں میں خود کو ترے سپرد
اپنا بنا کے رکھ مجھے، اپنا بنا کے پھینک

آئے کسی شمار میں مجھ ایسا زرد پھول
گلدستۂ حیات میں کچھ دن سجا کے پھینک

کیا فکرِ ہست و بود ہے، کیا فکرِ روزگار؟
دنیا کو اپنے ہاتھ پہ رکھ اور گھما کے پھینک

علی آرش

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چاہتیں کب ہیں صرف باتیں ہیں
جانِ جاں کوئی جان وارے بھی

غزل

ہیں پسِ پردہ نچانے والے
ہم تو کردار نبھانے والے

بے محل شور مچانے والے
یوں مجھے طیش دلانے والے

ایسے آگے نہیں بڑھنے دیں گے
دائرہ وار گھمانے والے

شہر کا شہر تماشائی ہے
چل دیے حشر اٹھانے والے

میری محرومیوں پر ایک نظر
لاڈلے ، ناز اٹھانے والے

اب کے کہرام بپا کرنا ہے
تین دن سوگ منانے والے

رفتگاں سے مجھے منسوب کرو
ہاں مجھے روگ پرانے والے

وقت کی گرد میں کھوئے ہیں کہیں
وہ مجھے پاس بٹھانے والے

یاد آتے ہیں مجھے میرے بزرگ
طور اطوار سکھانے والے

دل دھڑکتا ہے مرے سینے میں
بے سبب چار سنانے والے

اب کے اک ساتھ بجھا سارے چراغ
سلسلہ وار بجھانے والے

جو مجھے زیر نہیں کر پائے
ہیں وہی دوست بنانے والے

شعبدہ باز ، فسوں گر پھر سے
اک نیا ڈھونگ رچانے والے

استعارہ ہوں اداسی کا میں
ہیں مرے شعر رلانے والے

احمد محسود

غزلیں

خواب خواب آنکھوں میں روشنی تمہاری ہے
دل میں تم دھڑکتے ہو زندگی تمہاری ہے

کر لیا ہے ہم نے یہ فیصلہ محبت میں
رنج و غم ہمارے ہیں ہر خوشی تمہاری ہے

جب قدم اُٹھاتا ہوں یاد مجھ کو آتے ہو
زندگی کی راہوں میں روشنی تمہاری ہے

رنگ تیرے چہرے کا فصلِ گل میں دیکھا ہے
پھول پھول چہروں میں دلکشی تمہاری ہے

جب سے تم کو چاہا ہے شہر بھر کے لوگوں سے
دشمنی ہماری ہے دوستی تمہاری ہے

میں نے کچھ نہیں سوچا میں نے کچھ نہیں لکھا
زندگی کے کاغذ پر شاعری تمہاری ہے

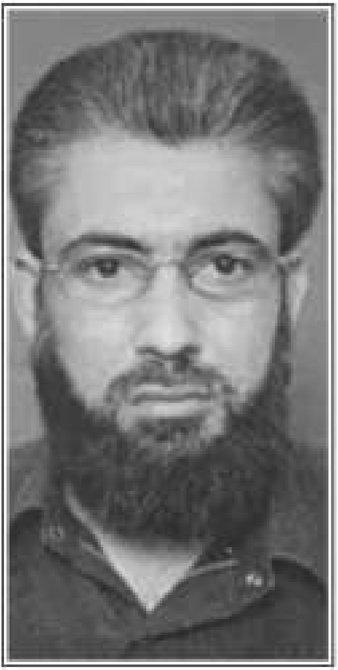

حکیم خان حکیم

ذرا سا صبر زمانہ بدلنے والا ہے
نظامِ جبر حقیقت میں مرنے والا ہے

لہو شہید کا جاتا نہیں کبھی ضائع
مرے وطن کا یہ موسم نکھرنے والا ہے

نظر چرا کے میں جس سے گزرنا چاہتا تھا
وہ میری آنکھ کے اندر اترنے والا ہے

میں اس لیے بھی بہت پیار اس سے کرتا ہوں
وہ شخص میری محبت سے جلنے والا ہے

وہ جس کے غم کو کبھی تو نے غم نہیں سمجھا
تری طلب میں سرِ رہ بکھرنے والا ہے

جسے سکھایا تھا انگلی پکڑ کے چلنا حکیم
وہ مری ذات سے آگے نکلنے والا ہے

غزلیں

عمر فیاز قائل

زِندگی! تیرے لیے ایک دِیا کافی ہے
اب بھی گزرے ہُوئے لمحوں کی صدا کافی ہے

ساری دُنیا بھی اگر مدِ مقابل ہو جائے
غم نہیں، میرے لیے میرا خُدا، کافی ہے

میں نکل جاؤں نہ کر اِتنا کشادہ روزن
زِندگی کے لیے تھوڑی سی ہَوا کافی ہے

میں ہُوں مصلُوبِ وفا اور نہ مصلُوب کرو
خُود ہی مرجاؤں گا بس ایک ادا کافی ہے

ہجر کی دُھوپ یہ پھیلائے ہُوئے پَر اپنے
شامِ احساس مجھے تیری رِدا، کافی ہے

وہ زمانے کی طرف لوٹ گیا ہے قائل
اور مرے ساتھ رہِ پاسِ وفا، کافی ہے

منزل کے اشتیاق میں جتنے قدم پڑے
سالارِ قافلہ سے بھی آگے قدم پڑے

جب بھی جہاں کی سمت ہمیں لوٹنا پڑا
ہر بار جیسے مجھ پہ ہی میرے قدم پڑے

صدیوں کی اِک تھکان بدن سے لپٹ گئی
جیسے ہی راہِ شوق پہ اپنے قدم پڑے

دُنیا کے ساتھ ساتھ چلے ہم جہاں تلک
جتنے قدم پڑے سبھی اُلٹے قدم پڑے

سر سے کہیں اُتارا نہیں ہم نے سازو رخت
گرچہ ہزار بار ہی رستے قدم پڑے

قائل قدم لیے کبھی مہتاب نے مرے
وہ ہم سفر ہُوا تو ستارے قدم پڑے

غزلیں

بڑھتا جائے گا کبھی کم نہیں ہونے والا
محو اس دل سے تیرا غم نہیں ہونے والا

راحت زندگی غاصب کو ملے گی کچھ دن
سرخرو، مکر سے، دائم نہیں ہونے والا

خانہء دل میں جلا ہے جو محبت کا دیا
وہ کسی طور سے مدھم نہیں ہونے والا

تم کو للکاریں گے مزدور کدالیں لے کر
اب محض ظلم پہ ماتم نہیں ہونے والا

کاظم الغیض گھرانے کا فرد ہے سیّد
جہل کی بات پہ برہم نہیں ہونے والا

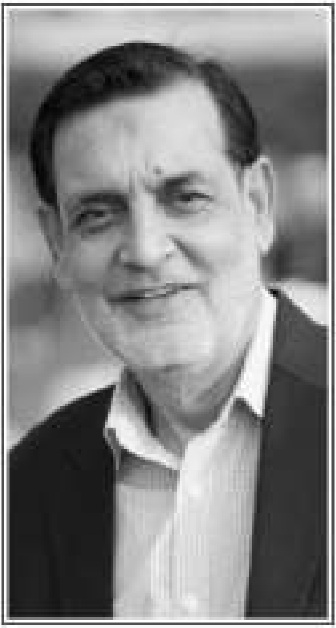

حسن پرویز سیّد

کیسا شباب چھایا تھا کیسا گزر گیا
آیا تھا اک بہار کا جھونکا گزر گیا

کچھ تم سناؤ ہجر میں کیسے بسر ہوئی
اپنے تو دل کے شہر سے دریا گزر گیا

بچپن کے پاک لمحوں کا ہمدم ہو ذکر کیا
خوشیوں کا ایک دور تھا سچا، گزر گیا

ہر اک برس کی آخری شب سوچتا ہوں میں
کن فرصتوں میں سال یہ سارا گزر گیا

داخل ہوا تھا دل کے خرابے میں ایک شخص
نغمے محبتوں کے سناتا گزر گیا

سیّد تیری شگفتہ مزاجی کی خیر ہو
اک وقت کہ برا تھا سو اچھا گذر گیا

غزل

جو تھا نہ کسی کا ، وہ ہمارا بھی نہیں تھا
پر اُس کے بِنا اپنا گزارہ بھی نہیں تھا

کرتا تھا بُرائی جو مِرے آگے تمہاری
میرا تو نہیں تھا ، وہ تمہارا بھی نہیں تھا

میں ڈوب رہا تھا تو فقط اُس نے بچایا
حالانکہ اُسے میں نے پکارا بھی نہیں تھا

جلدی تھی اُسے آنے کی سب کے ہی مُقابل
صدقہ تو ابھی میں نے اُتارا بھی نہیں تھا

رخصت وہ ہوا جونہی ، پریشان ہوں تب سے
رُکنے کے لئے میں نے پکارا بھی نہیں تھا

تھی مجھ کو ضرورت بھی اُسی فیض رساں کی
احسان مگر اُس کا گوارا بھی نہیں تھا

بے سمت ہی بڑھتی رہی کشتی یہ ہماری
اس بحرِ محبت کا کنارا بھی نہیں تھا

آئے ہیں سبھی یار ، ضیاؔ! سننے کو غزلیں
تم نے تو ابھی اِن کو سنوارا بھی نہیں تھا

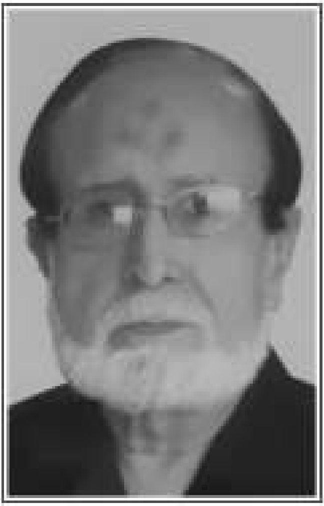

سید ضیا حسین

غزل

صورتوں پر نہ جایئے صاحب
دل پہ نظریں جمایئے صاحب

سن ہی لی جائے گی کبھی نہ کبھی
بات دل کی سنایئے صاحب

بوجھ اوروں پہ ڈالنا کیسا
ہاتھ سب کا بٹایئے صاحب

جس کا سہنا سبھی کو آساں ہو
حشر اتنا اٹھایئے صاحب

ذلتیں تو جہاں میں ارزاں ہیں
صرف عزت کمایئے صاحب

جا چکا ہے جو چھوڑ کر اس کو
پھر نہ واپس بلایئے صاحب

راہ کانٹوں بھری ہے دنیا کی
اپنا دامن بچایئے صاحب

کوئی سنتا نہیں تو پھر کیا ہے
دل نہ اپنا جلایئے صاحب

اس میں اوروں کا حق بھی ہے انجم
اپنے آگے سے کھایئے صاحب

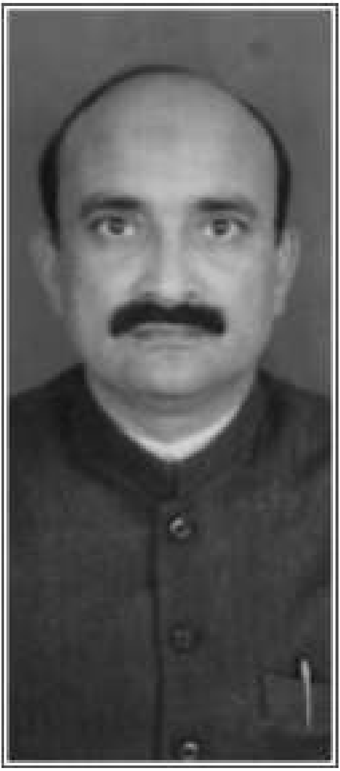

محمد افضال انجم

غزل

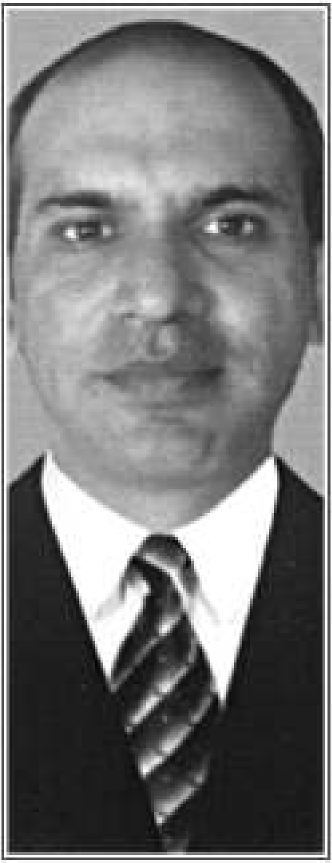

تمھیں دیکھا ہوئی جب آشنائی
محبت سے ہوئی تب آشنائی

فلک پردہ بنے دنیا کی خاطر
نظر والوں کو دے رب آشنائی

صدائے ذات سے بچ کر چلا جو
ملی ہر گام ہے جب آشنائی

مری سوچوں میں نُورِ ہمدمی ہے
وراثت میں ملی شب آشنائی

شفیق انصاری ملنا چاہتی ہے
مجھے ہر گام پر اب آشنائی

محمد شفیق انصاری

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دَف بھی تھی نوحہ نشاں ، نغمہ بھی نالہ تھا مرا
عجب آہنگِ گلوگیر حوالہ تھا مرا

غزل

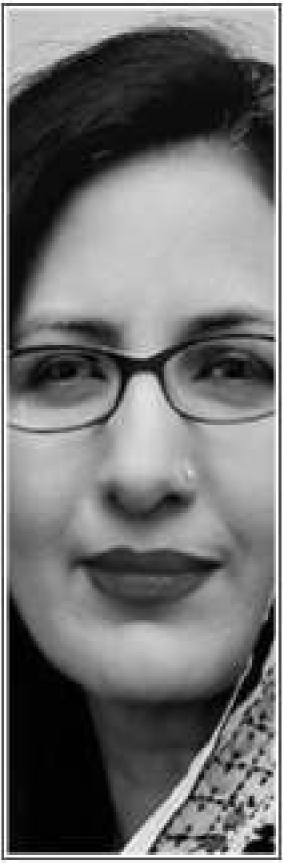

الماس شبی

تیرگی ہی ہمارے گلے پڑ گئی، روشنی کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا
موت بھی اب ہمیں منہ لگاتی نہیں، زندگی کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا

خوش نما خوبصورت بہت ہیں مگر، کاغذی پھول ہیں ان میں خوشبو نہیں
روٹھ کر ہم سے بیٹھے ہیں سارے حسیں، دلبری کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا

ہم نے ٹوکا تھا آہ وفغاں سے فقط، دشمنِ جاں سے ملنے کو روکا تھا بس
بے سُری ہو کے ہم کو دکھانے لگی، بانسری کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا

ہم نے سوچا کہ ہم تو فرشتے نہیں، کچھ ہوا جو غلط وہ غلط بھی نہیں
ہم سے ناراں ہوا پھر فلک کس لیے، آدمی کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا

سارے خوباں نے مل کر کیا فیصلہ، کان بھرنے لگے عشق کا اس طرح
عشق نے کر دیا عاق ہم کو شبی، عاشقی کو بھلا ایسا کیا کہہ دیا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزلیں

دم بدم وحشتوں میں پالے کی
چیخ سنتا ہے کون چھالے کی

راز کی بات راز ہی رکھتے
آپ نے کیوں مرے حوالے کی

اس جہاں میں رہے گی کیا عزت
مجھ، تری بزم سے نکالے کی

رات کے سامنے نجانے کیوں
دال گلتی نہیں اجالے کی

خوش رہو اب لکیر مت پیٹو
اب ضرورت نہیں ازالے کی

باپ کرتا ہے کیا جتن ثاقب
اب سمجھ آئی ہے نوالے کی

ثاقب تبسم ثاقب

''عارضی'' جال سے نکل جائے
دل تری چال سے نکل جائے

آنکھ کے لال کرب کا موسم
گردشِ حال سے نکل جائے

پھول پھر کس طرح سے مہکیں گے
جب نمی ڈال سے نکل جائے

دے سہولت مرے خدا مجھ کو
جان جنجال سے نکل جائے

پھر کسی کام کے نہیں دھاگے
جب حیا شال سے نکل جائے

ہو سدھایا ہوا مرا طوطا
اور تُو فال سے نکل جائے

شور ہی شور ہے فقط ثاقب
راگ جب تال سے نکل جائے

غزل

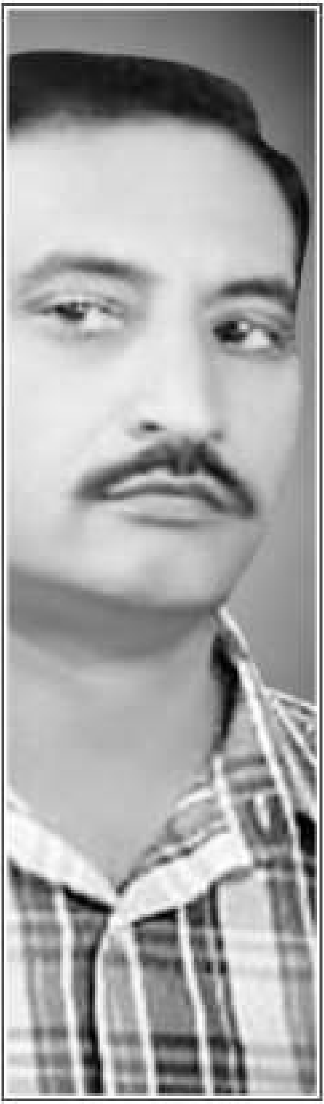

یہ بھی گزری ہے مہربانوں پر
سر سجائے گئے نشانوں پر

اب تہِ خاک ہیں وہ صاحب بھی
جن کے چرچے تھے آسمانوں پر

کشتیاں خاک جان پائیں گی
کیا گزرتی ہے بادبانوں پر

کون سچ کو خریدنے آئے
جھوٹ بکتا ہو جب دکانوں پر

موت ہی موت ہر طرف، گویا
آدمی بوجھ ہیں مکانوں پر

ایک ہم تھے کہ مل نہیں پائے
پھول کھلتے رہے ڈھلانوں پر

اب تو ساجد خدا بچائے مجھے
اُتر آیا ہے وہ بہانوں پر

سجاد حسین ساجد

غزلیں

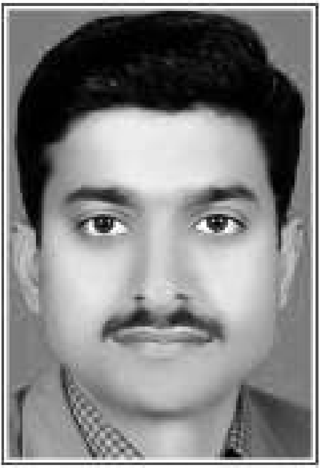

محمد علی ایاز

خمیر شعر ابھی شعر کے منافی ہے
اے واقفانِ سخن اس کی کیا تلافی ہے

تمام عمر کوئی ایک عشق کر لیا جائے
تمام عمر کوئی ایک زخم کافی ہے

کچھ اس لیے بھی الجھتا ہے میرا دل مجھ سے
کہ میرے پاس محبت کا دکھ اضافی ہے

میں چاہتا ہوں محبت پہ سب کا ایماں ہو
مگر یہ ذکر ہمیشہ سے اختلافی ہے

ذوالفقار شاذ

عشق کا سر پہ تاج رکھتے تھے
حسن پر حکم باج رکھتے تھے

لرزشِ برگ پر حزیں تھے ہم
بلبلوں کا مزاج رکھتے تھے

التجا سی تھی ان کی آنکھوں میں
جانے کیا احتیاج رکھتے تھے

رند تھے شاذ کب ہم ایسے ، بس
زاہدوں سے لجاج رکھتے تھے

غزل

جیسے دیوار کو بُنیاد نہیں چھوڑتی ہے
یوں مجھے بندشِ اجداد نہیں چھوڑتی ہے

شعر بچوں کی طرح آ کے لپٹ جاتے ہیں
مجھ کو تنہا مری اُولاد نہیں چھوڑتی ہے

گھر سے نکلوں تو جکڑ لیتے ہیں احباب مجھے
اور اکیلے میں تری یاد نہیں چھوڑتی ہے

ہجر زادی کی صدا آتی ہے زنداں سے مجھے
پا بہ زنجیر بھی فریاد نہیں چھوڑتی ہے

اس لیے نام کہانی میں ہے پیہم تیرا
دوست دنیا کوئی رُوداد نہیں چھوڑتی ہے

میری آوارہ مزاجی سے ہے واقف سو حسن
شاہزادی مجھے آزاد نہیں چھوڑتی ہے

عطاالحسن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کارگر کون رہا کارِ وفا میں خالد
کس کی قسمت میں ہے فرہاد کا تیشہ ہونا

غزل

دل مرا حلقۂ تحریک میں رہ جائے گا
جسم بھی گوشۂ تاریک میں رہ جائے گا

یہ محبت کا نظارہ کہیں بجھ جائے گا
یہ سماں پردۂ باریک میں رہ جائے گا

مفلسا! چُپ کہ امیروں کا ضروری دھندہ
تیری فریاد، تری بھیک میں رہ جائے گا

زخم وہ پھر مرے آرام سے سہلائے گا
محو وہ پھر مری تضحیک میں رہ جائے گا

وہ مرا نصف کہیں دور چلا جائے گا
حزن اور غم مرے نزدیک میں رہ جائے گا

جیا قریشی

انتخاب

خالد احمد

نعمان منظور

آس بن کے گمرہوں کو عمر بھر ڈستی رہیں
پیار کے سندر بنوں میں سرسراتی دوریاں

غزل

ہم نے شب ہے آنکھوں کاٹی ، ہم نے دن میں زہر پیا ہے
ہم نے تیری یاد جلائی ، ہم نے تیرا ذکر کیا ہے

یک طرفہ سی اِس الجھن میں ، یک طرفہ سی اُس چاہت میں
دل کے روگ کا کانٹا لے کر ، ہم نے بھی کیا وقت جیا ہے

غیر کے سامنے ہنستے بھی ہیں ، غیر کو رو دکھلاتے بھی ہیں
میرے سامنے بس اک چپ سی ، واہ وا کیا ہی شرم و حیا ہے

ظلم میں پستے ہر اک کو پھر ، ہم نے دل سے لگایا ہے
ہم نے ہر اک رنج سہا تھا ، ہم نے ہی ہر چاک سیا ہے

کون رکھے گا یاد ہمیں پھر ، کس کے دل میں دھڑکیں گے ہم
کون سی دنیا ہم نے بدلی ؟ کون سا ایسا کام کیا ہے؟

شعر ہزاروں تیرے ہوں گے پر جو غزل سنائی ہے اب
یہ کچھ خاص ہے دل کو بھائی، آخر اس میں کچھ تو نیا ہے

پاگل ، الو ، بھولوں ، عاشق ، مجنوں ، قیس و پنوں ، رانجھا
دیکھو مجھ بے کار کو عثماں اس نے کیا کیا نام دیا ہے

عثمان حنیف

غزل

سمیرا یوسف

کسی سے جو بھی کوئی کھیل کھیل جاتا ہے
تو اُس کو وقت وہی وقت پھر دکھاتا ہے

جو میرے اشک بہانے پہ مسکراتا تھا
کسی کے سامنے اب اشکِ غم بہاتا ہے

جو میرے دل کو دلاسہ تلک نہ دیتا تھا
تمام شہر کو اب دردِ دل سُناتا ہے

گئے دنوں کی رفاقت پہ خون روتا ہے
وہ جب بھی اہلِ محبت کے شہر آتا ہے

وہ جس نے مجھ کو کسی کے لیے تھا ٹھکرایا
وہ آج مجھ کو بلا واسطہ بُلاتا ہے

اِسی امید پہ کہ لوٹ آؤں میں شاید
وہ روز اپنے در و بام تک سجاتا ہے

سمیرا کوئی کسی کا نہیں ہے دنیا میں
خلوص، پیار تو سارا جہاں جتاتا ہے

غزل

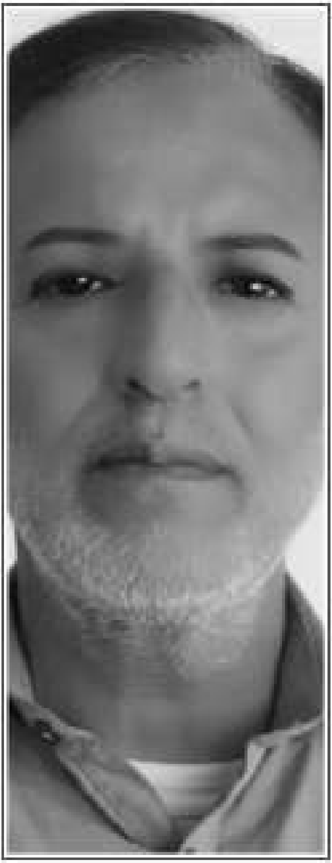

وہی تیرہ بختی کے سلسلے، وہی حال میرے جنون کا
وہی چرچے تیرے وجود کے، وہی سحر تیرے فسون کا

ملا جب بھی تجھ سے تو لٹ گیا، میرا چین صبر قرار تک
وہی بے قراری وہ ابتری، کوئی لحظہ نہیں ہے سکون کا

رہی تیرے دید کی آرزو، تجھے سوچا، چاہا، طلب کیا
تو سبق تھا مکتب عشق کے ہر لکھے ہوئے مضمون کا

مجھے عشق نے تیرے کیا ملال، ذرا دیکھ کتنا ہوں پائمال
کوئی حال دل نہ سمجھ سکا، کہ یہ واقعہ تھا درون کا

ہاں جی! علم و درس تو ضرور ہوں مگر ان کے ساتھ ہنر بھی ہو
نئے دور کا یہ تقاضا بھی، کہ زمانہ آیا فنون کا

نور کمال شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

جانے کس رو نے بجھا ڈالی ہیں
جانے کس دھن میں تھیں ساری آنکھیں

غزلیں

بہت ہی اجنبیت سے ملا ہے
وہ شائد اب تلک مجھ سے خفا ہے

ابھی تو میں نے تم کو بھولنا ہے
ابھی تو یاد کا موسم ہرا ہے

مری سوچیں ہیں کیوں آباد اس سے
جدا ہو کر بھی کب مجھ سے جدا ہے

ملا مجھ کو کبھی تو پوچھ لونگی
بنا میرے سفر کیسے کٹا ہے

گیا تھا چھوڑ کر مجھکو جہاں وہ
وہیں پہ وقت گویا رک گیا ہے

مری آنکھوں سے گر دیکھو گے دنیا
تو ہر اک شخص ہی پھر باوفا ہے

تمہیں کھویا تو یہ احساس جاگا
ہمیشہ ساتھ ہے جو بس خدا ہے

زمانہ ہو گیا ہے خواب دیکھے
مری آنکھوں میں ٹھہرا رتجگا ہے

نائلہ راٹھور

کھو گئی سوچ کے اُجالوں میں
ذہن الجھا رہا سوالوں میں

پھر ترے نام کا حسیں مطلب
ڈھل گیا شعر کے خیالوں میں

چل ذرا چارا گر سے پوچھیں ہم
درد کب تک رہے گا چھالوں میں

تیرے قصے نگر نگر کوکی!
تو جو رہتی ہے خوش خصالوں میں

کوکی گل

غزل

آنکھ اور خواب جھوٹ بولتے ہیں
یعنی اسباب جھوٹ بولتے ہیں

تم سے کہتے ہیں میں بہت خوش ہوں
میرے احباب جھوٹ بولتے ہیں

تم محبت کی داستاں نہ پڑھو
اس کے سب باب جھوٹ بولتے ہیں

مل کے چہرے پہ زندگی کے رنگ
ہم سے نایاب جھوٹ بولتے ہیں

کون مرتا ہے اب کسی کے لیے
سارے سُرخاب جھوٹ بولتے ہیں

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سورج اُبھرے تو زمیں پر سے اُٹھائے سائے
روشنی آئے مگر ساتھ نہ لائے سائے

غزل

نہیں ہے ایسا کہ میں گیت گایا کرتا تھا
مگر خوشی میں کبھی گن گنایا کرتا تھا

کبھی سجاتا تھا دیوار و در کو رنگوں سے
کبھی منڈیر پہ شمعیں جلایا کرتا تھا

کبھی فضاؤں کو رنگیں بنانا چاہتا تو
فضاؤں میں، مَیں پتنگیں اڑایا کرتا تھا

اسی طلسم سے بیگانے بن گئے میرے
میں ان سے ملتے ہوئے مسکرایا کرتا تھا

یہی تو خو تھی کہ جس نے مجھے رکھا زندہ
میں دوستوں کے یہاں آیا جایا کرتا تھا

جو دیکھتا تھا اُداسی کسی کے چہرے پر
تو دوستوں کو لطیفے سنایا کرتا تھا

میں دوستوں کے بھلا دل دکھا کے کیا کرتا
میں دشمنوں سے بھی نفرت چھپایا کرتا تھا

مرے خدا نے ہٹا دیں رکاوٹیں ساری
میں راستے میں سے پتھر ہٹایا کرتا تھا

مرے خدا نے مجھے منزلیں عطا کر دیں
مسافروں کو میں رستے بتایا کرتا تھا

مرے خدا نے مجھے قید سے اماں میں رکھا
میں قید میں سے پرندے چھڑایا کرتا تھا

معاف کرنا! یہ میری پرانی عادت ہے
کہ بچپنے میں بھی میں دل چرایا کرتا تھا

مری سلیٹ مری کائنات تھی ساری
بنا بنا کے میں چہرے مٹایا کرتا تھا

کسی کے پیار میں گھر تو بنانا بنتا تھا
کہ ریت سے میں گھروندے بنایا کرتا تھا

مرے مزار پہ روشن رہیں چراغ سدا
میں روشنی کے لیے دل جلایا کرتا تھا

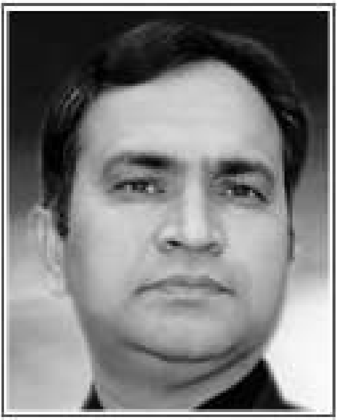

علمدار حسین

غزل

دیوار رو رہی ہے کوئی در بھی خوش نہیں
کرلا رہی ہے کونج کبوتر بھی خوش نہیں

اندر کے حبس سے ہیں تجھے مسئلے مگر
تُو حجرۂ وجود کے باہر بھی خوش نہیں

میداں میں چھوڑ آئے ہیں نیزے بھی ڈھال بھی
یہ جنگ جیت کر میرا لشکر بھی خوش نہیں

دنیا میں آ کے میں ہی اکیلا نہیں اداس
دنیا کی سیر کر کے سکندر بھی خوش نہیں

صحرا سے میری ویسے ہی بنتی نہ تھی کبھی
دریا خفا ہے مجھ سے سمندر بھی خوش نہیں

میں رقص کر رہا ہوں ہوا ہو نہیں رہا
ناراض ہیں ملنگ قلندر بھی خوش نہیں

اس عاشقی میں سب کو برابر صلہ ملا
عاجز ہوئے ہیں خوار تو خودسر بھی خوش نہیں

ایسی اداسیوں کا بسیرا ہے ان دنوں
مجھ سا فقیر آپ سے مل کر بھی خوش نہیں

اے حُسنِ باکمال ترے لمس کے بغیر
کمرہ تو اور چیز ہے بستر بھی خوش نہیں

اس کھردرے لباس سے کوئی گلہ ہی کیا
مجھ سے تو میرا ریشمی پیکر بھی خوش نہیں

مستحسن جامی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بن کر سپردگی کا تصور پگھل کے آ
مجھ تک تو اپنے جسم کے شعلوں پہ چل کے آ

غزلیں

زمیں سے شکایات ، ناشاد ہیں ہم
مگر کیا کریں اس پہ آباد ہیں ہم

تو کیا پوچھتا ہے تجھے کیا سنائیں
بہت دکھ بھری ایک رُوداد ہیں ہم

میسر نہیں جس کو عرفان اپنا
خدایا تری کیسی ایجاد ہیں ہم

زمیں پر خلافت کا بارِ امانت
اٹھایا ہے ، آدم کی اولاد ہیں ہم

ولادت سے لے کر دمِ واپسیں تک
ہمہ وقت نوحہ ہیں ، فریاد ہیں ہم

نعیم خان

شوخ تیری شرارتی آنکھیں
دل کو بھاتی بجھارتی آنکھیں

جن کو ہر اہلِ دل پڑھا کیجیے
تیری آنکھیں عبارتی آنکھیں

حسن پہلے بھی کم نہیں تیرا
اور اس کو نکھارتی آنکھیں

منزلِ جان سے بہت آگے
اہلِ دل کو گزارتی آنکھیں

دے کے خیرات حسن کی سب کو
تیرا صدقہ اتارتی آنکھیں

بات خوباں کی گر کرے کوئی
تیری آنکھیں صدارتی آنکھیں

کم نہیں ہونٹ بھی ترے لیکن
حسن تیرا سنوارتی آنکھیں

عاصم بخاری

غزلیں

دل کے چھالوں کا کیا کرے کوئی
خالی وعدوں کا کیا کرے کوئی

آنے والوں پہ کھول دیں بانہیں
جاتے قدموں کا کیا کرے کوئی

نرم پڑ جائیں ذکرِ دنیا پر
ان ارادوں کا کیا کرے کوئی

اے حقیقت شناس بتلا تو
بڑھتے سپنوں کا کیا کرے کوئی

جو بُرے ہیں گنوا دیئے جائیں
اور اچھوں کا کیا کرے کوئی

یار کی دید کو ترستی رہیں
ایسی آنکھوں کا کیا کرے کوئی

چشمِ بےخواب ، ریگِ صحرا ہے
آبشاروں کا کیا کرے کوئی

دکھوں سے ماورا جانے گئے ہیں
یہ کس بستی میں ہم لائے گئے ہیں

وہ فطرت میں نہیں گرگٹ کے ہوں گے
جو رنگ انسان میں دیکھے گئے ہیں

پہاڑوں کے جگر جو چاک کر دیں
یہاں وہ تیر بھی جھیلے گئے ہیں

ستم ہے پھول بھی کِھلنے سے پہلے
ہوس کی آگ میں جھونکے گئے ہیں

کوئی نرمی نہ اُس پتھر میں جاگی
پگھلتے شعر بھی لکھے گئے ہیں

غضب کا بخت ہے اپنا ردا ہم
محبت کرنے پر کوسے گئے ہیں

ردا حاصل خلوص

غزل

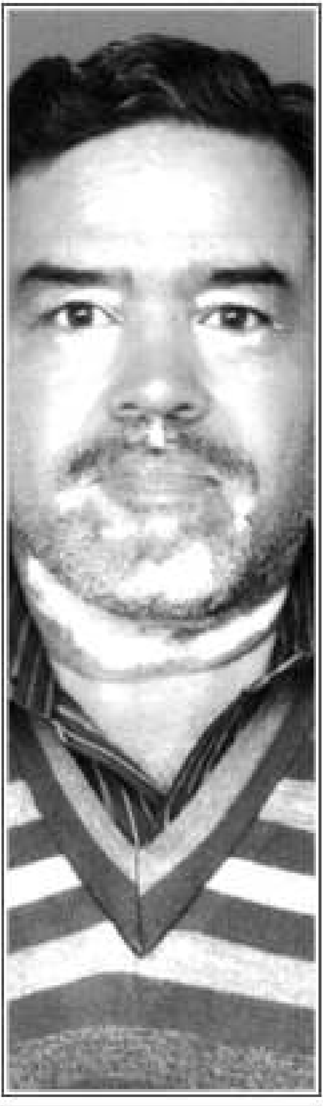

ہر اک نے ہاتھ میں ہے اریزر رکھا ہوا
جیسے ہو میرا نام مکرر لکھا ہوا

کیسی تمھاری یاد نے پھر آبیاری کی
ہر ایک زخم پھر سے ہمارا ہرا ہوا

اک لوح خاردار پہ دیکھا جو غور سے
خونِ جگر سے لفظ تھا خواہش لکھا ہوا

انسان جل رہے ہیں تو اس کا سبب بنا
اک بے ضمیر مفتی کا فتویٰ دیا ہوا

منہ زور ہو رہی ہیں ہوائیں بھی آجکل
گرد و غبار بھی لگے سر پر چڑھا ہوا

اہلِ زمیں تو سنتے نہیں ہیں پکار کو
اور عرش کا مکیں بھی ہے ضد پر اڑا ہوا

تلخیٔ اجل کی کچھ نہیں میرے لیے عطا
میں نے ہے زندگی کے مزے کو چکھا ہوا

عطاالعزیز

غزل

دیکھے ہیں بہت ہم نے در و بام چمکتے
ڈھلتے ہوئے سورج کی طرح ، شام چمکتے

ایاّم کہ ہر صبح نظر آتے گل اندام
ہر شام لبِ بام شفق فام چمکتے

ایاّم کہ ہر صبح ہوئی شامِ غریباں
گلفام سرِ تیغ ہیں ہر گام چمکتے

اک عمر گزرتی ہے مُسلسل تگ و دو میں
تب مجلسِ آفاق میں ہیں نام چمکتے

ہم لوگ تن آسان تھے بزدل تھے مرے دوست
برداشت اگر کرتے کچھ آلام ، چمکتے

مسکین معلم نے کیا آج بھی فاقہ
بازار میں بِکتے رہے اجسام چمکتے

انسان اگر صاحبِ ہمت ہو تو انجم
قسمت میں لکھے جاتے ہیں ایاّم چمکتے

امتیاز انجم

غزل

چاہتوں کا گماں ضروری تھا
عشق ہوتا عیاں ضروری تھا

آنکھ روتی ہوئی بتاتی ہے
جانے والا یہاں ضروری تھا

اے اُداسی تجھے بھی رہنے کو
میرے دل کا مکاں ضروری تھا؟

وقتِ مشکل تجھے پکارا تھا
تیرا آنا وہاں ضروری تھا

مجھ کو میرے خدا بڑھاپے میں
ایک بیٹا جواں ضروری تھا

زندہ رہنا تھا سو عدالت میں
میرا جھوٹا بیاں ضروری تھا

باپ روٹھا تو یہ کہا ، مالک!!
سر پہ اک سائباں ضروری تھا

ہر مصیبت کو ٹالنے والا
ماں ، ترا آشیاں ضروری تھا

جانے والے کو دیکھنا تیرا
اے مری جانِ جاں ضروری تھا

ایک مدّت کے بعد جانا ہے
کون کتنا کہاں ضروری تھا

طلحہ ، تجھ سے اداس لوگوں کا
اِک ، علیحدہ جہاں ضروری تھا

حافظ طلحہ غفور

غزلیں

لبنیٰ مقبول غنیم

تجھے کرنا ہے تو پھر کچھ نیا کر
اَنا کو ذات سے اپنی جُدا کر

زمیں پر رہ کے چُھو لے اُس فلک کو
قفس میں قید سب پنچھی، رِہا کر

دعاؤں میں سَمو کر اُس کی چاہت
نمازِ عشق خلوت میں اَدا کر

سجا ہونٹوں پہ دلکش مسکراہٹ
زمانے کی طرح ہنس کر مِلا کر

تجھی سے عشق کے سب سلسلے ہیں
کبھی مِل بیٹھ اور دل کی سُنا کر

کرے ہے عشق پیری میں کلی سے
ارے کچھ شرم کر، کچھ تو حیا کر

تری ناراضی مجھ پر ہے قیامت
میں جی اٹھتی ہوں پھر تجھ کو مَنا کر

ترے سائے سے بھی نفرت جسے ہے
کرے گا ساتھ کیا، اس کو وِدا کر

کفِ افسوس، کیوں مَلتے ہو صاحِب
غنیمِ جاں سے پینگیں تم بڑھا کر

اس کو جب دیکھ کے بنتی ہیں یہ انجان آنکھیں
یار پھر دیر تلک رہتی ہیں ویران آنکھیں

میری تحریر کے ہر لفظ کی نسبت ان سے
میرے لکھے سبھی افسانوں کا عنوان آنکھیں

آہ حسرت کہ رخِ یار کو تکتی ہی رہیں
جب غزل کہتی ہیں بن جاتی ہیں دیوان آنکھیں

راستے اپنے الگ کیوں وہ کرے گا خود سے
مسترد کرتی ہیں اس کا ہر اک امکان آنکھیں

حسنِ مژگاں کے اشارے ہیں حیا کے پابند
میزبانی کے تقاضے کریں مہمان آنکھیں

وہ مری ذات کے ہر رنگ پہ رکھتا ہے نظر
ہائے مخبر یہ سدا، دل کی پشیمان آنکھیں

یلغار سے پہلے

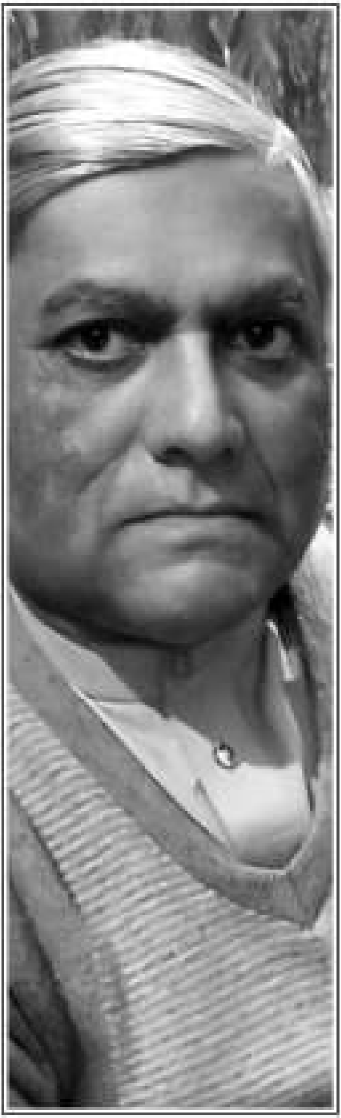

کلیم خارجی

غار پہ پہرہ دیتے ہوئے اس کی عمر ڈھل چکی تھی۔ لیکن اپنی نسل اور قبیلے کو ہلاکتوں سے بچانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ غار کے دہانے پہ بیٹھا رہے۔اس نے دیکھ لیا تھا کہ غار میں گھسنے کے تین ہفتے بعد جب اس کا باپ غار سے برآمد ہوا تو وہ بدروحوں کے شکنجے میں تھا اس نے پہلے ہی دن اپنی ماں اور تین بیٹوں کو نہایت بے حرمتی اور بے دردی سے قتل کر دیا تھا۔خاندان کے کچھ مرد بھی بُری طرح زخمی کر دیئے تھے۔ اس کے باپ کے اندر بے پناہ درندگی اور جہالت پیدا ہو چکی تھی قبیلے کے لوگوں نے رات کو سونا اور دن کو گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا چنانچہ بڑی محنت حوصلے اور چالاکی سے اس نے اپنے باپ کو ڈھونڈ کر ہلاک کیا تھا۔

پھر کچھ دن تیز بارش، سردی اور طوفان سے گھبرا کر اس کا چھوٹا بھائی غار میں پناہ گزین ہوا تھا۔ سنہری دھوپ کی گرمی میں نکلتے ہی وہ اپنی سگی بہن سمیت قبیلے کی دو عورتیں اور چار بچوں کو لے کر بیچ جنگل میں کہیں چھپ گیا تھا۔ کئی دن کے تعاقب اور تلاش کے بعد جب اُسے تمام عورتوں

اور بچوں کی عریاں اور نوچی ہوئی لاشیں ملیں۔ تو وہ چنگھاڑتے ہوئے اپنے بھائی کے پیچھے لگا رہا اور ایک دن اس نے اپنے زخمی اور بھوک سے سسکتے ہوئے بھائی کو جالیا۔ اس نے اس پر ذرا بھی ترس نہ کھایا اور اُسے لاٹھیوں کے وار سے بے سدھ کر کے اس نے اُسے سوکھی جھاڑیوں کے ڈھیر میں پھینک کر آگ لگادی تھی اُسے یقین ہو چکا تھا کہ غار میں بدروحیں ہیں اور وہ کسی آدم زاد کے انتظار میں رہتی ہیں اس لیے اس نے اپنی طرح کے انسانوں کو بچانے کے لیے غار کی نگرانی کو اپنا فرض سمجھ لیا تھا۔ بڑا سا لٹھ لیے وہ دن رات غار کے آگے لیٹا رہتا۔ اس کی بیوی بیٹیاں اور بیٹے اس کے لیے کھانے پینے کی چیزیں لے کر آنے لگے تھے۔ اس نے بتا دیا تھا کہ عبادت گاہ میں سجدوں اور چلوں سے زیادہ افضل کام اب اس کے لیے یہی ہے کہ وہ غار کے اندر کسی آدم زاد کو گھسنے نہ دے۔ چنانچہ وہ دن، تہوار اور فرشتوں کے اترنے کے مقدس دنوں میں بھی غار کے دہانے پہ بیٹھا اپنے کھانے کا منتظر رہتا۔

ایک رات سخت سردی کی دھند میں اس کی جوان اور حاملہ بیٹی اس کی گود میں لیٹ کر روتے ہوئے بولی، قبیلے والوں نے سردی سے بچنے کے لیے عبادت گاہ میں برکت دینے والے لکڑی کے سارے مجسمے جلا دیئے ہیں اور فرشتوں کے اترنے والے دن راتوں میں اس کے سگے بھائیوں نے اس کی عصمت لوٹ لی ہے اور اب وہ ان میں سے کسی ایک سے حاملہ ہے۔ باپ کی شفقت بھری تھپکیوں سے سنبھل کر وہ دوبارہ سسک کے بولی جھونپڑی کے آس پاس انسانی کھوپڑیاں اور اعضا پائے جانے لگے ہیں عبادت گاہ کی ٹوٹی ہوئی دیواروں پہ گدھوں نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں۔ اس نے تڑپ کر اپنی بیٹی کو بھینچ لیا۔ اور اس کا ماتھا چوم کر وہ اُسے بیچ جنگل میں لے گیا۔ پھر اُس نے عجلت اور غصے میں لکڑیاں کاٹ کر رات ہی رات اس کے لیے چھوٹی سی جھونپڑی بنائی۔ جھونپڑی کے دروازے پہ اس نے آگ کا الاؤ روشن کر کے کلہاڑی بیٹی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا اپنی جھونپڑی، جان اور الاؤ کو محفوظ رکھنا۔ اور نے اپنا لٹھ بھی بیٹی کے پاس رکھ دیا۔ اور کراہتا ہوا واپس اپنی غار کے پاس آیا۔ اس نے ہمت کر کے دہانے پہ رکھے ہوئے پتھر کو غار کے آگے سے کھسکایا اور فتح کا نعرہ بلند کرتے ہوئے اُس نے غار میں جیسے ہی قدم رکھا غار چیخوں سے گونج اُٹھی۔

☆☆☆☆☆

آسماں تاریک ہے

اقبال خان یوسف زئی

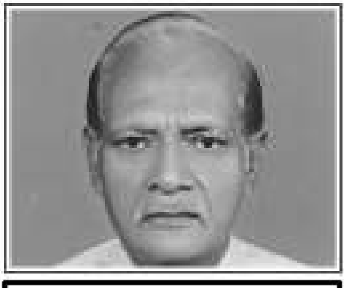

وہ ریستوران میں بیٹھا نہ جانے کِس کا منتظر تھا- اچھے مستقبل کا، یا اپنے کسی دوست کا اُس کا چہرہ کھلی کتاب کی طرح میرے سامنے تھا میں بہت دیر سے ریستوران میں بیٹھا ہوا اُس کا مطالعہ کر رہا تھا لمحہ لمحہ ورق ورق مجھے اُس کے چہرے کی کتاب میں کئی ایسے الفاظ نظر آرہے تھے جو شاید دنیا کی کسی لُغت میں نہ تھے سوچ میں گُم خلاؤں میں تکتا ہوا یہ چہرہ کسی ایسی سَمت کی طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں راستے کبھی منزل پر نہیں پہنچا کرتے بس اُفق کی طرح زمین سے ملتے ہوئے تو ضرور نظر آتے ہیں لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا- میں نے سوچا آخر یہ دنیا کیوں حقیقتوں سے خالی ہوتی جا رہی ہے-

اُسے بیٹھے ہوئے دو تین گھنٹے گزر گئے تھے لیکن ابھی تک اُس نے چائے کا ایک ہی کپ منگوایا تھا جو گھونٹ گھونٹ آدھا ہی خالی ہوا تھا- چائے کے ہر گھونٹ پر وہ اس طرح مُنہ بناتا جیسے اپنی تلخیوں کو چائے کے ساتھ مِلا کر پی رہا ہو- ریستوران کا اکیلا ویٹر شاید اُسے جانتا تھا جو اُس کے اتنی دیر تلک بیٹھنے پر بھی کوئی ناگواری محسوس نہیں کرتا تھا- بعض انسان یوں ہی جیئے چلے جاتے ہیں بغیر کسی مقصد بغیر کسی لگن کے میں نے دِل میں سوچا اور گھبرا کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا- شاید میں دیکھنا چاہتا تھا کہ زندگی کا کوئی مقصد میرے بھی دل میں ہے یا نہیں؟ آج بی اے کا آخری پرچہ تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ آئندہ میں کیا کروں گا اور کیا ہوگا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوال ڈس رہے تھے- ان سوالوں کا زہر میری رگ وپے میں خون کی طرح جاری وساری تھا- ماں کی گرفت زندگی پر کمزور سے کمزور تر ہوتی چلی جارہی تھی اور بہن جوان آگے چل کر دونوں راہیں ایک بوڑھی منزل پر آن ملتی ہیں اور یہ فاصلے کسی دوسرے کے نقشِ قدم سے جگمگانے لگتے ہیں- آسمان کے نیچے یہ سب کھیل دیکھ کر ’’تخلیق کرنے والا ہنستا تو ہوگا-‘‘ ____ اور اب تو مجھے اس خیال سے بھی گھبراہٹ ہوتی کہ میری بہن طاہرہ جوان ہورہی یا میری مشکلات-

مشکلات جوان ہو کر تو اتنی فِیل تن ہو جاتی ہیں کہ بڑے سے بڑے شہ زور کو بھی پچھاڑ دیتی ہیں- میں نے گھبرا کر اُسے دیکھا جو اپنا

آدھا کپ اُٹھا کر چائے کی چُسکی لے رہا تھا یوں لگا جیسے وہ آئینہ ہو۔ میں اپنا عکس دیکھ کر حیرت سے اُسے تکنے لگا۔ چہرے پر مایوسیوں کا ہالہ، لبوں پر پھیکی سی بے روح استہزایہ مسکراہٹ۔

وہ اکثر ریستوران آتا ایک کپ چائے کا منگوا کر گھنٹوں بیٹھا رہتا۔ ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ لے کر اُس کے لبوں پر ایک گرم سی مسکراہٹ نظر آتی جیسے کوئی حسین یاد درد میں ڈوب کر نکلے اور شفق کی سُرخی میں سما جائے۔ بات شناسائی سے گزر کر وہاں پہنچی جہاں یہ نازک جذبہ دوستی بن جاتا ہے۔

بہت دنوں بعد ایک کیفے میں چائے پیتے ہوئے میں نے اُس سے پوچھا۔

سلیم! کیا اُداسی کا نام سلیم ہے۔

اُس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ نہیں دنیا میں سینکڑوں سلیم ہیں شاید وہ ابھی کچھ اور کہتا مگر میری پشت پر کسی کو دیکھ کر ایک دم چپ ہو گیا۔ میں نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا مجھے یوں لگا جیسے میں دنیا کی آخری سرحد پر کھڑا ہوں جہاں نفرت اور محبت بھیک مانگتے نظر آتے ہیں میں نے لمحہ بھر کے لیے پیچھے مُڑ کر اُس کی نگاہوں کا تعاقب کیا پھر سلیم سے پوچھا۔ کیا ہوا؟

اُس نے میرا ہاتھ ایک اضطراب کے عالم میں پکڑا اور کیفے سے باہر لے گیا۔

ارے بندۂ خدا کچھ بتاؤ گے بھی تم تو یونہی کسی معمہ سے کم نہیں آخر ہوا کیا؟

اُس نے بے چینی سے مجھے دیکھا اور کہا

"میری بیوی تھی" __ وہ بہت جلدی میں بولا وہ مجھ سے طلاق لے چکی ہے

لیکن کیوں؟

تاکہ دوسری شادی کر سکے

لیکن کیوں؟

دمے کے پرانے مریض کی طرح اُکھڑے اُکھڑے سانسوں کے درست کرتے ہوئے اُس نے ایک جھٹکے سے میرا ہاتھ چھوڑ کر کہا۔ تاکہ وہ خوش رہ سکے

مگر_ وہاں سے یوں بھاگ آنے کی کیا ضرورت تھی؟ اُس نے میرے سوال کو خاموشی سے سُنا۔ پھر یوں بولا گویا خود سے باتیں کر رہا ہو۔ خوشی حاصل کرنے کے لیے تو لوگ جانے کے کیا کیا جتن کرتے ہیں۔ حق چھینتے ہیں۔ گلا کاٹتے ہیں۔ ضمیر فروشی کرتے ہیں تاکہ روپیہ حاصل ہو جائے جو اُنھیں سُکھ دے گا خوشی دے گا اور اُس نے تو محض مجھ سے طلاق لی ہے۔ مگر اُس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ اب بھی خوش نہیں۔

بھولے بچے! تُو نے اُس کی آنکھوں میں اپنے چہرے کا عکس دیکھا ہوگا۔ اُس نے میری بات سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے کہا میں اُسے بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں شاید کبھی بھلانے میں کامیاب ہو جاؤں لیکن یہ سب تم نہیں سمجھو گے، جو میرے دل پر بیت رہی ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے درد نے لفظوں کا روپ دھار لیا ہے یا جیسے وہ خود سے مخاطب ہو۔ قربت

جب جدائی میں بدلتی ہے، تو عذاب بن جاتی ہے۔ میں اُسے روز ہی اپنے چھوٹے سے مکان میں چلتے پھرتے دیکھتا ہوں اُس کے قدموں کی آہٹ سُنتا ہوں۔ تمناؤں کی آغوش میں اُس کے جسم کی گرمی محسوس کرتا ہوں۔ پیار کے انداز لیے اُس کی تصویر روز مجھ سے پوچھتی ہے کیا ہم واقعی علیحدہ ہو گئے۔

تو اُسے کسی اور کی یادوں سے سجالو۔ یہ کہتے ہوئے مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی لگتی ہے۔

میں جانتا تھا تم یہی کہو گے لیکن میں ایسا نہیں کر پاؤں گا۔ کئی بار سوچا لیکن بے کلی کا وہ جہنم جو میرے سینے میں دہک رہا ہے میں اُس میں خود ہی جل جانا چاہتا ہوں اکیلا چپ چاپ۔

وہ اکیلا اور چپ چاپ سا چہرہ چھوڑے مجھے برسوں بیت گئے ہیں۔ طاہرہ کی شادی ہو چکی ہے اور ماں زندگی کی شاہراہ پر چلتے چلتے بستر مرگ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دراز ہو چکی ہے۔ میں اپنی ناکامیوں اور نادیدہ تمناؤں کی لاش اُٹھائے اُٹھائے پھر رہا ہوں شاید اُنھیں دفن کرنے کے لیے اس پوری کائنات میں کہیں کوئی جگہ نہیں۔

پھر میں نے سوچا۔ ہر آج نے کل میں ڈھل جانا ہے۔ آنے والا کل کیسے گزرے گا کوئی نہیں جانتا۔ گزرے گا بھی یا نہیں۔ کوئی پتہ نہیں اس لیے جو کچھ بیت گیا اُسے کب تک سینے سے لگائے رہو گے۔ ایک پل کیا ایک لمحہ بھی ویسا نہیں آئے گا جیسا گزر گیا ہے دل کو بہت سمجھاتا ہوں مگر سلیم کی بے بسی نے مجھے بھی بے بس کر دیا ہے جیسے وہ سب کچھ مجھ پر بیتا ہے وہ سب کچھ میرے ساتھ ہوا ہے۔ اتنی آسانیاں پا کر بھی جو ذہن میں خلا ہے وہ پُر نہیں ہو پاتا۔ ماں کو کتنا ارمان تھا میری شادی کا لیکن یہ دودھاری نفرت سانسوں کی طرح اُٹھتی ہے اُس کی تیزی کو کُند کرنا میرے بس میں نہیں ہے شاید۔

کون جانے کب کوئی میرے اس چھوٹے سے مکان سے نکل کر اپنی جنت علیحدہ بنا لے اور یہ چھوٹا سا مکان ایک بڑا سا جہنم بن جائے، جس میں یادیں ایندھن کی طرح جلتی رہیں میرے وجود کو کسی کے جسم کی گرمی سانپ بن بن کر ڈستی رہے۔ پیار کا انداز لیے کسی کی تصویر روز مجھ سے کہے اِسے کسی اور کی یادوں سے سجالو میں نئی حوا ہوں میں نے نیا آدم تراش لیا ہے۔

لیکن اِس مکان میں کتنا سکون ہے اردگرد کتنا خوبصورت ماحول ہے فرش پر بچھا ہوا یہ قالیچہ جس میں رنگ یوں انگڑائیاں لے رہے ہیں جیسے گلشن میں یکدم پھول کھل گئے ہوں کائنات جھوم اُٹھی ہو۔ میں نے نرم نرم صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوچا اس کے برقی سنہرے گلوب مور کی طرح پنکھ پھیلائے ہوئے ہیں اور اُن میں بجلی کے قمقمے معصوم بچوں کی طرح حیرت سے تکتے ہوئے کتنے اچھے لگ رہے ہیں۔ میں نے آہستگی سے بٹن بند کر دیئے معصوم بچوں کی حیرت دور ہو گئی کمرے میں ایک پُرسکون اندھیرا اور آیا۔

زنگ آلود پرانے صندوق کی طرح کا وہ کمرہ مجھے یاد آ رہا تھا جسے ماں کے مرنے کے بعد میں مقفل کر آیا تھا وہ میرے اس کمرے کو دیکھتی تو جانے کتنا خوش ہوتی ہر اچھی ماں کی طرح میرے اچھے دنوں کی دعا مانگنے والی ___ میں کتنی جاں

لیوا ناکامیوں کے بعد ایک غیر ملکی فرم میں اسسٹنٹ منیجر بنا تھا یہ چھوٹا سا سجا سجایا مکان فرم کی جانب سے مجھے دیا گیا تھا چھٹی کے بعد قرب و جوار کی سیر کر نا رات کو تھک کر واپس اس کمرے میں آجانا بس یہی زندگی تھی۔ کیا یہی مقصدِ زندگی ہے؟ یہ اور ایسے بہت سے سوال پریشان کرتے تو کافی کے تلخ گھونٹ پی کر سونے کی ناکام کوشش کرتا ہوا جانے کب سو جاتا۔ دل زیادہ گھبراتا تو اپنے دفتر کی ساتھی سُنبل سے ملنے چلا جاتا جس کا خاوند غالباً اُسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ تیس پینتیس سال کی عمر ہوگی۔ جوانی کی جاذبیت اور کشش اب اُس سے دور ہوتی جا رہی تھی کبھی کبھار وہ ہنستی تھی لیکن اُس کی ہنسی عمر کی قید سے آزاد تھی اُس کی ہنسی سُن کر یوں محسوس ہوتا جیسے دور کسی ویرانے میں پھول کِھل گئے ہوں اور ہوا اُن پھولوں کو گدگداتی ہوئی گزر گئی ہے آنکھوں میں کسی کو کھو کر پانے کی تمنا کسی کو پا کر کھونے کا غم نظر آتا تھا دفتر کے بعض ساتھی اپنے معاشقوں میں سُنبل کا نام بھی لیتے تھے مگر اسے کھلنڈرے مردوں کی "بدحواسی" ہی کہا جا سکتا ہے جو اپنے نام کے ساتھ کسی غیر عورت کو اپنے آپ سے منسوب کرنا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ میری اُس سے دلچسپی کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ بھی میری طرح دُکھی معلوم ہوتی تھی۔ دروازے پر دستک کی آواز سُن کر میں نے دوبارہ کمرہ روشن کرتے ہوئے دروازہ کھولا۔

سُنبل تم!

ہاں۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت ہو گئی ہے اُس نے پورے وجود سے روتے اور سسکتے ہوئے کہا گو اُس کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے خالی نظر آ رہا تھا لیکن آنکھیں یوں لگتا تھا جیسے جیسے معاً مجھے سلیم کا خیال آیا اُس کی آنکھوں میں بھی ایسی ہی اُداسی تھی جسے دیکھ کر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں دنیا کی آخری سرحد پر کھڑا ہوں جہاں نفرت اور محبت بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔

میں نے گھبرا کر پوچھا___ کیا ہوا؟

اُس نے خاموشی سے ایک لفافہ میرے ہاتھ میں تھما دیا

طلاق نامہ مگر...... یہ...... یہ تو بہت بُرا ہوا

نہیں! میں ایسے ہی سلوک کی مستحق تھی۔ میں نے اپنے پہلے خاوند کی قدر نہ کی جو مجھے اتنا چاہتا تھا، جس کی ایک لڑکی آرزو کر سکتی ہے۔ اسے غلطی کہہ لو نادانی کہہ لو میں نے محبت کو دولت پر ترجیح دی۔ میرے چند ماہ تو اُس کے ساتھ اچھے گزرے مگر پھر اُس کی دلچسپی مجھ میں کم ہوتی چلی گئی۔ خوشی بھی زندگی کی طرح ہے بس یونہی تھوڑی سی_ پھر ایک دن میں نے اُسے ایک اور لڑکی کے ساتھ دیکھا تو محبت کا رہا سہا بھرم بھی ٹوٹ گیا کئی مرتبہ اس بات پر تلخ کلامی بھی ہوئی معاملات اس حد تک بگڑ جائیں گے میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا نوبت جب جسمانی تشدد تک پہنچی تو میں نے اُس کا گھر چھوڑ دیا اور اس فرم میں ملازمت کر لی اور آج اُس نے بھی مجھے چھوڑ دیا جس کے لیے بہت کچھ چھوڑ دیا تھا۔

تمہارے پہلے خاوند کا کیا نام تھا میں نے کچھ یاد کرتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

سلیم!

☆☆☆☆☆

سیاہ آنکھ میں مری ہوئی لڑکی

ڈاکٹر آنکھ کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے محدب عدسے سے دو تین بار نہایت غور سے مریض کی سیاہ آنکھ میں جھانکا۔ بوڑھے ڈاکٹر کی آنکھوں میں الجھن کے آثار تھے۔

اس نے مریض پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ مریض ادھیڑ عمر تھا۔ چہرے پر ہلکی داڑھی تھی۔ بال لمبے تھے اور اس کی آنکھیں گہری سیاہ تھیں۔ غور سے دیکھنے پر ان آنکھوں میں ویرانی نظر آتی تھی مگر مریض کا اصرار تھا کہ اس کی آنکھ میں کچھ پڑ گیا ہے۔ وہ چبھن محسوس کر رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ڈاکٹر اس چیز کو نکال دے مگر ڈاکٹر ماننے کے لیے تیار ہی نہیں تھا کہ اس کی آنکھ میں کچھ ہے۔

ڈاکٹر نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد کہا۔

''میں آپ کو ڈراپس لکھ دیتا ہوں، صبح شام دونوں آنکھوں میں ڈالیں۔ اپنا نام بتایئے؟''

''شاہنواز، لیکن ڈاکٹر ڈراپس سے کام نہیں بنے گا۔ میں ایک اور ڈاکٹر کے تجویز کردہ ڈراپس استعمال کر چکا ہوں۔ میں نے آپ کے بارے میں سنا تھا کہ آپ بہت قابل ڈاکٹر ہیں کیا آپ کو میری آنکھ میں کچھ نظر نہیں آیا'' مریض بولا۔

''تمہاری سیاہ آنکھ میں مجھے سیاہی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔''

''شاید اس لیے کہ میری آنکھوں کا رنگ سیاہ ہے مگر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟''

شاہنواز نے جیسے چونک کر کہا۔

''سیاہ رنگ موت کی علامت ہے۔'' ڈاکٹر اب بھی اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

شاہنواز نے پہلو بدلا اور کسی قدر ہچکچاہٹ سے کہا۔

''مجھے ان دنوں کچھ عجیب سے خواب بھی دکھائی دیتے ہیں۔''

''کوئی خواب سناؤ''

وسیم جبران

''یہی تو مشکل ہے جاگنے کے بعد مجھے کوئی خواب یاد نہیں رہتا بس اتنا یاد رہتا ہے کہ عجیب سا خواب تھا۔''

''معاف کیجیے میں آنکھوں کا ڈاکٹر ہوں شاید آپ کو نفسیاتی معالج کی ضرورت ہے۔''

شاہنواز ایک گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ ڈاکٹر کے لکھے ہوئے ڈراپس لے کر وہ اپنے فارم ہاؤس میں آ گیا۔ اپنے بیڈ روم میں آ کر اس نے آنکھوں میں ڈراپس ڈالے اور بیڈ پر لیٹ گیا۔ اس نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ وہ سوچنے لگا کہ یہ تکلیف اسے کب سے ہے مگر ٹھیک طرح سے یاد نہ آیا۔ اس نے سوچا کہ کسی سے پوچھنا چاہیے۔ اس فارم ہاؤس میں تین ملازم تھے۔ ایک گیٹ کیپر، ایک مالی اور ایک باورچی۔ ان کے علاوہ اس کی بوڑھی ماں تھی جسے اس کا امیر کبیر باپ طلاق دے چکا تھا۔ اس کے باپ نے کئی سال قبل دوسری شادی کر لی تھی۔

شاہنواز اپنے کمرے سے نکل کر اپنی ماں کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کی ماں ٹی وی دیکھ رہی تھی۔

''ماں میری آنکھ میں دیکھنا، شاید کچھ پڑ گیا ہے؟'' اس کی ماں نے ٹی وی کی سکرین سے نظریں ہٹا کر اپنی نزدیک کی عینک لگا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''کچھ نہیں ہے بیٹے، یہ سب تمہارا وہم ہے۔ تم پہلے بھی کئی بار پوچھ چکے ہو۔''

شاہنواز نے کوئی جواب نہ دیا اور کچن میں چلا گیا۔ باورچی کھانا بنانے میں مصروف تھا۔ اس نے باورچی سے پوچھا۔ باورچی بھی کچھ نہ بتا سکا۔ وہ باری باری مالی اور چوکیدار کے پاس بھی گیا لیکن کسی کو اس کی آنکھ میں کچھ نظر نہ آیا۔ وہ مایوس ہو کر واپس اپنے کمرے میں آ گیا۔ وہ سوچنے لگا کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلتا۔ میں اس قدر تکلیف میں ہوں مگر میری پرواہ نہیں، یہ سب سرسری طور پہ دیکھتے ہیں اگر غور سے دیکھیں تو انہیں نظر آ جائے گا کہ میری آنکھ میں کیا ہے''۔ وہ بیڈ پر لیٹ گیا مگر روز کی طرح اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات گئے نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔

دوسرے دن حسب معمول دیر سے آنکھ کھلی۔ وہ تیار ہو کر اپنے آفس چلا گیا۔ وہ ایک مل اونر تھا اور یہ کاروبار بھی اس کے باپ کا تھا۔ مل کا سارا کام اس کا مینیجر اور ورکر کرتے تھے۔ وہ جب بھی آتا تمام ملازمین میں کھلبلی سی مچ جاتی۔ وہ سخت گیر مالک تھا۔ اس کے ملازمین دعا کرتے تھے کہ اس سے سامنا نہ ہو۔ اس نے اپنے دفتر میں بیٹھتے ہی مینیجر کو بلایا۔ جب وہ اندر آیا تو شاہنواز آنکھ مل رہا تھا۔ ''ذرا ادھر آؤ اور

دیکھو میری آنکھ میں کیا ہے؟'' منیجر نے قریب سے دیکھا۔

''سر! آپ کی آنکھ لال ہو رہی ہے، اس طرح آنکھ کو مسلنا نہیں چاہیے۔''

''ٹھیک ہے مشورے مت دو، جاؤ''

منیجر فوراً کمرے سے نکل گیا۔ شاہنواز نے ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر آنکھیں بند کر لیں اور سوچنے لگا کہ شاید مجھے کسی نفسیاتی معالج سے ملنا چاہیے۔ شام کو وہ ایک نفسیاتی ماہر کے سامنے تھا۔ اس کے ساتھ کافی طویل سیشن ہوا مگر اس کی باتوں سے وہ اور الجھ کر رہ گیا۔ نفسیاتی ماہر بھی اس کا مسئلہ حل کرنے سے قاصر تھا۔

اس رات بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات آدھی سے زیادہ گزر چکی تھی۔ کمرے میں مدھم روشنی تھی اور وہ جاگ رہا تھا۔ اچانک اسے ایسا لگا جیسے اس کی آنکھ سے کچھ نکلا ہو۔ اسے دیوار پر ایک ہیولہ سا دکھائی دیا۔ آہستہ آہستہ اس کے خدوخال واضح ہونے لگے۔ دیوار پر نظر آنے والا سایا ایک لمبے بالوں والی دبلی پتلی لڑکی کا تھا۔ اس نے دوسری طرف دیکھا وہ لڑکی اس کے بیڈ کے کنارے پر بیٹھی تھی۔ وہ بری طرح چونک پڑا۔

''کون ہو تم؟''

لڑکی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اسے گھور رہی تھی۔ شاہنواز کو اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''تم بغیر اجازت میرے کمرے میں کیسے آ گئیں؟'' اس نے خود پر قابو پاتے ہوئے غصے سے کہا۔

''میں باہر سے نہیں آئی، میں تو یہیں تھی۔'' لڑکی نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''جھوٹ مت بولو، اس کمرے میں میرے سوا کوئی اور نہیں تھا۔'' شاہنواز نے کہا۔

''مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے۔'' لڑکی نے منہ پھیر لیا۔

''تو پھر تم مجھے پہلے کیوں نظر نہیں آئیں؟''

''کیوں کہ اس وقت میں تمہاری آنکھ میں تھی۔ میرا دم گھٹ رہا تھا اس لیے باہر آئی ہوں۔''

''کیا مطلب؟ ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔ اب میں واپس جا رہی ہوں کیوں کہ میں تمہاری باتوں کا جواب نہیں دینا چاہتی۔'' لڑکی نے یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کا جسم چھوٹا ہونے لگا۔ چند لمحوں میں ہی وہ گھٹ کر چند انچ رہ گئی پھر اچانک ہوا میں تحلیل ہو گئی۔ جیسے ہی وہ غائب ہوئی شاہنواز کو اپنی آنکھ میں شدید چبھن کا احساس ہوا۔ وہ آنکھ ملنے لگا مگر افاقہ نہ ہوا۔ اس نے لائٹس آن کیں اور آئینے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی آنکھ کو غور سے دیکھ رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ سر جھٹک

کر وہ پھر بیڈ پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔

دوسرے دن وہ پھر بوڑھے ڈاکٹر کے پاس چلا گیا اور اس کی منت سماجت کرنے لگا کہ وہ ایک بار پھر غور سے اس کی آنکھ کا جائزہ لے۔ ڈاکٹر نے نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آنکھ کا معائنہ کیا اور کہا۔

”شاہنواز! میں پہلے ہی بتا چکا ہوں کہ تمہاری آنکھ میں کچھ نہیں ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر کچھ ہے اور کل تو اسی آنکھ سے ایک لڑکی نکل کر باہر آ گئی تھی۔“ شاہنواز نے بمشکل اپنی آواز دباتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے وہ پاگل ہو گیا ہو۔

”میں نے آپ سے پہلے بھی کہا تھا، آپ کسی سائیکاٹرسٹ سے رابطہ کریں۔“

”میں نے رابطہ کیا تھا لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔“

”تو پھر میں نے جو ڈراپس دیے تھے ان کا استعمال جاری رکھیں، افاقہ ہو گا۔“ ڈاکٹر نے بیزاری سے کہا۔ شاہنواز سمجھ گیا کہ اب یہاں رکنا بیکار ہے۔ وہ وہاں سے چلا آیا۔ صورت حال خاصی بگڑ چکی تھی۔ گزشتہ کئی راتوں سے وہ لڑکی دو تین بار اسے نظر آئی تھی۔ ایک رات تو وہ سویا ہوا تھا کہ اچانک اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ لڑکی اس کے سرہانے بیٹھی تھی اور اس کے ہاتھ شاہنواز کی گردن پر تھے۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ اس کا گلا دبانے والی تھی۔ اسے جاگتے دیکھ کر وہ واپس اس کی آنکھ میں چلی گئی۔

شاہنواز سوچ رہا تھا کہ اس لڑکی سے کس طرح پیچھا چھڑانا چاہیے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔ رات کو فارم ہاؤس میں اس کے سوا سب سو رہے تھے۔ ماحول پر سناٹا طاری تھا۔ کبھی کبھی دور سے کسی کتے کے بھونکنے کی آواز آتی تو خاموشی ٹوٹتی۔ وہ آہستگی سے اٹھا اور کچن میں چلا گیا۔ کچن سے اس نے ایک تیز دھار چھری اٹھائی اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے سوچا کہ اگر آج وہ لڑکی نظر آئی تو وہ اسے نہیں چھوڑے گا۔

آج وہ سونے کی کوشش نہیں کر رہا تھا وہ بیدار رہنا چاہتا تھا تاکہ وہ لڑکی نظر آ جائے۔ آدھی رات گزر گئی مگر اس لڑکی کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ اس کی آنکھ میں بدستور چبھن کا احساس تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ یکدم اسے آنکھ میں کچھ حرکت کا احساس ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی دائیں آنکھ سے کچھ باہر آ گیا۔ اس نے آنکھ مل کر دیکھا وہ لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔

”اچھا ہوا تم آ گئیں۔ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔“ شاہنواز نے ہونٹ چباتے ہوئے کہا۔

”کیوں؟ تم میرا انتظار کیوں کر رہے

تھے؟" لڑکی نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔
"تم اچھی طرح جانتی ہو کیوں؟ انجان مت بنو؟" وہ چیخا۔
"مجھے کیا خبر کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"
"تم نے میرا جینا حرام کر دیا ہے۔ میں تم سے جان چھڑانا چاہتا ہوں۔"
"اس طرح کوئی کسی سے جان نہیں چھڑا سکتا۔" لڑکی بولی۔
"میں چھڑا سکتا ہوں۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا، مار ڈالوں گا۔" اس نے چھری لہراتے ہوئے غصے سے کہا۔
لڑکی ہنسنے لگی۔ اس کی ہنسی طنزیہ تھی۔ پھر اس کی ہنسی رک گئی وہ اس کی طرف شعلہ بار نظروں سے دیکھتے ہوئے بولی۔
"تم مجھے کیسے مار سکتے ہو؟ میں تو پہلے ہی مری ہوئی ہوں۔"
"مری ہوئی ہو تو میری جان چھوڑو۔" وہ چیخا۔
"کیسے چھوڑ دوں تم نے محبت کا جھانسا دے کر مجھ سے شادی کی اور تم نے مجھ سے میری زندگی چھینی ہے۔ میں جینا چاہتی تھی مگر تم نے مجھ سے میرے خواب، میری جوانی اور میری سانسیں چھین لیں، کوئی اس طرح بھی اپنی بیوی کی جان لیتا ہے۔" شاہنواز کو ایک دھکا سا لگا۔ اسے اپنے ذہن پر پڑی ہوئی گرد چھٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔
"ہاں کوئی ایسا نہیں کرتا لیکن مجھے تم پر شک تھا، میں نشے میں تھا اور غصے میں تھا۔"
"تو کیا اس طرح تمہیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ تم میری جان لو۔ ابھی تین مہینے تو ہوئے تھے ہماری شادی کو۔ تم نے الزام لگایا اور مجھے بولنے کا موقع بھی نہ دیا۔ آہنی ڈمبل میرے سر پر مار کر مجھے موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر میری لاش کو اپنے کارندوں کے ذریعے غائب کروا دیا، تم انسان نہیں جانور ہو لیکن تم بچ نہیں سکو گے۔" لڑکی نے غم و غصے کے عالم میں کہا۔
"چلی جاؤ۔ چلی جاؤ" شاہنواز چیخنے لگا۔
"اس طرح چیخنے سے کچھ نہیں ہو گا۔ میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ اسی طرح تمہاری آنکھ میں رہوں گی اور دنیا کو سب بتاؤں گی۔" لڑکی نے سرد لہجے میں کہا۔ شاہنواز جیسے پاگل سا ہو گیا۔ "تم اس طرح مجھے نہیں ہرا سکتیں۔ میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا۔ تم میری آنکھ میں نہیں رہ سکو گی۔ اب نہ یہ آنکھ رہے گی اور نہ تم اس میں رہ سکو گی۔" شاہنواز چیخا۔
گھر کے ملازم شاہنواز کی چیخ سن کر اس کے کمرے میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ تیز دھار چھری اس کے سینے میں پیوست ہے اور اس کا خون کمرے کے فرش پر پھیل رہا ہے۔

☆☆☆☆☆

چاندنی

ترجمہ: حمزہ حسن شیخ

میڈم جولی روبیئر اپنی بڑی بہن، میڈم ہنریٹ لیٹور کا انتظار کر رہی تھی، جو ابھی ابھی سویٹزرلینڈ سے لوٹی تھی۔ لیٹور خاندان تقریباً پانچ ہفتے پہلے ہی اپنا گھر چھوڑ گیا تھا۔ میڈم ہنریٹ نے اکیلے اپنے خاوند کو واپس اپنی جاگیر کلواڈوز کی اجازت دے دی تھی، جہاں کچھ کاروبار کو اس کی توجہ کی ضرورت تھی اور وہ اپنی بہن کے ساتھ کچھ دن گزارنے کے لیے پیرس آیا تھا۔ رات ہوگئی۔ ایک خاموش کمرے میں، میڈم روبیر غائب دماغی کے ساتھ ملگجی اندھیرے میں کچھ پڑھنے میں مصروف تھی، جب بھی وہ کوئی آواز سنتی تو اپنی آنکھیں ضرور اٹھاتی۔

آخرکار اس نے دروازے پر گھنٹی کی آواز سنی اور اس کی بہن نمودار ہوئی جس نے ایک سفرانہ چوغہ پہنا ہوا تھا اور بغیر کسی روایتی سلام دعا کے، انہوں نے بہت ہی محبت کے ساتھ ایک دوسرے کو گلے لگالیا، صرف چند لمحوں کے لیے ایک دوسرے کو جدا کرتے ہوئے تاکہ وہ ایک دوسرے سے دوبارہ گلے لگ سکیں۔ پھر انہوں نے اپنی صحت، اپنے اپنے خاندانوں اور ہزاروں دوسری چیزوں کے بارے میں باتیں کیں۔ گپ شپ لگاتے، جلدی میں

بال جھٹکاتے، ٹوٹے ہوئے جملوں کے ساتھ وہ ایک دوسرے سے بات چیت کرتی گئیں جبکہ میڈم ہیرئٹ اپنا ہیٹ اور نقاب اتار رہی تھی۔

اب خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ میڈم روبیر نے ایک لیمپ کے لیے گھنٹی بجائی اور جونہی یہ لایا گیا، اس نے اپنی بہن کے چہرے کا جائزہ لیا اور ایک بار پھر اس کا جی چاہا کہ وہ اپنی بہن کو گلے لگا لے۔ لیکن اس نے خود کو روک لیا، خوفزدہ سی ہوئی اور اس کے ظاہری وجود پہ حیران رہ گئی۔

میڈم لیٹور کی کنپٹیوں پہ، سفید بالوں کی دو بڑی لٹیں تھیں۔ جبکہ اس کے باقی سارے بال، بہت چمکدار، سیاہ فام کالے تھے؛ لیکن وہاں اکیلے، اس کے سر کے دونوں جانب، چاندی کی دو لہریں سی تیرتی نظر آتیں جو فوراً ہی اپنے اردگرد پھیلے ہوئے سیاہ جنگل میں گم ہوتی دکھائی دیتیں۔ وہ کم و بیش صرف چوبیس سال کی تھی اور یہ تبدیلی اس میں یک لخت آئی تھی جب وہ سوئٹزرلینڈ سے لوٹی تھی۔

بغیر کسی حرکت کے، میڈم روبیر نے حیرانی کے ساتھ اس کو دیکھا، اس کی آنکھوں میں آنسو تیر آئے کہ ہو نہ ہو اس کی بہن کا کسی ناگہانی اور پراسرار مصیبت سے سامنا ہوا ہے۔ اس نے پوچھا:

''کیا بات ہے، ہنریٹ؟''

ایک اداس چہرے کے ساتھ مسکراتے ہوئے، ایک ایسی مسکراہٹ جو کہ بیمار دل کے ساتھ ہو، دوسری نے جواب دیا:

''کیوں، کچھ بھی نہیں، میں تم کو یقین دلاتی ہوں۔ کیا تم نے میرے سفید بال دیکھ لئے ہیں؟'' لیکن میڈم روبیر نے تیزی کے ساتھ اس کو کندھوں سے تھام لیا اور اس پر کھوجتی ہوئی نگاہیں ڈالتے ہوئے دوبارہ پوچھا:

''کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ مجھے بتاؤ تمہارے ساتھ کیا ہوا ہے۔ اور اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا، مجھے بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔''

اب وہ دونوں آمنے سامنے تھیں اور میڈم ہنریٹ، جو بالکل ایسے دکھائی دے رہی تھیں جیسے وہ بے ہوش ہونے والی ہو، اس کی جھکی ہوئی آنکھوں کے کونوں پہ موتیوں کی طرح آنسو ابھر آئے تھے۔

اس کی بہن نے دوبارہ بات شروع کی:

''کیا ہوا ہے تمہیں؟ کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟ مجھے جواب دو۔!'' پھر ڈوبی ہوئی آواز میں، دوسری نے بڑبڑاتے ہوئے کہا:

''میرا۔۔۔ میرا ایک محبوب ہے۔'' اور اپنا چہرہ چھوٹی بہن کے کندھے میں چھپاتے ہوئے، اس نے آہیں بھریں۔

پھر، جب اسے تھوڑا سا سکون آیا اور اس کی چھاتیوں کے ابھار کچھ دھیمے پڑ گئے، اس نے خود کو اس سے جدا کرنا شروع کر دیا، جیسے کہ وہ اپنا راز اس کے سامنے اگلنا چاہتی

ہو اور غموں کے اس غبار کو ایک ہمدردانہ دل میں منتقل کرنا چاہتی ہو۔

دونوں عورتیں ایک دوسرے کے ہاتھ مضبوطی سے تھامے ہوئے، ایک صوفے کی جانب چلی گئیں جو کہ کمرے کے ایک اندھیرے کونے میں رکھا تھا۔ وہاں وہ ایک دوسرے میں کھو گئیں۔ چھوٹی بہن نے اپنا بازو بڑی بہن کی گردن میں حمائل کیا اور اسے اپنے دل کے قریب کرتے ہوئے اس کو غور سے سننے لگی۔

''آہ! میں جانتی ہوں کہ میرے لیے کوئی بہانہ نہ تھا؛ میں خود کو بھی نہ سمجھ سکی اور اس دن کے بعد، میں محسوس کرتی ہوں جیسا کہ میں پاگل تھی۔ میری جان، اپنے لیے بہت محتاط رہو--- بہت ہی محتاط---!!! اگر تم صرف یہ جان لو کہ ہم کتنے کمزور ہیں، کتنے جلدی ہم گھائل ہو جاتے ہیں اور محبت میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ اس میں بہت ہی کم وقت لگتا ہے، بہت ہی کم وقت، بہت ہی کم--- یہ درد کا ایک لمحہ ہے، دکھ کے ان اچانک احساسات میں سے ایک جو آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، آپ پہ ساری آرزوئیں کھل جاتیں ہیں، آپ کی بانہیں، محبت کرنے کے لیے، کسی چیز کے پیار میں کھونے کے لیے جس سے کچھ خاص لمحوں میں ہم کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔

''تم میرے خاوند کو جانتی ہو، اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ مجھے اس سے کتنا پیار ہے؛ لیکن وہ بہت بڑی عمر کا اور سمجھدار ہے اور وہ کبھی بھی ایک عورت کے دل کے نرم جذبات کی لہر کو محسوس نہیں کر سکتا۔ وہ ہمیشہ ہی ایک جیسا رہا ہے، ہمیشہ اچھا، ہمیشہ مسکراتا ہوا، ہمیشہ مہربان اور ہمیشہ ہی کامل--- او ہو! کیسے میں کبھی کبھار یہ خواہش کرتی کہ وہ مجھے اپنی بانہوں میں گرمجوشی کے ساتھ لپیٹ لے، کہ وہ مجھے اپنے مست اور مدہوش بوسوں کے ساتھ گلے لگا لے جو کوئی بھی دو وجودوں کو ایک کر دیتے ہیں، جو ایک گونگے اعتماد کی طرح ہوتا ہے اس طرح میں نے خواہش کی تھی کہ وہ بیوقوف تھے، بالکل کمزور، تاکہ اس کو میری ضرورت رہے، میرے پیار کی اور میرے آنسوؤں کی---!!!

''یہ سب کچھ بہت ہی احمقانہ محسوس ہوتا ہے؛ لیکن ہم عورتیں اس طرح ہی ہوتی ہیں۔ ہم اس مسئلے میں کیا کر سکتی ہیں؟''

''اور ابھی بھی اس کو دھوکہ دینے کا کوئی بھی خیال میرے دماغ میں نہیں ہے۔ اور اب یہ محبت کے بغیر، کسی وجہ کے بغیر اور کسی چیز کے بغیر ہو چکا ہے، صرف و صرف اس وجہ سے کیونکہ ایک رات جھیل لوسرنیں پر چاند چمکا ہے۔

''سارے مہینے کے دوران، جب ہم ایک ساتھ سفر کر رہے تھے، میرے خاوند نے اپنی دھیمی بے پروائی سے میرے جوش و جذبے کو بے حس کر دیا اور میرے شاعرانہ جوش و

جذبے کو بجھا کے رکھ دیا۔ جب ہم سورج ابھرتے وقت، پہاڑوں سے نیچے راستوں پر اتر رہے تھے، جب کہ چار گھوڑے جانفشانی کے ساتھ ایک ساتھ سرپٹ دوڑ رہے تھے، ہم نے صبح کی شفاف دھندلاہٹ میں، وادیاں، جنگل، ندیاں اور گاؤں دیکھے، میں نے خوشی سے اپنے ہاتھوں سے تالیاں بجائیں اور اسے کہا: ''جان! یہ سب کتنا پیارا نظارہ ہے! مجھے ایک بوسہ دو! ابھی مجھے ایک بوسہ کرو!'' اس نے صرف سرد مہر ہمدردانہ مسکراہٹ کے ساتھ اتنا سا جواب دیا: ''اس بات کی کوئی وجہ نہیں کہ ہم کیوں ایک دوسرے کو پیار کریں، صرف اس وجہ سے کہ تم کو یہ نظارہ پسند آگیا ہے۔''

''اور اس کے الفاظ نے مجھے اور میرے دل کو منجمد کر دیا۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جب لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، ان کو پہلے سے زیادہ محبت کی تبدیلیوں کو محسوس کرنا چاہیے جب ایسے خوبصورت مناظر ان کے اردگرد موجود ہوں۔

''دراصل، میرا من شاعری کے لیے مچل رہا تھا جس کا اس نے مجھے اظہار نہیں کرنے دیا۔ میں بالکل ایک بوائیلر کی طرح تھی جو کہ بھاپ سے بھرا ہوتا ہے اور ساحرانہ طور پر بند ہوتا ہے۔

''ایک شام (ہم فلولین کے ایک ہوٹل میں چار دن سے ٹھہرے ہوئے تھے) رابرٹ، بیماری کے باعث اپنے شدید سر درد کی وجہ سے، رات کے کھانے کے فوراً بعد جلدی ہی سونے کے لیے چلا گیا اور میں بالکل اکیلی واک کے لیے جھیل کنارے چلی گئی۔

''یہ ایک ایسی رات تھی جس کے بارے میں ہم پریوں والی کہانیوں میں پڑھتے ہیں۔ آسمان کے بالکل بیچ میں، پورا چاند کھلا ہوا تھا۔ اونچے اونچے پہاڑ، اپنے برفیلے اوج کے ساتھ ایسے دکھائی دیتے تھے جیسے انہوں نے چاندی کے تاج پہنے ہوں؛ جھیل کے پانیوں میں، ننھی چمکتی لہروں کے ہلکورے چمک رہے تھے۔ ہوا بہت خوشگوار تھی، ایک چھپنے والی گرمی کے ساتھ جو ہمیں کمزور کر دیتی ہے جبکہ ہم بظاہر کسی وجہ کے بغیر کسی چیز کے شدید زیر اثر بے ہوش ہونے والے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ کیسا احساس ہے، ایسے لمحوں میں، دل کیسے دھڑکتا ہے اس کی کتنی تیز دھڑکن ہوتی ہے اور اس کے جذبات کتنے شدید ہوتے ہیں!

''میں نیچے گھاس پہ بیٹھ گئی اور اس وسیع، اداس اور دل موہ لینے والی جھیل کو دیکھا اور ایک عجیب سا خیال میرے ذہن میں آیا۔ محبت کی پیاس کی نہ بجھنے والی چاہ نے مجھے جکڑ لیا، یہ میری زندگی کی غمگین سستی کے خلاف میرے رویے کی تبدیلی تھی۔ کیا! یہ میری قسمت میں کبھی نہیں ہوگا کہ میں بانہوں میں بانہوں لے کر گھوموں، ایک ایسے شخص کے ساتھ جس سے میں محبت کرتی

ہوں، اس جھیل کنارے کے ساتھ ساتھ جس کو چاند کی کرنیں چومتی ہیں۔ کیا میں اپنے لبوں پہ کبھی بھی ٹھہرے، دل کش اور مدہوش کر دینے والے بوسوں کو محسوس نہیں کر سکتی؟ جن کا تبادلہ محبت کرنے والے لوگ راتوں کو کرتے ہیں، رات جسے خدا نے اسی پیار اور چاہت کے لیے بنایا ہے۔ کیا میں کبھی بھی گرم جوشی کو، گرمیوں کی راتوں کو چاندنی کے سایوں میں پگھلا دینے والی محبت کو نہیں جان پاؤں گی؟

''اور میں ایک پاگل عورت کی طرح پھوٹ پھوٹ کے رو پڑی۔ مجھے اپنے پیچھے کچھ چیز حرکت کرتی محسوس ہوئی۔ وہاں ایک شخص کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ جب میں نے اپنا چہرہ پیچھے کی جانب موڑا، وہ مجھے پہچان گیا اور میری جانب بڑھتے ہوئے کہا:

''میڈم، کیا آپ رو رہی ہیں؟''

''یہ ایک نوجوان بیرسٹر تھا جو اپنی ماں کے ساتھ کہیں جا رہا تھا اور جیسے ہم اکثر ملتے رہتے تھے۔ اس کی آنکھیں متواتر مجھے دیکھ رہی تھیں۔

''میں بہت گھبرا گئی کیونکہ مجھے کچھ سوجھ نہیں رہا تھا کہ میں اسے کیا جواب دوں یا اس صورت حال کے بارے میں کیا کہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں بیمار ہوں۔''

''وہ میرے پہلو میں، عزت دار اور عام سے انداز میں ساتھ ساتھ چلنے لگا اور میرے ساتھ گفتگو شروع کر دی کہ میں نے اس سفر کے دوران کیا کیا دیکھا تھا۔ جو سب کچھ میں نے محسوس کیا تھا، اس نے وہ سب الفاظ میں ترجمہ کر دیا؛ جو جو سنسنی مجھے اس سفر میں ملی، وہ اسے مکمل طور پہ سمجھ گیا، مجھ سے بھی زیادہ اچھے انداز میں، جو میں نے خود محسوس کی تھی۔ اور بالکل اچانک ہی، اس نے الفریڈ ڈی موزے کے کچھ اشعار پڑھے۔ ایک ناقابل بیان جذبے کے زیر اثر، مجھے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ مجھے ایسا دکھائی دیا جیسے کہ سارے پہاڑ، جھیل، چاندنی، سب کچھ ان تمام ناقابل بیان خوبصورتی کے بارے مجھ سے گا رہی تھیں۔

''اور ایسا ہی ہوا، مجھے نہیں معلوم کیسے، مجھے نہیں معلوم کیوں، ایک قسم کے ہذیان میں ہی سب کچھ ہو گیا اور اس کے لیے۔ میں نے اسے دوبارہ اس کے رخصت کی صبح تک نہیں دیکھا۔ اس نے مجھے اپنا کارڈ دیا!''

اور اپنی بہن کی بانہوں میں ڈوبتے ہوئے، میڈم لیٹورآ ہوں میں ڈوب گئی جو کہ بعد میں چیخوں میں بدل گئی۔

پھر میڈم روبیر نے سنجیدہ اور ٹھہری آواز میں، بہت نرمی سے اسے کہا:

''دیکھو بہن، اکثر اوقات یہ مرد نہیں ہوتا جس سے ہم محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں لیکن یہ بذات خود محبت ہوتی ہے۔ اور تمہاری حقیقی محبوب، اس رات کو چاندنی تھی۔''

☆☆☆☆☆

سیلِ وقت

آفتاب محمود

''پُورو! اری او پورو''

''ارے کہاں گئی اللہ ماری- یہ لڑکی بھی عجیب ہے جب دیکھو پیپل کے درخت کے نیچے اپنی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی ہوگی، نہ کام کاج کا خیال نہ دنیا کی خبر''-

پورو کی اماں اجو بیگم نہایت ہی دراز قد اور بارعب عورت تھی- وہ اکثر پورو کی ڈانٹ ڈپٹ کرتی رہتی تھی-

''آئی اماں (باغیچے سے پورو نے منہ بسورتے ہوئے باآوازِ بلند کہا)-(پورو ننگے پیر دوڑتی ہوئی گھر کے اندر آتی ہے) ارے تجھے اس فضول کام سے فرصت ہے کہ نہیں، کچھ گھر کا کام کاج بھی کر لیا کر (اجو بیگم نے دبدبے لہجے میں کہا)-

''کرتی ہوں کام اماں، ابھی تو گئی ہوں (پورو نے منہ بسورتے ہوئے کہا)،''ارے خاک کرتی ہو، جب دیکھو گڑیا، گڑیا، گڑیا---- کوئی کام ہے تجھے کہ نہیں-''

''اچھا بتائیں کیا کام ہے'' (پورو نے محبت بھرے انداز میں کہا)

''وہ اپنی شکیلہ ہے نا اس کو میں نے سرسوں کے ساگ کا کہا تھا، وہ لے آ''

چاچی شکیلہ کے گھر کا نام سنتے ہی پورو کے چہرے پر ایک خوشنما مسکراہٹ پھیل گئی-

''ٹھیک ہے اماں، ابھی لائی''

یہ کہتے ہوئے پورو نے حسبِ معمول دوڑ لگا دی- ''ارے جوتی تو پہن کر جا، کانٹا چبھے گا، ہائے اللہ اس لڑکی کا میں کیا کروں، ہرنی کی طرح دوڑتی پھرتی ہے-''

پورو چاچی شکیلہ کے گھر پہنچی تو وہاں بھی اودھم مچا دیا- ''چاچی راجو کہاں ہے-'' (پورو نے تجسس بھرے لہجے میں کہا)

''بیٹی وہ تو دوستوں کے ساتھ باہر گیا ہوا ہے، ابھی آتا ہی ہوگا-''

راجو اور پورو بچپن ہی سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں- پرائمری تک ایک ہی اسکول میں پڑھنے سے ان کی کافی جان پہچان ہوگئی تھی، پھر دیکھتے ہی دیکھتے یہ جان پہچان کسی اور جذبے میں ڈھل گئی- اب ان کا آپس میں آنا جانا لگا رہتا-

ایف ایس سی کرنے کے بعد راجو کو اس کے گھر والے شہر بھیج رہے تھے- پورو کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ اداس اداس رہنے لگی، نجانے کیوں اس راجو کے بچھڑنے کا غم کھائے جا رہا تھا-

پورو ہجولیوں کے ساتھ کنویں پر پانی بھرنے

گئی تو راجو سے ملاقات ہو گئی، اس نے راجو کو دیکھتے ہی رستہ بدل لیا۔ راجو کو پورو کے اس رویے کا بہت تعجب ہوا۔

''پورو! او پورو، کیا ہو گیا ہے تجھے، یوں رستہ بدلنے کی وجہ؟''

پورو رک گئی مگر اس نے راجو کی طرف نہ موڑا۔ راجو اس کے قریب گیا، جب پورو نے اپنی آنکھیں اُٹھائی تو اس کی آنکھیں کسی لبریز پیمانے کی طرح چھلک رہی تھیں۔

''ارے پورو، تو تو رو رہی ہے، کیوں کیا ہوا (راجو نے سنجیدگی سے کہا)۔

''سنا ہے تم شہر جا رہے ہو۔''، (پورو نے اپنے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا)۔

''ہاں تو اس میں رونے کی کیا بات ہے، (راجو نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا)۔

میں پکا پکا تھوڑی جا رہا ہوں، میں تو پڑھنے جا رہا ہوں تاکہ مزید تعلیم حاصل کر کے کسی منزل پر پہنچ سکوں، اور اس کے بعد تمھیں اپنی دلہن بنا سکوں۔ (پورو نے شرماتے ہوئے منہ دوسری جانب کرلیا)، ''اور اگر تم شہر جا کر وہاں کی رونقوں میں کھو گئے اور دوبارہ واپس نہ آئے تو پھر میرا کیا بنے گا۔''

''ارے پگلی ایسی باتیں نہ سوچا کر، بس تم دیکھنا یہ چند سال پلک جھپکتے گزر جائیں گے اور میں ایک کامیاب انسان بن کر گاؤں لوٹوں گا، اور پھر تمھیں اپنی دلھن بناؤں گا، کتنا حسین خواب ہے نہ پورو۔''

''ارے یہ تیری ناک پر زخم کیسا ہے۔۔۔؟، لگتا ہے چاچی نے تیری پھر پھنائی کی ہے،'' (راجو نے پورو کو چھیڑتے ہوئے کہا)۔ (پورو مسکرائی تو اس کی آنکھوں کے آنسوؤں میں چمک سی پیدا ہو گئی، اور اس کی پلکیں ستاروں کی طرح جگمگانے لگے)۔۔ ''ارے نہیں پگلے، یہ تو کل میں نے ماسی نظیرہ سے ناک چھیدوائی ہے، اس کا زخم ہے۔''

راجو نے جب غور سے دیکھا تو پورو کی ناک میں سفید دھاگہ بہت ہی خوبصورت دکھائی دے رہا تھا، ''کیا ماہتاب جیسا چہرہ ہے'' (راجو نے دل میں کہا)۔ ''پورو تمھیں پتہ ہے مجھے تمھاری یہ سادگی بھری ادائیں بہت پسند ہیں، تمھاری چہرہ بغیر بجے سنورے کسی پری کی طرح لگتا ہے، میں جب اپنی پڑھائی مکمل کر کے واپس آؤنگا تو تمھارے لیے سونے کی نتھنی لاؤں گا۔ پھر تم اسے عمر بھر اپنی ناک میں پہنے رکھنا ہاں''۔ راجو کی اس بات پر پورو شرما گئی اور بھاگتی ہوئی کھیتوں کے پار چلی گئی۔

راجو کو دو دن بعد شہر جانا تھا، اپنوں سے جدائی کا غم اسے کھائے جا رہا تھا، لیکن پھر دل کو دلاسا دیا کہ یہ رسم دنیا ہے۔ انسان کو

آخر فکرِ معاش میں اپنا گھر چھوڑنا پڑتا ہے۔
پھر وہ دن بھی آ گیا جب راجو سب سے رخصت لے کر ریلوے سٹیشن پہنچا، ریلوے اسٹیشن پر سناٹا تھا، دور دور تک بنی آدم کا نام ونشان نہ تھا۔ دسمبر کی سیلی خنکی سے فضا جم رہی تھی۔ راجو قریبی بینچ پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسٹیشن کی ایک طرف سے پورو نمودار ہوئی، راجو نہایت ہی حیرانگی کی حالت میں بینچ سے اٹھا اور پورو کی جانب دھیمے قدموں سے بڑھنے لگا۔ پورو کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔
''ارے پورو تم یہاں، اتنی رات گئے تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' (راجو نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا)۔ راجو تم شہر جا کر بھول تو نہ جاؤ گے۔ دراصل سدرہ (پورو کی سہیلی) مجھے کہہ رہی تھی کہ گاؤں کے لڑکے شہر جا کر وہاں کے سحر میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اپنوں کو بھول کر وہاں کی زندگی میں مگن ہو جاتے ہیں، تم ایسا تو نہیں کرو گے نہ راجو'' (پورو نے غمگین لہجے میں کہا)۔
راجو نے پورو کو تسلی دی کہ ایسی فضول باتوں کو دماغ میں جگہ نہ دے۔ وہ ایک دن ضرور واپس آئے گا اور اپنی پورو کو اپنا لے گا۔
دور سے گاڑی کی آواز سنائی دی تو پورو کا دل زور سے دھڑکنے لگا۔ راجو نے پورو کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا: ''اب چلو اپنے گھر جاؤ اور چاچی کو تنگ نہ کرنا ہاں'' (پورو زیرِ لب مسکرائی تو اس کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی)۔
پورو بھی راجو کے جانے کے ایک سال بعد اپنے چچا کے ہاں لاہور چلی گئی، پورو کے چچا ہائی کورٹ کے وکیل تھے اور شہر بھر میں ان کی کافی چلتی تھی۔ پورو ان کے ساتھ رہتے رہتے ان میں گھل مل گئی۔
راجو یونیورسٹی میں دل لگا کر پڑھتا رہا، اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس تھا اور وہ اسے بہ خوبی نبھا رہا تھا، یونیورسٹی میں اس کے کافی دوست تھے جن میں لڑکیاں بھی شامل تھیں، لیکن شہر کی لڑکیاں راجو کو اچھی نہیں لگتی تھیں۔ ان کے انداز، بننا سنورنا اور لڑکوں سے کھلی گفتگو کرنا، یہ سب راجو کو اچھا نہیں لگتا تھا، اس کا ماننا تھا کہ عورت حیا کا دوسرا نام ہے اور جب عورت میں حیا اور پردہ نہ رہے تو وہ عورت کہلانے کی مستحق نہیں رہتی۔
جب وہ پورو کے بارے سوچتا تھا تو فخر محسوس کرتا اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ کتنی سادہ، خوش لباس، گفتگو میں شائستگی۔ پورو جب سفید لباس پہن کر گاؤں کے کھیتوں میں بھاگتی پھرتی تو جنت کی حور معلوم ہوتی۔
راجو جب رات کو سونے لگتا تو ایک مرتبہ اس

نتھنی کو ضرور دیکھتا جو اس نے شہر کے مشہور سنار سے پورو کے لیے بنوائی تھی۔ وہ اسے دیکھتا تو عجیب خوشی محسوس کرتا۔

وقت گزرتا گیا اور پورے دس سال بیت گئے۔ راجو اپنی تعلیم مکمل کر کے گاؤں لوٹ آیا۔ دنیا پور اسٹیشن پر اترا تو اسے گاؤں کے کھیت دکھائی دیے۔ سرسوں کے پھول لہلہاتے ہوئے کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں (اس نے دل میں کہا)، پھر وہ گھر کی طرف گامزن ہوا۔ گاؤں کی سب ہی چیزیں ویسی کی ویسی تھیں جیسی وہ چھوڑ کر گیا تھا، گاؤں کے کھیت، بیل بوٹے، کھیتوں میں ٹریکٹر چلنے کی آواز سب کچھ ویسے کا ویسے تھا، ایسا لگتا تھا جیسے اس کے جانے کے بعد زندگی منجمد ہو کر اب دوبارہ چل پڑی ہو۔

تین دن کے بعد بڑی عید تھی اور پورو کے چاچو گاؤں آ رہے تھے، راجو کو جب پتا چلا تو اس کی خوشی کی انتہا نہ رہی، اس کی آنکھوں کے سامنے پورو کی تصویر بن گئی اور لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

جس دن پورو نے آنا تھا راجو دو گھنٹے پہلے اسٹیشن پہنچ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دو گھنٹے بھی پورو کی یاد میں گزر گئے۔

دور سے گاڑی کی آواز سنائی دی، راجو اسٹیشن کی دوسری سمت گیا تو اسے دور سے گاڑی آتی دکھائی دی، اس نے اپنی مٹھی کھولی اور ایک نگاہ سونے کی نتھنی پر ڈالی اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

جب گاڑی رکی تو راجو پاگلوں کی طرح ہجوم کو چیرتا ہوا ادھر ادھر بھاگنے لگا۔ اس کی آنکھیں پورو کو دیکھنے کی تمنائی تھیں۔

اچانک پورو کمپارٹمنٹ کے دروازے سے نمودار ہوئی، راجو کی آنکھیں اس کو دیکھ کر دنگ رہ گئیں، اس کے قدم جیسے بھاری ہو گئے تھے، وہ بوجھل قدموں کے ساتھ پیچھے کو ہٹتے ہوئے بینچ پر بیٹھ گیا۔ پورو کی گھٹاؤں جیسی زلفیں شانوں پر پھیلی ہوئی تھیں، ہونٹوں پر گہری لپ اسٹک اور پاؤں میں پھٹی جوتی کے بجائے اونچی ایڑھی والے سینڈل تھے۔ راجو بوجھل قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھا اور قریب پہنچ کر تھرتھراتے ہونٹوں کے ساتھ کہا: ”پورو کیسی ہو“، پورو نے آنکھیں اٹھائی تو تعجب سے کہا: ”آئی ایم سوری، میں نے آپ کو پہچانا نہیں، راجو کو چاروں طرف اندھیرا محسوس ہونے لگا اور اس کے پلکوں پر ستاروں کے جھرمٹ چمکنے لگے۔ راجو نے جب پورو کے چہرے پر گہری نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ اس کے ناک کا چھید اب بند ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆

احمد حسن [خاکہ]

زندگی میں کچھ لوگ خوشبو کی مانند ہوتے ہیں جو نظر نہیں آتی لیکن فضا میں اپنی موجودگی اور احساس دلاتی رہتی ہے۔ احمد حسن صاحب المعروف حسن بھائی المعروف حسن جم والے کی شخصیت بھی ایسی تھی۔ ہمارا ان سے پہلا واسطہ ساتویں یا آٹھویں جماعت میں ہوا جب گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم نے کراٹے کی کلاسز لینے کا فیصلہ کیا۔ ہم اس وقت بالکل کمزور اور مہین تھے اور کانگڑی پہلوان کہلاتے تھے۔ سکول میں سارے لوگ ہمارا مذاق اڑاتے تھے اس لیے ہم نے سوچا کہ کراٹے کی کلاسز لے کر ہم اپنے جسم کو مضبوط اور توانا بنالیں۔ اسی مقصد کو لیے ہم حسن جم اور کراٹے سینٹر پہنچ گئے۔ جہاں حسن بھائی کی صورت میں ایک ہٹا کٹا انسان بیٹھا تھا۔ چھ فٹ دو انچ قد، چوڑا سینہ، بھری بھری ٹانگیں، مضبوط ڈیل ڈول اور بڑے بڑے ہاتھ، رنگ سفید اور گنجا سر، ایسا لگتا تھا کہ ابھی دبوچ کر مار ہی نہ دیں۔ لیکن لبوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ لیے حسن بھائی نے ہم کو خوش آمدید کہا اور ہمارا ان کے ساتھ ایک تعلق بن گیا اور ہم نے باقی کارروائی کے بعد کراٹے کی کلاسز لینا شروع کر دیں۔ کراٹے کی کلاسز میں نیئر بھائی اور بروسلی سینئر (اصل نام یاد نہیں) ہوتے تھے جو حسن بھائی کو کلاس چلانے میں مدد دیا کرتے تھے۔

کراٹے کی کلاس بڑے زور وشور سے کی جاتی اور کاشن دِیئے جاتے تھے؛ اچی، نی، سن، شی، گا، ہک، سچ، رک، زو۔ گرمیوں میں جب پسینہ بہت زیادہ آ جاتا اور انسان گرنے لگتا تو آپ سب پر پانی ڈالتے تاکہ انسان نڈھال ہو کر گر نہ جائے۔ اس طرح کلاس جاری رہتی۔ ہم نے بمشکل تین ماہ کراٹے کی کلاس لی لیکن جسم میں توانائی اور پھرتی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ کراٹے کلاس میں صرف کلاس نہیں ہوتی بلکہ مختلف قسم کے کھیل بھی کھیلے جاتے تھے تاکہ بچوں میں دلچسپی برقرار رہے۔ ایک کھیل ایسا تھا جس کو گھوڑی گھوڑی کہتے ہیں۔ ایک ٹیم گھوڑی بنتی اور دوسری ٹیم دور سے بھاگتے ہوئے آتے اور گھوڑی پر سوار ہوتے۔ اگر سوار کے پاؤں نیچے زمین پر لگ جاتے تو وہ ہار جاتے۔ اس کھیل میں اکثر ہم اپنی ٹیم کے ہارنے کا باعث بنتے کیونکہ نہ ہم میں پھرتی تھی نہ توانائی کہ ہم دوڑ لگا کر لمبی چھلانگ مار کر آگے جاسکیں۔ اس لیے ہمیں آخر میں بھیجا جاتا اور ہم سوار ہونے کے بجائے زمین پر آ گرتے اور اپنی ٹیم کو لے ڈوبتے۔ تین ماہ کی کلاس کے بعد ہم کراٹے سینٹر کو چھوڑ گئے لیکن حسن بھائی کی خوشبو ہمارے ساتھ رہی۔ پھر چار پانچ سال کے بعد جب ایف ایس سی کے بعد ہمارا وزن بے پناہ بڑھ گیا تو ایک بار پھر ہم نے

محمد کلیم

حسن جم کا رخ کیا۔ اس دفعہ ہم نے ڈمبل اٹھانے کا سوچا کہ شاید کچھ افاقہ ہو۔ حسن بھائی نے ایک مرتبہ پھر ہم کو اپنی دلکش مسکراہٹ کے ساتھ خوش آمدید کہا بلکہ کرائے کا حصہ بننے کی وجہ سے جو جم کی معمولی سی فیس تھی اس میں بھی کمی کی کیونکہ ہم جم کے "اولڈ بوائے" جو تھے۔ جم کیا تھا لوہے کا بازار تھا۔ حسن بھائی نے جم اپنے ہی گھر کے نچلے حصہ میں بنا رکھا تھا جبکہ رہائش اوپر کے حصہ میں تھی۔ جم کی تمام مشین حسن بھائی نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ کوئی مشین بھی باہر سے نہ خریدی گئی تھی بلکہ اس کو خود تیار کیا گیا تھا۔ لیکن دیسی لوہا ہونے کے باوجود تمام مشینوں کے زاویے بالکل درست تھے جیسے کہ کسی مکمل سائنسی انداز میں بنائی گئی ہوں۔ حسن بھائی کھانے پینے کے شوقین تھے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ وہ چار بندوں کا کھانا اکیلے کھا جاتے تھے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا قد بت بھی ہم جیسے دو بندوں کے برابر تھا۔ پانچ وقت کے نمازی، روزے کے پابند، جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تو اتنی خشوع وخضوع سے نماز پڑھتے کہ لگتا کہ اللہ سے ملاقات کر رہے ہیں۔ وہ طاقت کا سرچشمہ تھے لیکن آج تک ہم نے ان کو کسی سے بھی اونچی آواز میں بات کرتے نہیں سنا اور نہ جھگڑتے دیکھا، بس چہرے پر ہلکا سا تبسم ہر وقت موجود رہتا۔ وہ تین بھائی تھے، احمد حسن، کاکو اور چاند۔ وہ اپنے بھائیوں کو انہی ناموں سے پکارتے تھے اس لیے جم کا ہر فرد بھی یہی نام لیتا تھا۔ ان کے اصل نام ہمیں معلوم نہیں نہ ہم نے معلوم کرنے کی کوشش کی۔ کاکو جو کہ بے روزگار تھا اس کے لیے حسن بھائی نے اپنی والدہ کے کہنے پر اپنا بنا بنایا جم چھوڑ دیا اور دوبارہ نئے سرے سے ایک نیا جم بنایا جو کہ پرانے حسن جم سے ایک گلی چھوڑ کر تھا اور اس کا نام "احمد حسن جم" رکھا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ جم ایسا آباد ہوا کہ اس نے مقبولیت کے سارے ریکارڈ توڑ دیئے اور احمد حسن جم پر لڑکوں کا ایک جم غفیر دکھائی دیتا تھا۔ ہم بھی حسن بھائی کے ساتھ ان کے نئے جم آ گئے اور وہاں ورزش کرنا شروع کی۔ حسن بھائی نے ہم کو ڈمبل پکڑنا سکھایا، ورزش کرنے کے آداب بتائے بلکہ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ اتنی زیادہ طاقت کے باوجود بھی آپ کیسے اپنے آپ کو کنٹرول میں رکھ سکتے ہیں بلکہ ورزش آپ کو طاقت نہیں بلکہ اپنے آپ پر قابو سکھاتی ہے۔ ہم کو بارہ تیرہ سال ہو گئے ہیں کہ ہم بسلسلہ روزگار شہر سے باہر آباد ہیں لیکن آج تک حسن بھائی کی صورت اور سیرت نہیں بھولے۔ کچھ ملاقاتیں ہوئی لیکن کہتے ہیں کہ آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل۔ آج سے کچھ دن پہلے حسن بھائی کی موت کا معلوم ہوا کہ وہ ٹائیفائیڈ کی وجہ سے ہم کو چھوڑ گئے ہیں تو دل میں ایک سوال پیدا ہوا کہ اچھے لوگوں کی زندگی اتنی مختصر کیوں ہوتی ہے۔

☆☆☆☆☆

گرم ستار [خاکہ]

مجھے فخر ہے کہ اردو کے طفیل میں نے رزق کے ساتھ ساتھ دوست اور شاگرد بھی کمائے ہیں جو بفضل خدا ملک کے طول وعرض میں درس وتدلیس کے مقدس پیشے سے وابستہ ہیں اورنونہالان وطن کو ہونہاران وطن بنانے کے کارخیر میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ انہی میں سے ایک گرم ستار بھی ہیں۔

جب ہم پہلے پہل جامعہ پشاور کے شعبہ اردو میں داخل ہوئے تو وہاں کا ادب پرور اور اردو پرور ماحول، ڈاکٹر صابر کلوروی، ڈاکٹرظہوراحمد اعوان، ڈاکٹر نذیر تبسم جیسے اساتذہ کا رعب اور پھر وہاں کے بعض خوانین کے ساتھ خواتین کا فرفر اردو بولنا، اس طرح کے حالات میں ان کے ساتھ اردو میں بات کرنے کا یارہ کسے تھا اور ان سے ہم کلام ہونے کی جرأت کس میں تھی؟

میں نے چونکہ بی اے میں سب سے زیادہ نمبرات لے کر وہاں قدم رنجہ فرمایا تھا اور ٹیسٹ وانٹرویو میں ٹاپ کرنا اس پہ مستزاد، لیکن پہلے ہی دن جب تعارف کرانے کا مرحلہ آیا تو میں گاؤں کا سیدھا سادہ بلم جسے پہلی دفعہ اردو میں اپنا تعارف کرانے کا موقع ملا تھا، پسینے چھوٹنے لگے اور دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اپنا تعارف کرایا۔

لیکن پہلو میں بیٹھے ہوئے ایک نحیف و نزار قسم کے نوجوان نے بڑے اطمینان کے ساتھ کہا

”سر! میرا نام گرم ستار ہے، میرے والد محترم کا اسم گرامی دیار خان ہے اور میں نے لاہور کالج سے بی اے کیا ہے“

اس طرح کا شائستہ تعارف سن کر میرے ساتھ باجو میں بیٹھے سید شیر اور زاہد حسین (جن کی حالت مجھ سے چنداں جدا نہیں تھی) کو پکا یقین ہوگیا کہ اس نے ضرور لاہور (پنجاب) کے کسی کالج سے بی اے کیا ہے۔

کلاس سے باہر آ کر ہم اپنی گلابی اور بے ترتیب اردو کی وجہ سے ایک دوسرے سے آنکھیں چرا رہے تھے، گوہر زمان (جو پکا پشوری تھا اور فٹ بال کا بہترین کھلاڑی بھی تھا کیونکہ وہ

گوہر رحمان نوید

بعد میں پاکستانی ٹیم کا کپتان بھی بن گیا تھا) نے اس سے استفسار کیا کہ آپ نے تو ہمیں بتایا تھا کہ آپ کا تعلق صوابی یار حسین سے ہے اور اندر جا کر آپ نے کہا کہ میں نے لاہور کالج سے بی اے کیا ہے۔ اس طرح کی غلط بیانی کی کیا ضرورت تھی۔؟

اس پر وہ باچھیں پھیلا کر بولے

''نہیں جی میں نے غلط بیانی کب کی ہے، واقعی میں نے چھوٹا لاہور صوابی کے کالج سے بی اے کیا ہے،،

یہ سن کر ہم سب ہنس پڑے اور یہیں سے ہماری بے تکلف دوستی کی شروعات ہوئیں۔

اردو ڈیپارٹمنٹ میں زاہد حسین ان کو شرم ستار کہہ کر پکارتے تھے کیونکہ کلاس کی سی آر شپ سے لے کر شعبے کی دوسری سرگرمیوں تک میں وہ بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہر جگہ منہ اٹھا کر چلے جاتے اور سر جھکا کر واپس آ جاتے۔ اکثر تقاریب میں وہ یہ کہہ کر مجھے بھی بن بلائے مہمان بنا کر لے جاتے کہ ہاسٹل کے کمرے میں بے کار پڑے رہنے اور اونگھنے سے بہتر ہے کہ باہر جا کر کسی تقریب میں اور نہیں تو کم از کم چائے اور سموسوں سے تو محظوظ ہو جائیں گے۔ یہی سبب تھا کہ یونی ورسٹی کے اندر اور باہر شہر بھر کی تقریبات کا شیڈول ان کے پاس محفوظ ہوتا۔ کبھی خانہ فرہنگ ایران تو کبھی آرکائیوز لائبریری، کبھی نشتر ہال تو کبھی شیر پاؤ ہال یا سینٹ ہال، یہاں تک کہ رات گئے مساجد میں ہونے والی محافل اور میلاد شریف بلکہ مجلس عزا میں بھی گھس کر پیٹ پوجا کرانے کو انھوں نے اپنی اولین ترجیحات میں رکھا ہوا تھا۔

جیسے ہی انھوں نے شعبہ اردو سے فراغت کی ڈگری حاصل کی انھیں اپنے والد محترم دیار خان (مرحوم) کے نام پر فاؤنڈیشن اور لائبریری بنانے کا خیال چرایا۔ فاؤنڈیشن کی سمجھ تو ہمیں اسی وقت آ گئی تھی کی موصوف اپنے سورگ باشی والد محترم کے نام اور مقام کو زندہ جاوید بنانا چاہتے ہیں لیکن لائبریری بنانے کا عقدہ ہم پر بہت بعد میں کھلا۔ کہ دراصل وہ مختلف لوگوں اور اداروں سے کتابیں اکٹھی کرنے کے ساتھ ساتھ ان کتابوں کو آئینی اور قانونی حیثیت دینے کے لیے یہ کار خیر سرانجام دے رہے ہیں جو انھوں نے شعبہ اردو کی لائبریری اور یار دوستوں سے چرائی ہیں اور ان کو باہر صرف اسی صورت میں منظر عام پر لایا جا سکتا ہے کہ ان پر اپنی لائبریری کا ٹھپہ لگا دیا جائے۔

وہ اپنی اس کوشش میں بڑی حد تک کامیاب رہا اور قلیل عرصے میں کتابوں کا ایک اچھا خاصا ذخیرہ جمع کر لیا لیکن عرصہ دراز سے ہم نے ان کتابوں کا منہ تک نہیں دیکھا اور نہ ہی کسی محقق کو اس سے استفادہ کرتے سنا ہے اس لیے یقین واثق ہے کہ یہ کتب آج

کل کیڑوں کی خوارک کے طور پر کام آرہی ہیں۔
ان کا سافٹ وئیر تو جنم دن سے ہی آپ ڈیٹ ہو چکا تھا کیونکہ وہ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ ہیں جس نے قیام پاکستان میں اہم کردار ادا کیا تھا اور بابائے قوم اور پاکستان سے لو لگا رکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انبار کے ایلیمینٹری کالج میں پی ٹی سی ٹریننگ کے دوران جب انھیں جناح کیپ (جو وہاں کے یونی فارم کا حصہ ہوا کرتا تھا) دیا گیا تو دوسرے طلبہ کے برعکس انھوں نے بغیر کسی تذبذب کے اسے زیب سر کرلیا اور وہ جناح کیپ آج تک ان کے پاس ایک متاع عزیز کے یادگار کے طور پر موجود ہے۔
لیکن زیست کی نصف صدی گزارنے والا یہ لمبا تڑنگا اب ضعیف العمری میں جوانی دیوانی کے مزے لوٹنے اور اپنے ہارڈ ویئر کو اپ ڈیٹ کرنے کے لیے مختلف حکیموں سے مسلسل رابطے میں رہتے ہیں۔ اپنی قوت باہ کو آہ سے بچانے اور جنس مخالف کی زبان سے واہ نکالنے کے لیے وہ ایلو پیتھک کے ساتھ ہومیو پیتھک دواؤں کے کرشموں کے بھی متمنی رہتے ہیں۔
ان کا چہرہ جو کسی زمانے میں سرخ و سفید ہوا کرتا تھا آج کل سفید چونسہ آم کی طرح لبوترہ ہو گیا ہے اور برائے نام واڑھی کی بہار بھی اس پر دکھائی دیتی ہے جو واڑھی کاٹ مشین کے ایک نمبر کی وجہ سے عرصہ دراز سے درازی کے لیے ترس رہی ہے۔
البتہ اس کا قدکاٹ غالب کے محبوب کے برعکس طرہ پر پیچ و خم کی عدم موجودگی کے باوجود ضرورت سے بہت دراز اور جسم ضرورت سے بہت دبلا ہے۔ اگر ان کے جسم کے مستطیل کا احاطہ معلوم کیا جائے اور اس کی لمبائی کو چوڑائی سے ضرب دیا جائے اور پھر اس میں دو جمع بھی کیا جائے تو حاصل جمع صفر ہی آئے گا۔ پلیٹ پر ہر وقت نظر جمانے اور بے دریغ کھانے کے باوجود ان کے پیٹ کے جغرافیائی خدوخال اور طول و عرض جوں کے توں ہیں اور آج کل موٹاپے کی شکایتوں سے بے نیاز چینی، نمک، گھی اور ہر طرح کی مرغن غذاؤں سے لذت کام و دہن میں ہر وقت مگن رہتے ہیں۔
شاید اردو کی تہذیب اور مطالعے کا اثر ہے کہ تعصب ان کو چھو کر بھی نہیں گزرا ہے اور احساس کمتری کا بخار انھیں کبھی نہیں چڑھا، ورنہ ان کے بعض کلاس فیلوز جو ان سے نصابی اور ادبی لحاظ سے بہت کم زور تھے، وہ لیکچرار اور پروفیسرز بن گئے اور موصوف آج تک نرے ٹیچر ہی رہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سب کے وجود کے ساتھ ساتھ ان کی حیثیت بھی دل و جان سے تسلیم کرتے ہیں اور رب کے عطا کیے ہوئے موجودہ کام

اور مقام پر صابر وشاکر رہتے ہیں۔
گرم ستار چونکہ ہر وقت گرم دم جستجو رہتے ہیں اس لیے بہت سے نوجوان بڑی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی طرف دست دوستی بڑھاتے ہیں اور وہ انھیں قبول کرنے میں بھی کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کرتے۔ لیکن جب سے نوجوان لڑکے لڑکیوں نے اپنے پروفائلز لاک کر کے فرینڈ ریکویسٹ بھیجنے کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے تو میری طرح وہ بھی شدید مخمصے کا شکار ہیں، چنانچہ ایک دن ترنگ میں آ کر بلکہ تنگ آ کر اس نے اپنے فیس بک وال پہ یہ خبر لگا دی کہ

''جن ساتھیوں کے کھاتے مقفل ہیں وہ ہرگز مجھے دوستی کی درخواست نہ بھیجیں''

اس پر پچاس کا پیرا عبور کیے ہوئے بعض من چلے بھی ترنگ میں آ گئے اور انھوں نے نیچے اپنے تبصروں میں لکھا کہ پیارے بھائی! اب بند تالوں کو کھولنے کا زمانہ لد گیا ہے اور آپ صرف بغیر قفل کے کھلے دروازوں والوں کے ساتھ ہی اپنی دوستی بغیر کسی نقصان (No profit no No loss) کے دوام دے سکتے ہیں۔

عیش میں اسے یاد خدا تو رہتی ہے لیکن کیش کی معاملے اس کی مٹھی ہمیشہ تنگ رہی اور انھوں نے حد سے زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا ہے جو بڑھتے بڑھتے کنجوسی کی شکل اختیار کر گیا ہے البتہ عالم طیش میں انھیں ہم نے بہت کم دیکھا ہے اور غصہ میں بھی وہ اناپ شناپ بکنے سے گریز کرتے ہیں اور یہی ان کی شخصیت کا سب سے بڑا وصف شمار کیا جا سکتا ہے جو آج کل انسانوں اور خاص طور پر ہمارے پختون بھائیوں میں خال خال پایا جاتا ہے۔

طبع حسرت کی طرح انھوں نے بھی ہر استاد سے فیض اٹھایا ہے اور اساتذہ بھی ایسے کہ ہر ایک اپنے اپنے میدان میں یکتائے زمانہ یعنی پروفیسر افضل رضا جیسا ڈراما نگار، اظہار الحق جیسا نفیس انسان، ڈاکٹر ظہور احمد اعوان جیسا قلم کا دھنی، ڈاکٹر صابر کلوروی جیسا محقق، ڈاکٹر نذیر تبسم جیسا بے بدل شاعر، ڈاکٹر سہیل احمد جیسا استاد اعظم اور ماؤں جیسی شفیق ڈاکٹر روبینہ شاہین کی قربت اور ڈاکٹر فاروق، عبدالسبحان خان، اکرام اللہ شاہد جیسے نامی گرامیوں کی صحبت نے انھیں وقار اور شائستگی کی ایسی دولت عطا کی کہ لہجے کی بے ہنری اور طریقہ وسلیقہ کی بے توقیری سے وہ کوسوں دور ہوئے اور اعلیٰ ظرفوں کی طرح جھک کے ملنا ان کی شخصیت کا حصہ بن گیا۔

ہمارے ہم جلسوں میں بہت کم ایسے ہیں جو جرأت گفتار کے ساتھ جرأت کردار کی دولت سے بھی مالا مال ہوتے ہیں اور ان کی گفتار لذت شوق سے بھرپور ہوتی ہے لیکن اس سنگل

پتلی کے انسان نے بہ یک سر کئی ہفت خوان طے کیے ہیں۔ دیار خان فاونڈیشن اور لائبریری کا ذکر تو پہلے ہو چکا ہے لیکن اس کے ساتھ انھوں نے حجرہ کے نام سے ادبی پرچہ جاری کیا، اسکول ڈیوئی کی، سینکڑوں شاگرد بنائے، ادبی تقاریب میں شرکت کو اپنا معمول بنایا اور کسی کتاب کی تقریب رونمائی میں کتاب یا صاحب کتاب کی شان میں پشتو میں نظم پڑھی جو قصیدے کی جدید شکل ہے، گاؤں اور علاقے کی سیاست اور ملک بھر کی سیاحت کی، دوستیاں پالیں اور دشمنیوں اور تعصبات کو ہنسی خوشی برداشت کیا اور شاداں و فرحاں رہے۔

اگرچہ علاقے کے سماجی، علمی اور تعلیمی سرگرمیوں کو عملی جامہ پہنانے میں ان کے بڑے بھائی فضل ستار اور کزنز پروفیسر ڈاکٹر افتخار یوسف زئی، پروفیسر ڈاکٹر حمایت اللہ، پروفیسر ڈاکٹر ہدایت اللہ اور پروفیسر شہر یار بھی ان کے دست و بازو بنے لیکن اس تعمیری تحریک کے اصل محرک بہر حال گرم ستار ہی رہے ہیں۔

ان کی طبیعت کی بے قراری اور شخصیت کی بے چینی انھیں ایک جگہ ٹک کے نہیں بیٹھنے دیتی، سفر کو اس نے وسیلہ ظفر سمجھنے کے ساتھ ساتھ جہاں نو کے دریافت کا ایک طریقہ بھی قرار دیا ہے، اس لیے ہمیشہ نئے زمانوں کے نئے صبح و شام اور نئے جہانوں کے جویا رہتے ہیں۔ ایک لحاظ سے اگر انھیں شعبہ اردو کے ابن بطوطہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ادبی تقریبات میں شرکت کے لیے پشاور اور اسلام آباد آنا جانا تو گویا یار حسین بازار کے چکر لگانے کے مترادف ٹھہرا ہے۔ سوات چترال کشمیر اور گلگت بلتستان کی خبر لانے میں بھی کوئی چیز ان کے راستے کی رکاوٹ نہ بن سکی۔ لاہور، کراچی اور کوئٹہ بھی ان کے قدموں کی دھول ہیں یہاں تک کہ سیما پار سے بھی ہو آئے ہیں۔

ان میں خرد افروزی بھی ہے اور جگر سوزی بھی، دوست احباب کے غم میں برابر کے نہیں بلکہ مکمل طور پر شریک ہوتے ہیں اور ان کی دعوتوں میں خوب کھاتے اور قہقہے لگاتے نظر آتے ہیں۔ جس سے ان کا تزکیہء نفس بھی ہو جاتا ہے اور تصفیہ نفس بھی۔ ہنگامہ فردا کے انتظار میں عمر گنوانے اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنے کو کسر شان سمجھتے ہوئے وہ اپنی تقدیر کے امروز کو روشن رکھنے کی تگ و دو کرتے ہیں۔

اردو اور پاکستان کی ترقی کے ساتھ ساتھ مادری زبان کو بھی اپنی تحقیق توانائی بخشتے ہیں اور اس کے تجوگ میں ایک سادھو کی طرح دھونی رمائے دن رات پڑے رہتے ہیں اور اسی تصور میں غرق رہتے ہیں۔

جب بھی دیکھا ہے تجھے عالم نو دیکھا ہے
مرحلہ طے نہ ہوا تیری شناسائی کا

☆☆☆☆☆

تاریخ کا ایک ورق

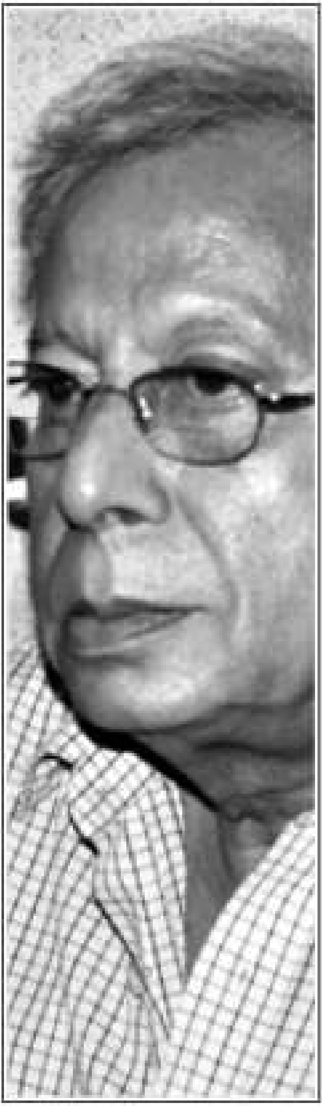

تیس برس گزرے

دل تاراج ہوئے

بے سر و تاج ہوئے

تیس برس گزرے

گھر کو آگ ہُوئے

ہنس کو کاگ ہوئے

تیس برس گزرے

رزق خاک ہوئے

قصہ پاک ہوئے

تیس برس گزرے

کتنے لایعنی

کتنے بامعنی

تیس برس گزرے

خالد احمد

شادمانی

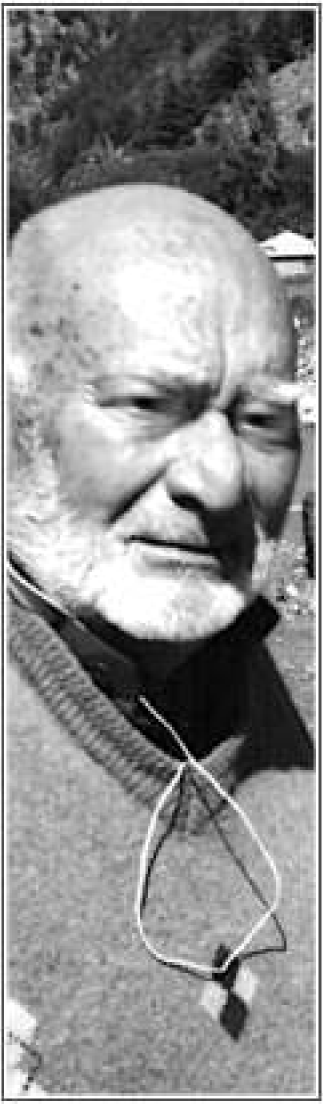

مری خدمت کی ثاقب شادمانی
یہ مہمانوں کو کتنی بھا گئی ہے
میری عزت کی خاطر آگئے سب
شرف وہ میزبانی کا مجھے دیں
انہیں لایا میں ''مٹی چھت'' مکاں میں
نشستِ بے تکلف چارپائی
بٹھایا ان کو تکیوں سے لگا کر
میں لایا ساگ اور مکئی کی روٹی
یہ کھانا کھایا سب نے خوش دلی سے
رکھا مشروب مٹی کے لگن میں
دیا پانی کٹورے بھر کے اُن کو

روایت تھی مرے گھر کی یہ ثاقب
چلے تو زیرِ لب تھی مسکراہٹ
میں ان کو دور تک دیکھا کیا ہوں
مری خدمت کی ثاقب شادمانی

آصف ثاقب

ہجرتی پرندے

آدمی بھی دیکھو تو ہجرتی پرندے ہیں
فرق ہے تو اتنا ہے
ہجرتی پرندے جب موسموں کی گردش سے
آشیاں بدلتے ہیں
جس طرح کے منظر ہوں، جس قدر ہو آسانی
پر سفر، کے رستے میں
آشیاں کی یادیں بھی ساتھ ساتھ رہتی ہیں
اور رُت بدلتے ہی گھر کو لوٹ جاتے ہیں

آدمی بھی کہنے کو ہجرتیں تو کرتے ہیں
اور اُن کے سینوں میں
لوٹنے کی خواہش بھی ہاؤ ہُو تو کرتی ہے
پر کوئی بھی آسانی جو جہاں میسّر ہو
اُس کی نرم محبت میں یوں قیام کرتے ہیں
جیسے یہ ہی منزل ہو
سفر کے بیچ ہو کے بھی
سفر کو بھول جاتے ہیں
دوستوں کی جانفزا سی محفلیں تو اک طرف
گھر کو بُھول جاتے ہیں

ہوا کا شور کیسا ہو
مگر جو بند ہو کھڑکی سنائی ہی نہیں دیتا
اندھیرا اتنا گہرا ہے
کہ آنکھیں ساتھ ہوں پھر بھی دکھائی ہی نہیں دیتا

اُسے معلوم ہے ہم پر
لگے الزام جھوٹے ہیں مگر زندان سے ہم کو
عجب ہے آج کا منصف، رہائی ہی نہیں دیتا

یہ ہم سے بھی زیادہ
زیست ہے فن کار کی مشکل
کہ جس کے حال کا نقشہ
کسی بیگار میں پکڑے گئے مزدور جیسا ہے
سوائے غم کی اور تحقیر کی دن بھر مشقت سے
یہاں کے ٹھیکے داروں سے
نہ پایا کچھ کبھی اُس نے

اور اُس کے منتظر بچے
ہمیشہ کی طرح سے بھوک سے لڑتے لڑاتے
ہار تھک کر سو گئے ہیں پھر
وہ اُن کو دیکھ کر روتا ہے آنسو خون کے لیکن
کبھی وہ اپنے جرموں کی صفائی ہی نہیں دیتا
کبھی گھر میں وہ دن بھر کی
کمائی ہی نہیں دیتا

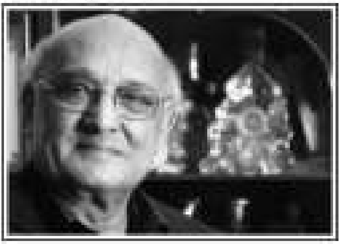

امجد اسلام امجد

میں، تُو اور وہ

میں کہ ناقد تری سیاست کا
اس سے انکار کر نہیں سکتا
ایک مقبول رہنما ہے تو
تو اثاثہ مرے وطن کا ہے
تجھ پہ ہے اعتماد لوگوں کا
تو نہ کھیلے اگر اصولوں سے
روز بدلے نہ زاویے اپنے
اور بھی چاہتیں ملیں گی تجھے
شرط ہے سچ کی رہ پہ رہنے کی
نہ کہ لمحوں کے ساتھ بہنے کی
تجھ سے جو اختلاف رکھتے ہیں
وہ بھی رہبر مرے وطن کے ہیں
ان کے بھی ساتھ لوگ ہیں جتنے
سب کی آنکھوں میں ہیں سجل سپنے
ایک دوجے کو گالیاں مت دیں
رہ کے حد بیچ اختلاف کریں
ایک آئین ہے سب اُس پہ چلیں
صرف اتنا کہیں جو کر پائیں
جب بھی تشکیلِ مجلسِ نَو ہو
جو بھی جمہور فیصلہ کر دے
صدقِ دل سے اسے سبھی مانیں
دو رُتوں درمیاں جو وقفہ ہے
اس میں جمتی ہے محفلِ تدبیر
سب چلاتے ہیں جس میں سوچ کے تیر
آزمائیں اُسی میں اپنا زور
اور ہر راستہ فقط شر و شور
ٹوٹنے دیں نہ امن و خیر کی ڈور
میں جو بولا تو اس لیے بولا
یہ جو لکھا تو اس لیے لکھا
میری تنقید بھی نہیں بے جا
اور امید بھی نہیں بے جا

جلیل عالی

گتھی

اِک عمر سے ہم اِس فکر میں تھے
اس گتھی کو سُلجھائیں ہم
اب عمر ہماری ختم ہوئی
پر فکر نہ اپنی ختم ہوئی

اِس عمر کا آخر حاصل کیا؟
اِس راہگذر کی منزل کیا؟
شاید اب اَور کوئی ہم سا
اِس گتھی کو سُلجھائے گا
یا وہ بھی ہماری طرح اِک دن
چُپ چاپ یونہی مرجائے گا!

یہ سارے جھمیلے دُنیا کے
یہ رونق میلے دنیا کے
ہیں کس کی خاطر؟ کس کے لئے؟

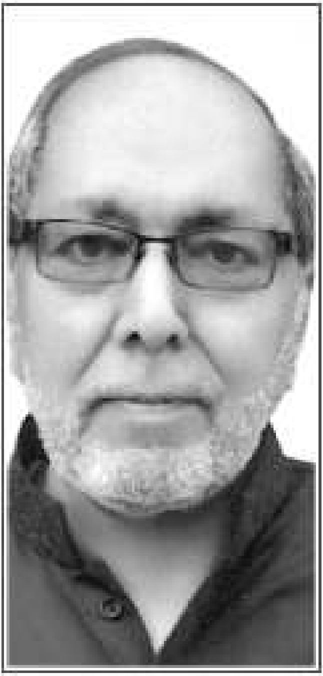

جو پھول اور پودے کھلتے ہیں
کھلتے ہیں وہ آخر کس کے لئے
بچھڑے ہوئے دو دِل ملتے ہیں
تو مِلتے ہیں آخر کس کے لئے؟

صوفی کو صِلہ کیا ملتا ہے
برسوں کی عبادت کرنے کا؟
عاشق کو بھلا کیا ملتا ہے
انعام محبت کرنے کا؟

اِک عُمر سے ہم اِس فکر میں تھے،
اس گتھی کو سُلجھائیں ہم

نسیم سحر

مختصر نظمیں

☆......رُخ......☆

وہ رُخ حالات میں رہنے لگے ہیں
کہ دِل خطرات میں رہنے لگے ہیں
بتائے کون غافل فاختہ کو
شکاری گھات میں رہنے لگے ہیں

☆......انا......☆

طبیعت میں انا کب تک رہے گی
رعونت کی فضا کب تک رہے گی
کہو کس بات پر پھولے ہوئے ہو
غبارے میں ہوا کب تک رہے گی

☆......تفو......☆

حسینی فکر کی بھی آرزو ہے
یزیدوں سے بھی تیری گفتگو ہے
سمجھتا ہے برابر خیر و شر کو
تفو ہے تجھ پہ اے انسان تفو ہے

☆......ہاتھی......☆

تمنائیں مسلتے جا رہے ہیں
ستم کرکے مچلتے جا رہے ہیں
ہمارا بخت ہیں پورس کے ہاتھی
جو اپنوں کو کچلتے جا رہے ہیں

☆......آنسو......☆

ستم بھی آزماتا جا رہا ہے
محبت بھی جتاتا جا رہا ہے
مگر مچھ کھا رہا ہے مچھلیاں
پھر آنسو بھی بہاتا جا رہا ہے

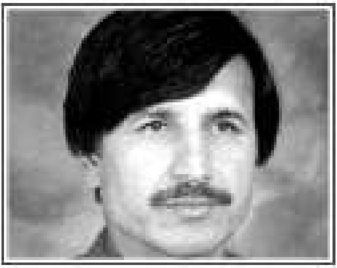

گلزار بخاری

خود کلامی

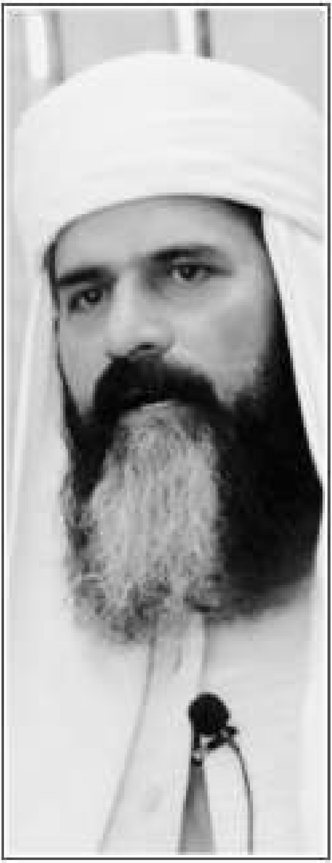

اُسے کہنا!

کہ راہوں میں پڑا پتھر

کبھی پارس نہیں ہوتا

اماوس کا تقابل کس طرح ہو چودھویں شب سے

خزاں آخر بہار آثار کیسے ہو

زمیں پر گھومتے حشرات جگنو تو نہیں ہوتے

بسا ندِاک اور شے ہے

خوشبوؤں کی اور ہی صورت

محبت اور نفرت دو الگ جذبے ہیں دنیا میں

حماقت اور دانائی میں واضح فرق ہوتا ہے

اسے کہنا!

بڑا جوتا پہننے سے قد و قامت نہیں بڑھتا

تابش کمال

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

الگ جہاں سے تھے، لیکن جہاں کے ساتھ رہے
غبار ہو کے بھی ہم کارواں کے ساتھ رہے

اسٹیشن ماسٹر

دھواں اُگلتی، کسمساتی ریل گاڑی مستقر پہ رُک گئی
تو ایک میلہ لگ گیا
سوادِ انتظار پر
دلی مراد کی گھٹا برس گئی
غبار مستقر پہ کھلبلی مچی
مسافروں کا اک ہجومِ بے کراں اُمڈ پڑا
خموشیوں کی جھیل پر
پرند اڑنے لگ گئے
نکل پڑیں جگہ جگہ سے بھاری بھاری گٹھڑیاں
ٹرنک، جستی پیٹیاں
کوئی ادھر، کوئی ادھر
نشست کی تلاش میں
اُمڈتا، بدحواسیوں میں ڈولتا
ہر ایک ڈبے میں نگاہ دوڑاتا ہوا
بلند سُر میں اہلِ خانہ کو پکارتا ہوا
نگہ کسی مسافرِ جمیل و خوش بدن پہ پڑ گئی
تو بس وہیں پہ گڑ گئی
سفید وردی زیبِ تن کیے ہوئے
امورِ آمد و گزر کا پاسباں
مسافروں کو اپنی اپنی منزلوں کی سمت جاتے دیکھ کر
نظر میں اس کی بھر گیا ہے گھر کی یاد کا دھواں

پھر ایک لمبی سیٹی کی صدا
ہوا میں مل گئی
وہ سبز جھنڈی ہِل گئی
تو دھیرے دھیرے ریل گاڑی بھی سرکنے لگ پڑی
ابھی جو میلہ تھا لگا
وہ لُٹ چکا
خموشیوں کی جھیل پر
پرند تنہا رہ گیا

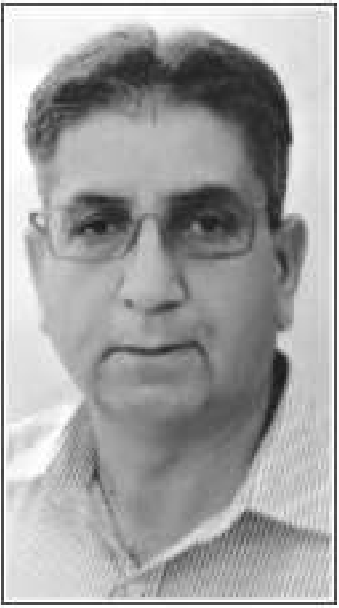

طالب انصاری

مجھے اک شعر کہنا ہے

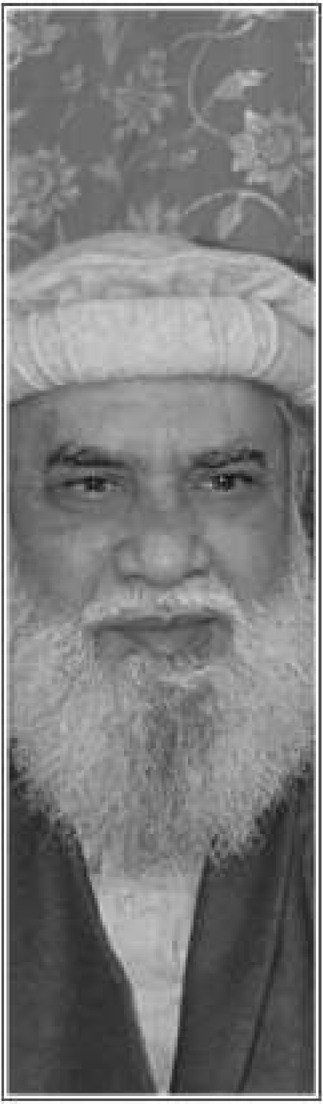

اکرم ناصر

مجھے اک شعر کہنا ہے
کہ جس میں لفظ جتنے ہوں
کسی پر بھی نہ اترے ہوں
مجھے اک شعر کہنا ہے
کہ جس میں بات ایسی ہو
کسی نے بھی نہ سوچی ہو
مجھے اک شعر کہنا ہے
جسے سن کر فرشتے جھوم اُٹھیں
اور حضرت جبریل یہ تصدیق فرمادیں
کہ اب لفظ محمد
اپنی پوری شان سے تعریف میں آیا
مجھے اک شعر کہنا ہے
یہی خواہش مری شعری وراثت ہے
جسے اب آنے والی نسل کو تفویض کرنا ہے
کہ اس خواہش سے بڑھ کر نعت
ممکن ہی نہیں کہنا
مجھے اک شعر کہنا ہے
مجھے اک شعر کہنا ہے

تفاوت

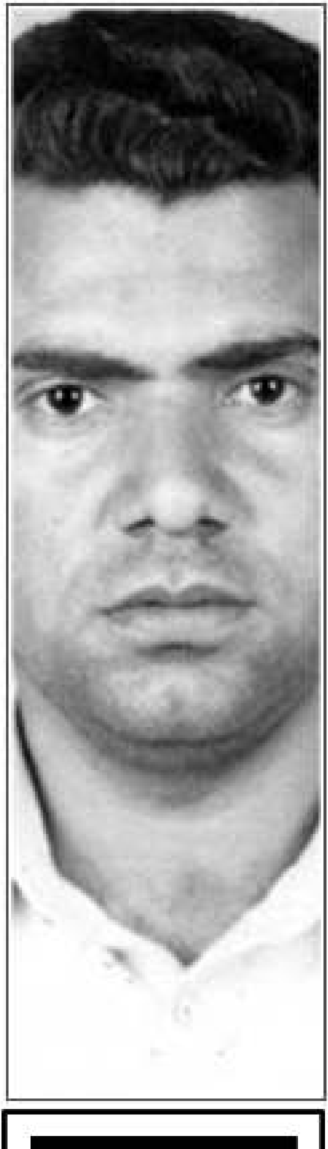

شہاب صفدر

بتا کوہِ خیسور
تیرے پرندوں کی رنگت
فقط گہری مٹیالی کیوں ہے
تری جھاڑیاں تیرے کیکر بھی
خاکستری دھسے اوڑھے کھڑے ہیں
شمالی پہاڑوں کو دیکھا ہے میں نے
کہیں دودھ جیسے سفید
اور کہیں سبز ملبوس میں
صورتِ خضر
آنکھوں کو
آبِ بقا کا پتہ دے رہے ہیں
بڑے چھوٹے طائر
فضاؤں میں قوس قزح سی بناتے
بہشتوں پہ ایمان کو
تقویت بخشتے ہیں
مگر میرے خیسور
خشک اور بے نم نشیبوں کے
بامِ فلک بوس
یہ تیرے پتھر یہ خاشاک کے ڈھیر
لگتے ہیں دوزخ کا ایندھن
ہمیشہ تجھے آندھیوں نے جھنجھوڑا
سدا بجلیوں نے ہے کی چاند ماری
کب آئے گی تیری طرف
کوئی بادِ بہاری

نوحہ

افتخار شاہد

آؤ وقت کا نوحہ لکھیں
نوحہ ایسے وقت کا جس میں
کوئی بھی محفوظ نہیں
آؤ وقت کا نوحہ لکھیں
وقت کہ جو بے مہر ہوا ہے
وقت کہ جس نے زخم دیا ہے
وقت کہ جس نے ارمانوں کے ہنستے گلشن
خودغرضی کی آگ میں جھونکے
وقت کہ جس نے باپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھینی
وقت کہ جس نے ماں سے اس کا بیٹا چھینا
آؤ وقت کا نوحہ لکھیں
نوحہ ایسے وقت کا جس میں
ظالم منصف بن بیٹھے ہیں
وقت کی اس بے مہر ادا پہ
آنکھ سے آنسو بہتے ہیں
بہتے آنسو کہتے ہیں
آؤ وقت کو نوحہ لکھیں
آؤ وقت کا نوحہ لکھیں

مٹی پہ قدم

تیری آنکھوں کی بچھواڑ سے بھی گئے
تیری تنہائی کی نیلگوں آڑ میں
ہنسنے رونے کی معیاد پوری ہوئی
لوگ چھوٹے پڑے
عشق جھوٹا پڑا
سبز وعدوں کا شیشہ زمیں پر گرا
اور دنیا کی بنیاد رکھی گئی
دیکھتے دیکھتے
چار سمتوں کے آبادکاروں میں ہم منتخب ہو گئے
بن پڑھے، بن لکھے
آٹھ پہروں کے عرضی گزاروں میں ہم،
بیٹھنے لگ گئے
بھاگنے لگ گئے کاغذوں پر
گناہوں کی رفتار سے
اور لوح و قلم ہم کو چھوٹے پڑے
کانپنے لگ گئے
چار سمتوں کا بیڑہ اٹھائے ہوئے
سوچنے لگ گئے
خاک کی رسّیوں میں بندھے
اپنے قبلوں کو لادے ہوئے پشت پر
کس طرف جائیں گے
کون محراب بانہوں میں لے گی ہمیں؟
کون مینارا اپنے عقب میں بٹھائیں گے؟
اپنی اداسی کو نمٹائیں گے
کون
کب کس سے۔۔۔

تو اے اوٹ والے
یہ ہم کھوٹ والے
جو گھونگھٹ کی (تیرے ہی گھونگھٹ کی)
لپٹوں سے
ناکارہ گرہوں کی صورت جھڑے تھے
جھڑے ہی رہیں گے؟

شاہین عباس

نوٹ: ماہنامہ بیاض، لاہور جنوری 2023ء کے شمارہ نمبر 1 جلد نمبر 31 میں یہ نظم جناب ارشد شاہین کے نام سے (سہواً) شائع ہو گئی تھی۔ ادارہ معذرت خواہ ہے۔

آٹے کا تھیلا

وہ دن بھر کا تھکا ہارا جو گھر آیا
تو بیوی نے کہا اس کو
تھکن سے چور لگتے ہو
مجھے معلوم ہے لیکن
تمہیں اتنا بتانا تھا کہ بچے بھوکے بیٹھے ہیں
مگر روٹی پکانے کو تو آٹا ہی نہیں گھر میں

سنا ہے سستے آٹے کی
لدی گاڑی حکومت نے
ہمارے ہاں بھی بھیجی ہے
سو قسمت آزما آئیں
کہ شاید ایک تھیلا واں
ہمارے نام کا بھی ہو

تھکن سے ٹوٹتے اعصاب لے کر گھر وہ
پہنچا تھا
ذرا ہمت نہیں تھی پر
اسے بچوں کے چہروں پر
مسرت لے کے آنی تھی
اسے یہ بھی دکھانا تھا
کہ جس کو باپ کہتے ہیں

کسی صورت نہیں تھکتا
کہیں کیسی بھی مشکل ہو
اسے آسان لگتی ہے

وہ چل کر اپنے پاؤں پر
ہجوم بے کسی کی اک
تماشہ گاہ آ پہنچا
جہاں پر اس کے جیسے ہی
بہت سے لوگ آئے تھے
جو پیسے ہاتھ میں لے کر
سوالی بننے آئے تھے

گیا تھا چل کے پاؤں پر
مگر کندھوں پہ لوٹا ہے
اور اس کی چارپائی پر
وہ تھیلا ساتھ رکھا ہے

سرور حسین نقشبندی

فریب میں نہ رہنا

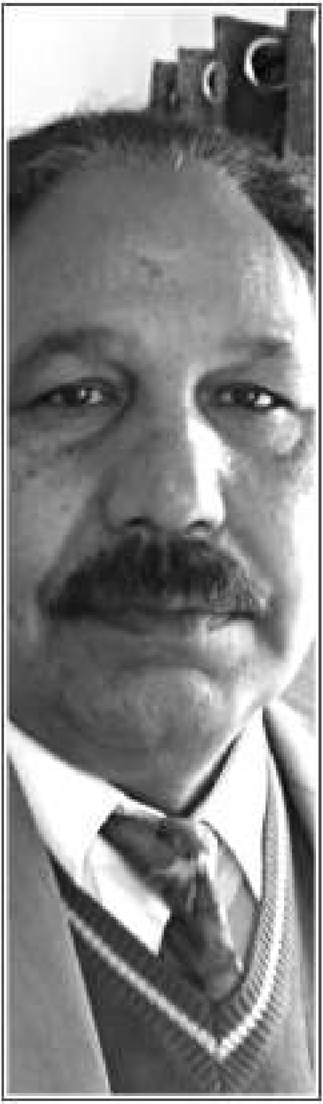

فریب میں نہ رہنا
میری مسکراہٹ میں
چھپے غم پڑھ لینا
ان زلفوں میں
بسے اندھیرے بھی دیکھ لینا

فریب میں نہ رہنا
میں کوئی رئیس زادہ نہیں
مگر میری محبت کو ہلکا نہ لینا

فریب میں نہ رہنا
دور پڑے پتھر سے تو محبت ہو جاتی ہے
مگر نزدیک ہیرا نظر نہیں آتا
شاید ہمارے اونچے اونچے خواب
برابری کی محبت ہونے نہیں دیتے ہیں

فریب میں نہ رہنا
وہ کہانیاں سنی نہیں
کوئی شہزادی تھی
کوئی غلام تھا
ایک کنیز تھی
ایک شہزادہ تھا

میتھیو محسن

شام اترتی ہے

شام جب اُترتی ہے
گھر کے سُونے آنگن میں
دل کے خالی کمرے میں
کچھ چراغ جلتے ہیں
تلخ و شیریں یادوں کے

....

شام جب اُترتی ہے
شہروں، گلیوں، کوچوں میں
ہر طرف سے آتی ہے
اِک صدا خموشی کی
گھر کے سب در و دیوار
دیکھتے ہیں حیرت سے
اور سب مکیں گھر کے
ایسی موت مرتے ہیں
جس کا عرصۂ تکمیل
صبح تک ہی ہوتا ہے
آؤ ہم بھی جی لیں کچھ
دن کی روشنی لے کر
کیونکہ شب کے آتے ہی
ہم سبھی کو مرنا ہے
سات آٹھ گھنٹوں تک
موت کے جزیروں میں
تنہا ہی بھٹکنا ہے
یہ ہمارا جینا بھی
گھونٹ گھونٹ جینا ہے
بوند بوند مرنا ہے

....

اور پھر سے اگلے دن
انتظار کرنا ہے
شام کب اُترتی ہے؟

....

شام جب اُترتی ہے
دشت میں بیاباں میں
کوئی بھی نہیں ہوتا
تیرگی کو جو نگلے
ہاں، کہیں پہ اِک جگنو
اپنی روشنی لے کر
قریہ قریہ پھرتا ہے
اور سوچ میں گم ہے
کاش! کوئی نہ بھٹکے
کاش! میں بھی کام آؤں
بے نوا مسافر کے
اور راہ دِکھلاؤں
شام جب اُترتی ہے
شام جب اُترتی ہے

اشرف نقوی

زندوں کے جنازے

مَرے ہوؤں کے جنازوں پر تو سب آتے ہیں
پچھتاوے کا بوجھ اُٹھائے
رونے پیٹنے
اک دوجے کو پُرسہ دینے
اور کچھ شاید اوروں کو دکھانے
رشتوں پر احسان جتانے
کیونکہ دفنانے کے بعد
بٹوارہ بھی کرنا ہوتا ہے
بچے کُھچے اسباب کا
اور اُن مخلص رشتوں کا
جنہیں مٹانا ہوتا ہے
منظر سے ہٹانا ہوتا ہے
ورنہ کون کسی کو روتا ہے

لیکن کچھ زندہ بھی مُردوں جیسے ہوتے ہیں
جنہیں زمانہ وقت سے پہلے سُولی پر لٹکا دیتا ہے
اپنی لاش اُٹھا کر وہ پھرتے رہتے ہیں
اپنے ہی کاندھوں پر
اپنا پرایا کوئی نہیں آتا
اُن کی لاش اُٹھانے
اُن کے جنازے کو کاندھا دینے
اور اُنہیں دفنانے
جیتے جی وہ مَر جاتے ہیں
لوگوں کے سفاک رویوں کے ہاتھوں
کوئی پُرسہ بھی اُنہیں دیتا نہیں ہے
اک قبرستان چھپائے پھرتے ہیں جو سینوں میں
خود کو دفنائے پھرتے ہیں جو سینوں میں

کاش! اذیت دینے والے بے حس لوگ
مَرے ہوؤں کا ماتم کرنے سے پہلے
زندوں کی بھی قدر کریں
اپنی جھوٹی انا کے خول سے باہر نکلیں
سچے رشتوں کو پہچانیں
اُن کے دل کا بوجھ بھی ہلکا کرنے بھی آجائیں
زندہ لاشوں کو بھی دفنانے کا
بندوبست کریں!
اُن کے آنسو دینے والے
اُن کے بھی آنسو پونچھیں
بھلے دکھاوا ہو اِس میں
اتنا تو احسان کریں
زندوں کو حیران کریں

ظہور چوہان

نظم

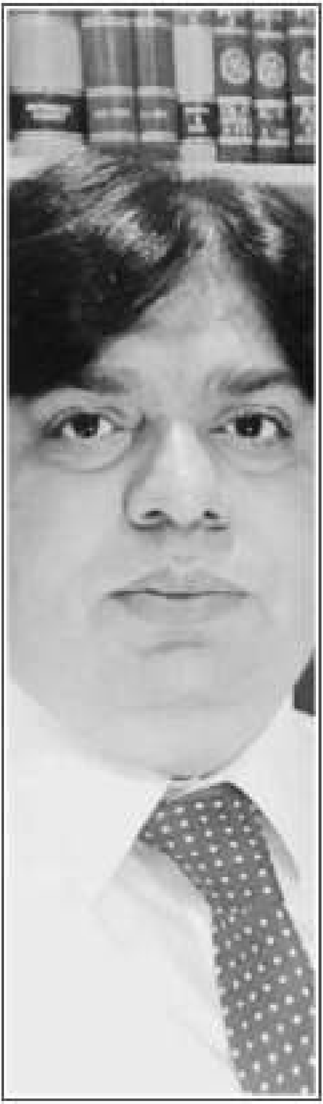

دسمبر لوٹ آتا ہے
دسمبر میں تمہاری یاد کی شاخوں پہ
تازہ پھول آتے ہیں
دسمبر میں
تمہاری یاد کے رستوں
پہ چلتے چلتے خود کو بھول آتے ہیں
دسمبر میں
ہوائیں خود دریچے کھول کر
آتی ہیں کمرے میں
مری ٹیبل پہ ہوتی ہیں
تمہارے نام کی نظمیں
دسمبر کی ہوا ان کو اڑاتی ہے
پرندوں کی طرح
ان دیکھے دیسوں میں
انہیں وہ لے کے جاتی ہے
دسمبر میں
کوئی بھی ہجر ہو یا وصل
وہ تکمیل پاتا ہے
اسی خاطر
دسمبر لوٹ آتا ہے

افتخار شوکت

یقین کا موسم

حریص بادل نگل رہے ہیں
سمندروں سے کثیف پانی
یہ دھوپ اپنے ہی سائباں کا
بھٹکتا سایہ پکڑ رہی ہے

وبائے مہر و وفا کی خوشبو
جفا کے جوہڑ میں جا انڈیلی
تو مسجدوں نے نماز اپنی
گھروں کے صحنوں کو سونپ دی ہے

جو کھڑکیاں شور سے اٹی تھیں
وہ خامشی کا غلاف اوڑھے
فغاں کا دستِ گریز تھامے
درِ بلاغت پہ جا پڑی ہیں

چمن میں تتلی بھٹک گئی جب
تو شہد کی رانی ڈر گئی ہے
شگفتہ پھولوں کی انجمن بھی
نئے رویوں میں گھر گئی ہے

یہ کم زیادہ کی کشمکش میں
ستون ہلتے ہیں زندگی کے
سو، برجِ میزان ڈھے رہا ہے
دمِ غنیمت نکل رہا ہے

جو چارہ گر تھا وہ نیند تھامے
کسی خرابے میں سو گیا ہے
قدیم شہروں کا شور پھر سے
فصیل ڈھانے چلا گیا ہے

زمین کفنوں کا جال پھینکے
عروجِ مدفن کا راج مانگے
بہاؤ رستوں پہ تھم گیا ہے
یقیں کا موسم بدل گیا ہے

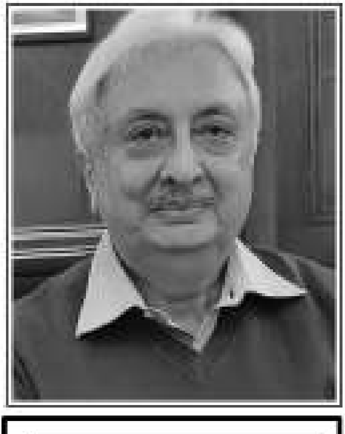

توقیر احمد شریفی

لاتعلقی کا وزٹنگ کارڈ

وہ جس کے قرب سے
اِک دن
رشتوں کا بخار بھی اُتر جاتا ہے

وہ... جس کی خاطر
گہری خاموشی کے غار میں
چھپا وسوسہ
نیلے سمندر کے تصور میں
مراقبہ کرنے
اُداسی کے گرین سگنل پر
رُکتا ہے

وہ جس کی خاطر
محبت کی سرخ کرنیں
دن کی نیم خواندہ تاریکی میں
گھر کی دیواروں میں سوراخ کرتی ہیں

وہ جس کی خاطر
لاتعلقی کا وزٹنگ کارڈ
کھلی آنکھوں کی شائستگی سے
محروم کر دیا جاتا ہے

وہ جس کی خاطر
وقت کی دو دھاری تلوار کا زخم
خواہش کو کاٹ کر رکھ دیتا ہے

وہ جس کی خاطر
ہوا کا بے رحم مزاج
نئے موسموں کے خدوخال کو
متروک لفظوں کے معانی پہناتا ہے

وہ جس کی خاطر
ایک اور سفر کا بوجھ
کندھوں سے گر کر روپوش ہو جاتا ہے
اور مٹی...... محض چھپا لینے کا ہنر جانتی ہے

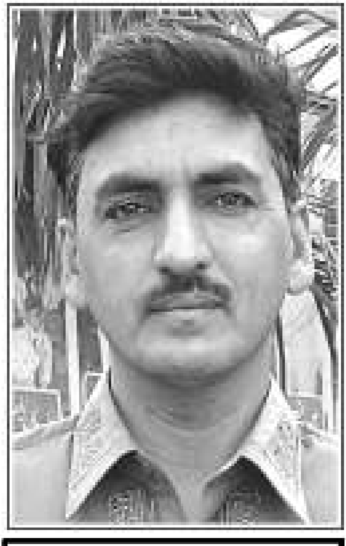

امجد بابر

ہم شہرِ وفا کے لوگ ہیں

یاد تو کر جاناں۔۔
ہم نے ترے سنگ تاریک راہوں میں سفر کیا ہے
مشکل راستہ بھی خوشی سے بسر کیا ہے
ہم وہ سادہ لوح تھے
جنہوں نے
مفلسی میں ترا ہاتھ تھام کر
دولت کے حریصوں کے منہ پر
طمانچہ مارا تھا۔۔۔
کہ ہماری دولت صرف تم تھے

جو گردشِ ایام میں تجھے چھوڑ گئے تھے
تجھ سے ناطہ توڑ گئے تھے
پھر سے ترے سنگ ہو لئے؟؟
کیا پھول چھوڑ کر ببول چنو گے؟
دوبارہ پھر وہی فضول چنو گے؟

ہم شہرِ وفا کے لوگ ہیں
ہماری گھٹی میں شامل وفا ہے بس
ہم کو راستہ بدلنا نہیں آتا
وعدوں سے مکرنا نہیں آتا

ہم شہرِ وفا کے لوگ ہیں

اور شہرِ وفا کے لوگ
کسی بے وفا کے ساتھ چلتے نہیں ہیں
دوبارہ پھر ملتے نہیں ہیں

فرح شاہد

اگر محبت عظیم سچ ہے

زاہد ربانی

اے میرے ہمدم مجھے خبر ہے
یہ فاصلے اور دوریاں سب ہیں بے حقیقت
اے میرے ہمدم
مجھے خبر ہے
دلوں کی قربت عظیم تر ہے
مگر مرا دل یہ چاہتا ہے کہ میری آنکھیں
کبھی کبھی اپنے روبرو بھی تو تم کو دیکھیں
اے میرے ہمدم
کسے خبر ہے
کہ کتنی مدت کے بعد اب ہم ملیں گے دونوں
مگر یقیں ہے
نہ جانے کیوں آج میرے دل کو
کہ اک نہ اک دن ضرور ہم تم بہم بھی ہوں گے
اگر محبت عظیم سچ ہے
تو فاصلے جو ترے مرے درمیاں ہیں
اک روز کم بھی ہو نگے

کشمیر [یہ وہی ارضی جنت ہے؟]

جو ، ہر دل کو بہلاتا تھا
ارضی جنت کہلاتا تھا
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

جس میں خوشیاں اور شادی تھی
جس میں ہر سو آبادی تھی
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

بھوکے پیاسے لاغر بچے
بے بس اور لاچار نہتے
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

سینے میں نشتر چبھتا ہے
ہر انسان کا دل دکھتا ہے
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

مل کے سب آواز اٹھاؤ
ان کو ان کا حق دلواؤ
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

لازم ہے یہ دنیا والو
ان کے سر سے مشکل ٹالو
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

کوئی تو ظالم کو روکے
کوئی تو ظالم سے پوچھے
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

عاصم آنکھوں کا تارا تھا
جو جنت کا اک پارا تھا
یہ وہ ہی ارضی جنت ہے

عاصم بخاری

نثری نظم

سچ کڑوا ہوتا ہے
جھوٹ کا ذائقہ میں نے کبھی چکھا نہیں
نفرت کے موسم حبس آلود ہوتے ہیں
تادیران میں سانس لینا ممکن نہیں
محبت کو رخصت ہوئے مدت ہوئی
منافقت کی سیلن زدہ مشک نے
گھر کی دیواروں میں گھر کرلیا ہے
یاد کو پھپھوندی لگ جائے تو
من کے بھیتر چھپی رنجشوں کا تعفن
جذبوں کو آلودہ کر دیتا ہے
لہجوں کی کڑواہٹ نے وجود میں وہ زہر بھر دیا ہے کہ
اس پر کوئی ویکسین کارآمد نہیں
بیمار روح کی مسیحائی کے لئے حرف تسلی ابھی
ایجاد نہیں ہوا
الفاظ کی بوطیقا میں کوئی لفظ نہیں ملتا
جو رویوں کی بدصورتی کو کوئی مفہوم پہنا سکے
معیار دوستی مفاد پرستی ہو
تو
چاہت ندامت کا پھندا لگا کر خودکشی کرنے پر
مجبور ہو جاتی ہے
تیقن ہے کہ وفا کے مرقد پر نوحہ کناں ہوں

نائلہ راٹھور

کبھی جو یاد آؤں میں

کبھی جو یاد آؤں میں

فقط اتنی دعا کرنا

کہ تم کو بھول جاؤں میں

نہ ہے تم سے غرض کوئی

نہ تم سے کچھ شکایت ہے

مگر کیوں ایسا لگتا ہے

کہ اتنا حق تو ہے میرا

جسے میں یاد کرتی ہوں

اسے بھی یاد آؤں میں

آفرینہ آفرین

قربت کے فاصلے

عنبرین خان

زندگی بھی کیسی کیسی حیرتوں سے ملواتی ہے
کل کی بات ہے
کتنی خوش فہمیاں تھیں
کہ وہ محبت کی گہرائی جان کر سرشاری میں
میری ذات کا جزو بن جائے گا
ہم خواب بھی دیکھیں گے
اور محبت کے پھولوں پر
حقیقتوں کے رنگ
اپنی مرضی سے پینٹ کریں گے
ایک دوسرے کی سوچ کا عکس ہوں گے
زندگی اور شاعری
محبت کے زیر اثر نمو یاب ہوں گی
سوچتی ہوں
کاش اسی خوبصورت احساس میں زندہ رہتی
پاس آکر تو
حقیقتوں کے ہاتھ
کانٹے چبھونے لگے ہیں
خواب اعتبار کھونے لگے ہیں
لفظ گنگ ہونے لگے ہیں

خطوط

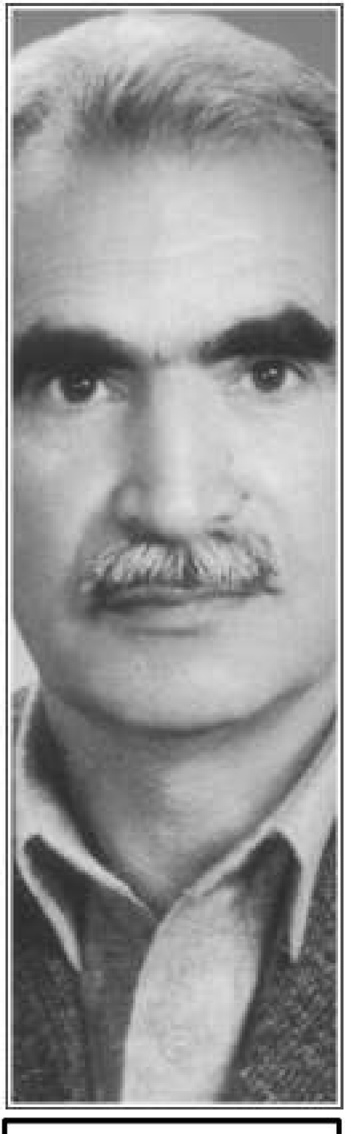

محمد ارشاد

محترمی ومکرمی عمران منظور صاحب
سلام مسنون!

’بیاض‘ کا ہر شمارہ گزشتہ شماروں سے خوب تر پاکر دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ آپ کو جزائے خیر دے۔ کمپوزنگ کی غلطیوں سے مفر ممکن نہیں۔ بعض غلطیوں کو قاری جان لیتا ہے بعض کو نہیں۔ ’بیاض جنوری‘ میں میرے اس جملے ’’عربی ادب کی تاریخ میں ابوالعطا الہندی کا نام بھی موجود ہے جو مخضرین شعرا میں ایک تھے (ص 40) کو پڑھ کر زیادہ جاننے والا قاری اسے میری غلطی بھی باور کرسکتا ہے۔ حالانکہ یہ شاعر الہندی نہیں السندی (سندھی) ہے اور مخضرین بھی (مخضرمین) ہے۔

کسی بھی رسالے میں ساری تخلیقات ایک معیار اور ایک سطح کی نہیں ہوتیں، پھر بھی تحسین آفرین نہیں ہونی چاہیے۔ تحسین سے حوصلہ تو بڑھتا ہی ہے لیکن آفرین سے کوئی بھی تخلیق کار اپنی تخلیق کو اپنی آخری منزل سمجھ کر آگے بڑھنے سے پہلو تہی کرتا ہے۔ خطوط کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن بعض خطوط یاددہانیاں ہیں قاری میں کوئی تحرک پیدا نہیں کر پاتے۔

یہی حال ناقدین حضرات کی تنقید کا ہے۔ شاہنواز زیدی نے ایک نظم ممکنہ نیوکلیئر جنگ کے نتائج پر کئی سال پہلے لکھی تھی۔ یہ نظم 'اندھیرا ہونے والا ہے' میرے نزدیک ایک نئے موضوع پر شاہکار نظم ہے لیکن کئی دہے گزر جانے کے بعد آج تک کسی نقاد کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گزری، جس نے اس کی خوبیوں کا اعتراف کیا ہو۔ آج کل مشکل ردائف کے ساتھ شعر گوئی میں مہارت کا مظاہرہ عام ہے لیکن دل میں گھر کر لینے والی شاعری ناپید ہوتی جا رہی ہے۔ مولانا محمد علی جوہر سے کسی نے پوچھا کہ اگر آپ کو کسی ایسی جگہ جانا پڑ جائے جہاں صرف دو کتابیں لے جانے کی اجازت ہو تو آپ کون سی دو کتابیں ساتھ لے جانا پسند کریں گے تو کہا: قرآن اور داغ کا دیوان۔ اردو میں داغ ہی وہ شاعر ہے، جس کی اردو کو اردوئے معلیٰ کہا جا سکتا ہے۔ محمد علی جوہر خود بھی بہت اچھے شاعر تھے لیکن چونکہ ایک غیرت مند لیڈر کی حیثیت سے زیادہ مشہور و معروف اس لیے ان کی شاعری ان کی راہنمائی کے سامنے مدھم ٹھہری۔ وہ بھی داغ کے مداح تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے استاد ڈاکٹر سید محمد محمود احمد صدر شعبہ، فلسفہ (کراچی یونیورسٹی) نے جو ہمیں فلسفہ مذہب پڑھاتے تھے۔ ایک بار جذب وسلوک پر لیکچر دیتے ہوئے محمد علی جوہر کا یہ شعر کیا پڑھا کہ جذب وسلوک کی ساری منزلیں روشن ہو گئیں:

سارى دنیا یہ سمجھتی ہے کہ سودائی ہے
اب مرا ہوش میں آنا تری رسوائی ہے

....

عبدالرحمٰن بجنوری نے وید اور دیوان غالب کو ہم پلہ قرار کیا دیا کہ ساری دنیا غالب کے گرد گھومنے لگ گئی۔ اس ضمن میں جناب فیض رسول فیضان کا خط ایسا نہیں کہ روا روی میں پڑھا جائے۔ اپنے خط میں انھوں نے میر، غالب اور اقبال کے حوالے سے جو کہا ہو سکتا ہے غالب کو چاہنے والے اس سے اختلاف کریں۔ اس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ غالب کے عاشقوں نے فغانی، نظیری، عرفی، کلیم، طالب، صائب، وحشی، غنی اور بیدل سبک ہندی کے اجلّہ شعرا کو نہیں پڑھا کہ فارسی اور اردو میں غالب کے مقام کا تعین کر پائیں۔

میر کے بہتر نشتروں کے حوالے سے فیض رسول فیضان نے غالب کے اس نشتر کا ذکر بھی کیا:

جس طرف سے آئے ہیں اس طرف کو جائیں گے
مرگ سے وحشت نہ کر راہِ عدم پیمودہ ہے

....

غالب یہ شعر بھی نہ کہہ پاتے اگر ایرانی شاعر میر یحییٰ کاشی نے یہ شعر نہ کہا ہوتا:

اے کہ از دشواریٔ راہِ فنا ترسی مترس
بسکہ آساں است ایں رہ می تواں خوابیدہ رفت

....

غالب سبک ہندی کے ماحول، زبان اور اسلوب سے باہر نکل ہی نہیں پائے۔ اسی حدود اربعہ میں رہ کر شاعری کی۔ رہے اقبال تو وہ ہر لحاظ سے منفرد اور یکتا ہیں۔ کیا بلحاظ موضوعات، کیا بلحاظ اسلوب اور کیا بلحاظ لب ولہجہ۔ داغ کے شاگرد تھے وہی برجستگی زبان میں بھی۔ اقبال کا سبک نہ خراسانی ہے نہ عراقی نہ ہندی، استفادہ تینوں سے کیا۔ اس کے علاوہ عرب شعرا سے بھی اور انگریز اور جرمن شعرا سے بھی۔ عصر حاضر کے اجلّہ ایرانی ناقدین شعر و ادب نے اقبال کے سبک کو سبک لاہوری کا نام دے رکھا ہے۔ اقبال پنجابی تو تھے ہی پنجابی شاعری سے بھی جس کے سامنے اردو شاعری بے مایہ ہے بخوبی آگاہ تھے۔ پشتو شعرا میں سے خوشحال خان خٹک کی شاعری سے بھی انگریزی تراجم کے ذریعے آگاہ تھے۔ فیض رسول کا یہ کہنا مجذوب کی بڑ نہیں: ''میر تو درکنار غالب بھی بحرِ اقبال میں ایک جزیرہ بلکہ قطرہ دکھائی دینے لگتے ہیں۔''

مرزا غالب پر شعرائے ایران کی مرعوبیت اس حد تک طاری تھی کہ ایک خط میں سرور کو لکھا: ''جب تک قدما و متاخرین میں مثل صائب وکلیم و اسیر وحزیں کے کلام میں کوئی لفظ یا ترکیب دیکھ نہیں لیتا اس کو نظم اور نثر میں نہیں لکھتا'' اور ایک خط میں بیجنر کو لکھا: ''فقیر نے اساتذہ کے کلام میں کہیں یہ ترکیب نہیں دیکھی آپ جب تک کلام اہل زبان میں دیکھ نہ لیں اس کو جائز نہ جانیے گا۔'' ایسے لوگ تھوڑے نہیں جو اپنی کم علمی کی بنیاد پر غالب کو بہت بڑا ترکیب ساز شاعر گمان کرتے ہیں۔

غالب نے شیخ علی حزیں کو بھی صائب تبریزی اور کلیم کاشانی کا ہم رتبہ ٹھہرا لیا۔ ایک خط میں سرور کو لکھا: ''وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا اور ہر اعتراض بجا ہے بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے منھ کی کھاتا ہے۔'' غالب نے خان آرزو کے مقابلے میں وارستہ سیالکوٹی کو سند ٹھہرا لیا پھر اس کی زبان پر بھی حرف گیری کی۔ جب نہ ایک اہل زبان نہ دوسرا نہ تیسرا تو تیسرے نے کس برتے پر دوسرے کو پہلے پر ترجیح دی۔ شیخ علی حزیں اس وقت ہندوستان آئے جب سودا شہر آشوب لکھ رہے تھے۔ برا حال تھا ہندوستان کا۔ علی حزیں (۱۱۳۰-۱۲۰۸ھ) سودا (۱۱۲۵-۱۱۹۵ھ) سے پانچ سال چھوٹے، درد (۱۱۳۳-۱۱۹۹ھ) سے تین سال اور میر تقی میر (۱۱۳۷-۱۲۵۰ھ) سے سات سال بڑے تھے۔ ایران کا حال

ہندوستان سے بھی بدتر تھا ورنہ وہ یہاں کیا لینے آئے تھے۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہان اور عالمگیر کا زمانہ نہیں تھا جب شعرا کا منھ موتیوں سے بھروا دیا جاتا، سونے چاندی میں تلوا دیا جاتا۔ عالمگیر نے ایسا نہیں بھی کیا تو بھی امرا اتنا صلہ ضرور دے دیتے جو عمر بھر کے لیے کفایت کرتا۔ حزیں کا یہ کہنا کہ ہندوستان فضل و کمال کے لیے زمین شور کا حکم رکھتا ہے، غلط تو نہ تھا لیکن حزیں خود بھی تو نظیری، عرفی، کلیم، طالب اور صائب کی طرح کے صاحب کمال نہ تھے نہ بادشاہ جو خود بے روزگار تھے کسی کو کچھ دینے کے قابل تھے۔ شاہجہان کے عہد میں ایران سے آنے والے علی قلی سلیم کا یہ شعر حزیں نے نہیں پڑھا:

نیست در ایراں زمیں سامانِ تحصیلِ کمال
تا نیامد سوے ہندوستاں حنا رنگیں نہ شد

.....

اور نہ بعہد عالمگیر محمد قلی سلیم کا یہ شعر:

بعیش آباد ہندوستاں غمِ پیری نمی ماند
کہ مو نتواند از شرم کمر باشد سفید اینجا

.....

اگر ایران عیش آباد ہوتا تو وہاں سے آنے والے اہل فضل و کمال کی فہرست مقامی اصحاب کمال سے طویل تر نہ ہوتی۔ علی حزیں پرآشوب دور میں ہندوستان آ کر اندھوں میں کانا راجہ بن گئے تھے۔ فارسی گویان ہند کو ”پوچ گویان ہند“ کہنے لگے۔ بیدل کی نثر پڑھ کر کہا: نثر بیدل بفہم نمی آید اگر مراجعت بہ ایراں دست دہد براے ریشخند بزم احباب رہ آورد بہتر ازیں نیست (بیدل کی نثر سمجھ سے بالا ہے، ایران لوٹنا نصیب ہوا تو بزم احباب میں ہنسی ٹھٹھول کے لیے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں) بیدل نے اپنے ایک بچے کی وفات پر جس نے باپ کی انگلی پکڑ کر چلنا شروع کیا تھا، مرثیے میں کہا:

ہر گہ دو قدم خرامی می کاشت
از انگشتم عصا بکف داشت

.....

پڑھ کر کہا: خرام کاشتن عجب چیزے ست۔ مرزا غالب نے بقول خود فارسی کسی عبدالصمد ایرانی سے سیکھی تھی، حزیں کی باتوں کو بمنزلہ وحی جانا اور ان کی زبان کو سند لیکن بیدل کی نثر و نظم پر حزیں کی تنقید کو بھول گئے۔ خرام کاشتن اتنا ہی عجیب ہے جتنا بیاباں چکیدن:

گریہ چاہے ہے خرابی مرے کاشانہ کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے بیاباں ہونا

رگ سنگم شرارے می نویسم
کف خاکم غبارے می نویسم

.....

شرار نوشتن، غبار نوشتن بھی تو ”عجب چیزے ست۔“ جو زیادتی حزیں نے فارسی گویان ہند، غنی کشمیری، ناصر علی

سرہندی اور بیدل کے سے اصحاب فضل وکمال سے کی اسی طرح کی زیادتی غالب نے غنیمت (محمد اکرم کنجاہی) واقف (بٹالوی) منت (قمرالدین پانی پتی) سے بھی کی۔ ان کو ایک ساتھ بریکٹ کرکے ''راہ سخن کے غول ہیں، آدمی کو گمراہ کرنے والے'' ہی نہیں کہا بلکہ یہ تک کہہ دیا: ''فارسی وہ کیا جانیں، ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر ہوتے تھے'' (خط بنام انوارالدولہ بہادر شفق) غنیمت کا یہ شعر غالب نے نہ پڑھا ہوتا:

نہ گردد قطع ہرگز جادۂ عشق از دویدنہا
کہ می بالد بخود ایں راہ چوں تاک از بریدنہا

تو یہ شعر کیسے کہہ پاتے:

ہر قدم پر مری منزل ہے نمایاں مجھ سے
مری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

....

معلوم نہیں کتنی پی رکھی تھی جو سامنے کا قافیہ گریزاں چھوڑ کر نمایاں لے لیا۔ غنیمت کی اسی غزل کا ایک شعر یہ بھی ہے:

بیادِ داغہائے کہنہ دل وارو تماشائے
شود طاؤس را برگشتہ دیدن سیرِ گلشنہا

....

اور ہے کوئی غنیمت کے اس شعر کا جواب غالب کے پاس:

نظر بروئے کہ شد آشنا کہ می گردو
بگردِ خویش چو گرداب دیدۂ ترِ ما

رہے غنی کشمیری تو ایسا شاعر تو سرزمین ایران سے بھی کوئی نہیں اٹھا جسے ان کے مقابلے میں لایا جائے۔ غالب کے ممدوح صائب تبریزی نے جب غنی کا یہ شعر سنا:

حُسنِ سبزے بخطِ سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگِ زمیں بود گرفتار شدم

....

تو کہا: اے کاش آں چہ تا دریں عمر بگفتہ ام بایں کشمیری بدہند وایں یک بیت او بمن می دادند۔ غنی کے اس شعر:

جاں بہ لب از ضعف نتواند رسید
ما بزورِ ناتوانی زندہ ایم

کا مضمون غالب نے اڑایا:

از کشاکشِ ضعفم جاں نمی گسلہ از تن
ایں کہ من نمی میرم ہم ز ناتوانیہا ست

....

لیکن غنی نے چند الفاظ میں جو بات کہی غالب سے زیادہ الفاظ میں بھی نہ کہی جا سکی۔ گویا:

بڑھائی شیخ نے داڑھی اگرچہ سن کی سی
مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

....

وہ زبان جسے فارسی کہا جاتا ہے، ایران کے صوبہ فارس کی زبان نہیں - شمال مشرقی افغانستان کی زبان ہے اور اس کا نام دری ہے۔ بلخ، بدخشاں، بادغیس، ہرات، غزنی، فراہ، قبادیان

(افغانستان) بخارا، سمرقند (ازبکستان) اس کے مراکز رہے ہیں۔ شیراز ایران کے صوبہ فارس کا مرکز ہے، جس زبان میں سعدی شیرازی اور حافظ شیرازی نے شاعری کی فارسی نہیں دری ہے:

ز شعرِ دلکشِ حافظ کسے شود آگاہ
کہ لطفِ طبع و سخن گفتنِ دری داند

....

اپنے اس شعر میں وہ اپنے شیراز والوں سے مخاطب تھے۔ دری زبان اس خطے کے فاتحین کے ساتھ جہاں ہندوستان آئی وہیں ایران بھی پہنچی۔ خلجی، تغلق، غزنوی، غوری، تیموری، سوری، سب کا تعلق اسی خطے سے تھا۔ بزرگان دین، سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین اولیا، بہاء الدین زکریا، سید گیسو دراز سب دری بولنے والے تھے اور اسی خطے سے ہندوستان آئے تھے۔ یہ دری زبان کی وجہ سے ہے کہ ہم شیر (درندہ) اور شیر (دودھ) کی آواز میں فرق روا رکھتے ہیں اور اسی طرح بولتے ہیں، جس طرح دری میں بولے جاتے ہیں چاہے ہماری زبان اردو، پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی کوئی بھی ہو۔ جبکہ ایرانی یہ فرق روا نہیں رکھتے دونوں کو بروزن کھیر، پیر بولتے ہیں۔ اسی طرح زور، شور کو بروزن خُور، دُور بولتے ہیں۔

خوش آمدید (آم دے د) کو خوش (آم دی د) بولتے ہیں۔ محقق فاضل حافظ محمود شیرانی نے اپنے ایک مقالے میں یہ ثابت کرنا چاہا کہ فارسی میں گزشتہ ادوار میں یائے مجہول (ے) اور واو مجہول دونوں مستعمل تھے۔ یقیناً انھیں کسی ایرانی سے گفتگو کے بعد یہ خیال آیا ہوگا ورنہ دری میں اب بھی یائے مجہول اور واو مجہول مستعمل ہیں۔ کئی سال پہلے میں پشاور سے ہری پور آرہا تھا کہ میرے ساتھ والی سیٹ پر ایک افغان مہاجر بھی آکر بیٹھ گیا وہ بھی ہری پور آرہا تھا اور میرے گاؤں سے تین کلومیٹر دور ایک کیمپ میں رہتا تھا۔ بدخشاں سے تعلق تھا، دری زبان تھا۔ دوران گفتگو کسی وجہ سے ایرانیوں کی فارسی کا ذکر آگیا تو کہا، عجیب لوگ ہیں لکھتے ہیں نان اور پڑھتے ہیں نُون۔ معلوم نہیں عبدالصمد ایرانی کی پیروی میں مرزا غالب بھی نان کو نُون بولتے تھے یا نہیں۔ شیخ علی حزیں نے اگر "بادشاہ سے لے کر گدایان بینوا تک کے خلاف زہر اُگلا" تو نئی بات نہیں کی، بعہد عالمگیر ایران سے آنے والے شاعر عبدالکریم عابد کی سنت پر عمل کیا:

دانہاے سُبحہ را مانند درویشانِ ہند
گر یکے راسوے خود خواند کسے صدمی رسد

....

جس کا جواب افضل سرخوش نے یوں دیا:

برنگ دانہائے سُبحہ درویشانِ ہندوستاں
اگر صد را بخواند کس بجز یک یک نمی آید

....

یہ لوگ یہاں مستقبل سنوارنے آتے تھے اور پشتو کی اس کہاوت: کارغہ غل ہم خوری اوتخو کہ ہم شنڈي (کوا گندگی بھی کھاتا ہے اور چونچ بھی جھاڑتا ہے) کا مصداق بھی بنتے رہتے۔

مُشتِ خاک رہگذر بر فرقِ عریاں ریختن
گل کسے جوید کہ او را گوشۂ دستار ہست

....

غالب خود بھی اپنے آپ کو عام عوام سے بالاتر گمان کرتے تھے۔ ذوق کے مرنے کی خبر سن کر کہا آج بھٹیاروں کی زبان بولنے والا مر گیا۔ اپنا سلسلۂ نسب پشنگ اور افراسیاب سے ملایا تو خیر وہ خود بھی تورانی تھے لیکن ان کے دشمن ایرانیوں سے بھی ملالیا:

ساقی چومن پشنگی و افراسیا بیم
دانی کہ اصل گوہرم از دودۂ جم است
میراثِ جم کہ مے بود اکنوں بمن سپار
زیں پس رسد بہشت کہ میراثِ آدم است

....

شاہنواز زیدی نے "ایران کے مشہور شاعر محمد رضا شفیعی کنی کی نظم کا منظوم ترجمہ بعنوان "تلاشِ گمشدہ" زیبِ بیاض کیا ہے۔ لگتا ہے کمپوزنگ یا پروف ریڈنگ کی فروگزاشت سے کدکنی، کنی ہو گیا ہے۔

کدکن اس گاؤں کا نام ہے جہاں وہ پیدا ہوئے۔ اسی گاؤں میں معروف صوفی بزرگ شیخ فریدالدین عطار بھی پیدا ہوئے۔ محمد رضا شفیعی کدکنی فاضل محقق فریدالدین عطار کے متخصص کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ بیدل پر بھی کام کیا۔ بیدل کو شاعرِ آئینہ ہا کہہ کر اس زیادتی کا ازالہ کر دیا جو حزیں لاہیجی نے پوچ گویان ہند میں بیدل کو شامل کر کے کی تھی۔ حزیں اپنے آپ کو کتنے ہی بڑے شاعر گمان کر رہے ہوتے ہوں۔ بیدل کی گرد کو بھی نہیں پہنچتے۔ بیدل افغانستان جہاں دری زبان بولی جاتی ہے، میں مقبول ترین شاعر ہیں اور تاجکستان میں بھی پسندیدۂ انام ہیں۔ جہاں تک علم و فضل کا تعلق ہے تو بحرالعلوم تھے۔ حسن ابدال کے سفر میں ایک پنڈت بھی ہمراہ تھا، جس نے یہ اعتراض کر دیا کہ آپ کے پیغمبرؐ نے اپنی انگشت شہادت اور درمیانی انگلی کو جوڑ کر کہا تھا کہ میں اور قیامت اس طرح ہیں لیکن ہزار سال سے بھی زیادہ ہو گئے ہیں قیامت ابھی تک نہیں آئی۔ بیدل نے ہندوؤں کی اپنی مذہبی کتابوں سے حوالے دے کر پنڈت کو لاجواب کر دیا۔ پنڈت کو کہنا پڑا کہ میں بھی اپنے دھرم کے بارے میں اتنا نہیں جانتا جتنا آپ جانتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

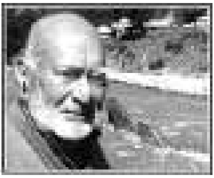

آصف ثاقب

پیار بھرے عمران منظور صاحب اپنی "اداؤں" کے ساتھ زندہ تابندہ رہیں

السلام علیکم!

نئے سال کا مبارک تحفہ رسالہ بیاض بھولے وقت ٹھیک صادر ہوا۔ اس کی بہ بہار شگفتگی سے دل بلیوں اچھل رہا ہے۔ خاص طور پر جناب محمد ارشاد کی گراں قدر تحریر نے ازحد متاثر کیا۔ "حدیثِ دل" میں رقم حقائق اعداز تحریر میں دل افروز بھی تھے اور دل گداز بھی۔ جس گھٹیا سیاست نے ہم سے مشرقی پاکستان چھینا اس کا احساس کر کے بہت دکھ ہوا۔ جناب محمد ارشاد نے اس تناظر میں مہارت سے حالات کو آئینہ بند کیا ہے۔ آنکھوں میں آنسو بھی آئے، دل میں درد بھی اٹھا مشرقی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کے خیالات ملک کے لیے حوصلہ افزا تھے۔ تحریک حصول پاکستان میں ان کا نمایاں حصہ تھا۔ مجیب الرحمٰن سائیکل پر پاکستان زندہ باد، پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے شہر در شہر گھومتے تھے۔ حسین شہید سہروردی حصول پاکستان کی فعال علامت رہے۔ غرض بنگال تحریک پاکستان کی کامیابی میں آگے آگے رہا۔ جناب محمد ارشاد حدیثِ دل میں پاکستان سے ہزارے کی محبتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ انھوں نے آنتوں کے مذکور اردو ے کر ضمنیات سے تحریر کو وہ تاثیر بخشی ہے کہ دیکھا چاہیے۔ زیادہ نہ سہی کم ہی سہی پاکستان سے ہزارے کی نسبتوں کے خصوص میں میرا بھی جذباتی تعلق ہے۔ میرے دادا سلطان حسن علی خان آف بوئی قائداعظم کے معتقدین میں سے تھے۔ وہ 1946 کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر سرحد اسمبلی کے ممبر بنے تھے۔ اپنی پارٹی کی ہدایات کی روشنی میں انھوں نے اپنے مسلم لیگی ساتھیوں سے مل کر تحریک آزادی میں جان لڑا دی تھی۔ اس وقت ہزارے سے جلال الدین خان عرف جلال بابا، سردار بہادر خان، عباس خان، فقیرا خان جدون (اور بہت سے نام) جنگ آزادی کے فرنٹ پر تھے۔ سلطان حسن علی خان اپنے ساتھیوں سمیت سول: قربانی کے محاذ پر ثابت قدم رہے۔

جنگ آزادیٔ کشمیر میں مجاہد آزادی میجر خورشید انور کی قیادت میں قبائلی مجاہدین کے ہم قدم رہے۔ اور آزاد کشمیر کے قیام میں ہراول دستے میں رہے۔ یہاں بھی صورت حال مشرقی پاکستان کی سی تھی سازش چلی اور جموں وکشمیر کی آزادی ہوتے ہوتے رہ گئی۔ یہ کہانی تا ایں دم پردۂ اخفا میں ہے۔

محترم شوکت علی شاہ کی "آپ بیتی" سازشوں کی اور رنگ کی کہانیاں سناتی ہے۔ ہمارے سیاست دان "توبہ تب" کے قائل نظر نہیں آرہے۔ اس وقت جو اس غریب ملک پر بپتا پڑی ہے وہ اندوہناک ہے۔ ملک وقوم کے مستقبل پر اقتدار اور پیسے کو ترجیح دی جارہی ہے۔ جھوٹ اور افتراء کا بازار گرم ہے۔ الزامات کی بوچھاڑیں ہیں کہ الامان الحفیظ!!

چھوٹے بڑے کارکن شطرنج کے مہروں کی طرح گردش میں ہیں۔ کہیں شہ مات ہے کہیں جیت ہے۔ فتح کے شادیانے بجتے ہیں ہار کے عذر تراشے جاتے ہیں۔ غریب عوام کی ناداری، بے کسی، مجبوری اور بے سروسامانی کسی کو معلوم نہیں۔

محترم شوکت علی شاہ بھی تحریر کے دھنی ہیں۔ وہ سب بےجواز قلم کھول کے بیان کرتے ہیں۔ دعا ہے خدا اس ملک اس غریب ملک اور غریب عوام کو "مزید شدت احوال" سے بچائے خدا بہتری کے دن لائے۔ آمین۔ یہیں کہیں شاعری کے باب میں نظم کی بات ہوئی۔ اختر حسین جعفری نے نظم میں دل پذیر لہجہ اور سلسلہ رواج دے رکھا ہے۔ اسے اپنانے کی کوشش ہو رہی ہے مگر...... نظم میں ن م راشد، تصدق حسین خالد، مجید امجد، امجد اسلام امجد، یامین اور میراجی نے اپنا اپنا حصہ ڈالا ہے۔ میراجی نے الفاظ کے نصاب میں جو حسن انتخاب وضع کیا ہے وہ شاں پہلے دیکھا گیا نہ اب سامنے ہے۔ نظم کے سلسلے میں ان شاعروں کا ذکر بھی ہو سکتا ہے جنھوں نے غزل میں بھی نام پیدا کیا۔ خالد احمد کی نظم بھی اختصاصی نوعیت کی ہے۔ قلم ندیم کا والہانہ پن!! کیا کہنے

خیر اندیش

نسیم سحر

برادران عمران منظور، نعمان منظور، نوید صادق اور اعجاز رضوی صاحبان۔

نیا سال مبارک ہو۔ آپ کی طرف سے تو نئے سال کی مبارکباد "بیاض" کے تازہ شمارے کی صورت میں موصول ہوئی جس کے سرورق نے قرطاس و قلم کی اہمیت اور شمعِ ادب روشن کرنے کا علامتی پیغام دیا۔ چونکہ نیا شمارہ میرے لیے دو خوشگوار پیغام لایا ہے اس لیے مجھے باغ و بہار تو ہونا ہی تھا اور ہوا۔ ایک تو برادرم خالق آرزو کا مجھ پر مضمون میرے لیے ایک سرپرائز اور مسرت کا باعث بنا ان کا بہت بہت شکریہ۔ دوسرا میری حالیہ نعتیہ تنقیدی مضامین پر مشتمل کتاب کے سرورق کا عکس "بیاض" میں شائع ہونا بھی خوشی کا باعث بنا۔ اطلاعِ عام کے طور پر عرض ہے کہ میں نے یہ کتاب بیشمار دوستوں خاص طور پر قلمکاروں کو رجسٹرڈ ڈاک سے بلا معاوضہ روانہ کی ہے تاہم اگر بیاض کا کوئی قاری یا قلمکار اسے حاصل کرنا چاہتا ہے تو صرف مجھے ڈاک خرچ کے طور پر یک صد روپے میرے ایزی پیسا اکاؤنٹ (0341.51.66465) پر بھیج دے اور اسی نمبر پر اپنا ایڈریس بھی۔ ان شاء اللہ کتاب ارسال کر دی جائے گی۔ چونکہ یہ کتاب مفت بھیجنے کی پیشکش ہے اس لیے ازراہِ کرم اس اعلان کو کتاب کی پبلسٹی نہ سمجھا جائے۔

جناب سلیمان عبداللہ ڈار کا مضمون "اللہ کو چن لیں" قارئین کو غور و فکر کرنے اور اللہ کو چننے کے لیے بڑے مدلل طریقے سے مائل کرتا ہے۔ اس تحریر میں بیشمار اسباق انسان کی رہنمائی کے لیے موجود ہیں مگر سب سے اچھی بات جو میرے دل کو لگی یہ ہے: "کسی کا دل توڑ کر معافی مانگنا بہت آسان ہے لیکن اپنا دل ٹوٹنے پر کسی کو معاف کرنا بہت ہی مشکل ہوتا ہے"۔ ہمارا عمومی رویہ معافی مانگنے مگر کسی کو معاف نہ کرنے کا ہی ہوتا ہے۔

جناب محمد ارشاد کا "حدیثِ دل" کے عنوان سے طویل مضمون تاریخ پاکستان اور اس کے کئی کرداروں پر ایک مختلف انداز سے روشنی ڈالتا ہے ہو سکتا ہے بہت سے لوگوں کو کچھ شخصیات کے بارے میں ان کا کہنا پسند نہ آئے مگر بات تو سچ ہے مگر بات ہے رسوائی کی — خود مجھے بھی لیاقت علی خان کے بارے میں ان کی تحریر پڑھ کر حیرت ہوئی۔ اردو زبان کے بارے میں بھی ان کے خیالات پر کسی قدر حیرت ہوئی۔ قیامِ پاکستان میں بہت سے علاقے کے مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اس لیے یہ کہنا کہ یہ صرف جاگیرداروں نے اپنے مفادات اور جاگیروں قائم رکھنے کے لیے بنوایا تھا، کسی قدر سوچنے کے قابل ہے۔ بہر حال اس طویل مضمون پر دیگر احباب کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

معروف شاعر اور دانشور جناب فرحت عباس شاہ کا مضمون "اختر حسین جعفری کی شاعری اور ان کی تنقید" غور سے پڑھا اور ان کی تجزیاتی توفیقات کا پہلے سے بھی زیادہ قائل ہو گیا۔ مزید لطف ان کا وہ انٹرویو اور ان کی تنقید کے حوالے سے ہی پڑھ کر آیا جس کا اہتمام بیاض کے دفتر میں کیا گیا تھا اور جس میں عمران منظور اور نعمان منظور صاحبان کے ساتھ منصور آفاق جیسی عظیم شخصیت بھی شامل تھی۔ اس میں شاہ جی نے سرکاری ادبی اداروں کے حوالے سے کھل کر گفتگو کی ہے مگر کون سنتا ہے فغانِ درویش۔ ان کے انٹرویو میں مجموعی طور پر پاکستان کے ادب کی زوال آمادگی اور مشاعروں میں تماشے لگانے کی جو روش چل پڑی ہے اس پر انہی کی طرح دیگر سنجیدہ شعرا بھی انگشت بدنداں ہیں کہ اب معیاری شاعری اور اسے سنجیدہ انداز میں سنانے کا ماحول نہیں رہا۔ مشاعرہ ایک پرفارمنگ عمل بن گیا ہے۔ شاہ جی کی یہ خیال افروز گفتگو اور ان کی تنقید کی جانب ایک نئی اور اہم سمت میں ادبی تنقیدی سفر کا آغاز ہے۔ اس گفتگو کے آخر میں جو مشورہ یا نصیحت انہوں نے کی ہے کاش لکھنے والے اس پر غور کریں: "اپنی تخلیقات سے سچی خوشی کے علاوہ دنیاوی فوائد کی توقع سے دور رہ کر احساس اور علم کی ریاضت کے لیے زندگی کو وقف کرنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کر سکتے تو پھر بہتر یہ ہے کہ کسی اور کام کو اختیار کر لیا جائے"

جناب نجیب جمال کا عالمانہ مضمون عرفان صادق کی شاعری پر ایسا ہے کہ بہت سے شعرا اس سے شاعری کے معیاری ہونے اور اپنی شاعری پر نظرِ ثانی کرنے کا پیغام اخذ کر سکتے ہیں۔

افسانوں یا کہانیوں میں سب سے آخر میں اقبال بیلا کا افسانہ "نیو مارکو پولو اور ابن بطوطہ" پڑھا اس لیے کہ اگر اسے پہلے پڑھتا تو پھر شاید کسی اور کو پڑھنے کا موڈ ہی نہ بنتا۔ اقبال بیلا اپنے مکالماتی انداز میں انتہائی گہری بات کرتے ہیں۔ فرحت پروین کافی عرصے بعد "تیسرا کلمہ" لے کر آئی ہیں اور معاشرے کے تضادات اور سماجی تفاوت کی منافقتیں سامنے لا رہی ہیں۔ فرخندہ شمیم کے افسانے "فیروزی رنگ کا جوڑا" میں عمدہ زبان کا استعمال افسانے میں فیروزی کے علاوہ بھی کئی رنگ بھر گیا ہے جس سے افسانہ مزید دلچسپ ہو گیا ہے۔ اسی طرح آشا تھ کنول کا

افسانہ "خواب" ایک خوابیدہ کیفیت میں لے جاتا ہے جس میں خوبصورت بیانیہ انداز کے آخر میں ظاہر ہوتا ہے کہ نیاگرہ فالز کی سیر بھی بس ایک بخار کی کیفیات کا خواب ہی تھی۔ باقی کے دو تین افسانے ابھی پڑھ نہیں سکا۔

نظموں میں جناب آصف ثاقب کی خالد احمد پر لکھی ہوئی نظم خالد احمد سے ان کی محبت کا شاعرانہ اظہار ہے۔ جناب جلیل عالی، صفدر صدیق رضی، حامد یزدانی، اقبال سروبہ کی نظمیں بھی زیادہ اچھی لگیں کہ انہوں نے ان نظموں کے موضوع سے انصاف کیا ہے۔ جناب گلزار بخاری کی نظم "ہات پہ سورج" کا یہ آخری شعر ایک نفیس کیفیت کا حامل ہے اور بہت خوب ہے:

سچائی نہیں چھپتی چاہے کوئی رکھ دے — اک ہات پہ مہتاب تو اک ہات پہ سورج

شعری حصے میں حمد و نعوت کے ان اشعار نے خاص طور پر متاثر کیا:

کمال کُن کا مظاہرہ ہے	جو حسنِ تخلیقِ کبریا ہے	سید ریاض حسین زیدی
میں گنہگار ہوں تسلیم مگر ربِ کریم	میرے چہرے پہ ہے تحریر ندامت میری	حسن عسکری کاظمی
ہر حمد کے ہونے پہ دعا کرتا ہوں سرور	توفیق مجھے بار دگر دے مرے مولا	سرور حسین نقشبندی
دانا چگتا چلا جاتا ہوں کبوتر کی طرح	یہ مرا رزق تھا میں اترتا چلا آیا ہوں	سعد اللہ شاہ
یہ نظمِ کائنات ہے بس آپؐ کے طفیل	سب کچھ مرے حضور ہے صدقے میں آپؐ کے	تابش کمال
آپ کی نسبتِ عالی کے سبب ہے ناصر	جو عقیدت مجھے طیبہ کے در و بام سے ہے	ناصر بشیر
یہ عجز و فقر کی دولت، سکونِ قلبِ حزیں	زہے نصیب کہ اس بوریا نشیں سے ملا	نبیل احمد نبیل
ہے کائنات تیرے محاسن کا اک ورق	لوح و قلم ہے تیرے فضائل کا ایک باب	مرزا غلام حیدر

اب غزلوں کے کچھ جیالے اشعار بھی لکھتا چلوں:

خالی ہاتھ چلے	آئے تھے بازار	خالد احمد
صرف سچ لکھ رہے ہیں اہلِ قلم	کلک پر چل رہے ہوں آرے بھی	خالد احمد
واپسی ممکن نہیں	کہہ کے گزرا ایک پل	انجم اسلام امجد
خود فریبی بھی کوئی اس سے بڑی کیا ہوگی	آدمی کہہ کے خلاوات پھر اس پہ اڑ جائے	جلیل عالی
شاعر ہو تم شعور، پیمبر نہیں ہو تم	کرنی ہے شاعری تمہیں الہام کے بغیر	انور شعور
فاختہ جیسی سادگی پہ نہ جا	کم نہیں ہوں کسی عقاب سے میں	راحت سرحدی
جب الجھا ذات کے ریشم میں	جب وقت ملا سلجھاؤ کا	قیوم طاہر
ترے کرم نے جگہ عطا کی جنہیں کہانی میں ساتھ اپنے	ترا ہی کردار داستاں سے نکالنے میں لگے ہوئے ہیں	گلزار بخاری
دل کو اصرار ہے دھڑکنے پر	تیرے ملنے کی آس ہو جیسے	نثار ترابی
دنیا! ہمیں بھیجا گیا یاں ایک سبب سے	ورنہ ہمیں کچھ تجھ سے سروکار نہیں ہے	خاور اعجاز
ہیئتیں جانچتا رہتا ہوں اپنا	مقابل قد آدم آئنے ہیں	منظور ثاقب
دیکھ کر حالات کر لیجے خوشی سے خودکشی	روزنامے کے لیے پہلی خبر ہو جائیے	اقبال سروبہ
کس طرح لوٹ گیا وہ مرے دروازے سے	میرے بارے میں کسی نے تو بتایا ہوگا	اشرف کمال
جو کھلی آنکھوں سے جس کو دیکھنا ممکن نہ تھا	وہ میسر آ گیا سارے کا سارا خواب میں	طالب انصاری
لینے والوں کی مرضی ہے جس کو جو بھی لیں	بازاروں میں سجے ہوئے ہیں آنکھیں، چہرے، خواب	ریاض ندیم نیازی
مری جیبوں میں سکے بولتے تھے	مری باتوں میں ورنہ کب اثر تھا	شوکت محمود شوکت
سرائے شب میں نہ آئے کسی بدن پہ یہ وقت	کہ اس کے سائے کو کھڑکی سے کودنا پڑ جائے	شاہد ماکلی
کون انصاف کو کہے شفاف	محتسب کا جو احتساب نہ ہو	اکرم جاذب
صبح سے شام تلک، شام سے پھر صبح تلک	چور تو چور ہیں دربان سے خوف آتا ہے	صغیر احمد صغیر

ان میں کوئی جام میرے کام کا لگتا نہیں	اچھے کوزہ گر تری کوزہ گری اپنی جگہ	افتخار شاہد
کشکول لے کے پھرتے ہیں ہم دربدر سدا	آئے کبھی تو شرم یہ تحقیر دیکھ کر	سید ضیا حسین
کس نے یہ دیوار اٹھائی مشرق میں	آنگن میں آتی تھی اچھی خاصی دھوپ	رانا سعید دوشی
لا کا جلوہ ہو کہ الا کا جمال	ہر ادا ہے خوبصورت یار کی	فیض رسول فیضان
بھری ہوئی ہیں کمانیں اگرچہ تیروں سے	عدو پہ ٹھیک نشانے لگا نہیں پائے	عمر فیاض قائل
فقط اک حور کی خاطر یہاں پر	یہاں بھی جلانا چاہتا ہے	عطاالعزیز
آمنے سامنے کے ہم قائل	چھپ کے تو وار بھی نہیں ہوتا	عاصم بخاری
مر جائیں گے عوام ہی فتنہ فساد سے	کچھ بھی زیاں نہ ہوگا کسی کجکلاہ کا	عنبرین خان
یہ کائنات کی سب آیتیں تمہاری ہیں	کبھی تو کھول تلاوت کا مرحلہ دے کر	شازیہ باب
ہاں ، خدا کا راز داں ہوں ، مار دو	مارنے سے راز مر جائیں گے کیا	اسامہ عندلیب

اب شعری تخلیقات پر کچھ تنقیدی گفتگو ، متعلقہ شعراء سے معذرت کے ساتھ ۔ جناب سعداللہ شاہ نے اپنی نعت کے اس شعر میں "بعدیت کے ہوئی نعت تو زمرہ ہوا میں: "سعد میں گنبد خضرا ہی سے خضرایا ہوں" میں خضرایا کی جو نئی ترکیب استعمال کی ہے اس شعر کی حد تک تو شاید قابل قبول ہو لیکن اسے کسی اور شعر یا نثر میں شاید قبول نہ کیا جا سکے کیونکہ اس کے معنی ان معانی سے مختلف بھی نکل سکتے ہیں جن میں جناب سعداللہ شاہ نے اسے برتا ہے ۔ برادرم ریاض ندیم نیازی کی پہلی غزل کے پہلے چار شعر ایک بحر میں ہیں جبکہ باقی کے تین شعر اسی قافیے ردیف میں لیکن ایک مختلف بحر میں ہیں ۔ غالباً اپنی تخلیقی رو میں وہ غزل کو فنی لحاظ سے دیکھنا بھول گئے ۔

کوشش کے باوجود یہ خط کسی قدر طویل ہو گیا ہے لیکن اگر کچھ مزید تخلیقات پر بھی تبصرہ کرتا تو یہ مزید طویل ہو سکتا تھا اس لیے میرا شکریہ ادا کیجیے کہ یہ خط مختصر طویل تر ہے جو بہ تر نہیں ہوا ۔ اللہ حافظ

دردانہ نوشین خان

مکرمی عمران منظور

السلام علیکم

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ اور ہر ماہ باقاعدگی سے موصول ہونے والا ماہنامہ بیاض کا 2023 کا شمارہ نمبر 1 کا مطالعہ کیا

سلیمان عبداللہ ڈار کا مضمون "اللہ کو چن لیں" توحیدی مہک سے لبریز ہے نثر میں حمد ہے اور باتوں باتوں میں تبلیغ ہے۔

محمد ارشاد نے "حدیث دل" کے جامع مضمون میں تاریخ کے اوراق کھولے اور جلے دل کے پھپھولے پھوڑے ۔ مضمون قابل تحسین ہے۔

فرحت عباس شاہ نے کہا کتاب سے دوستی نہیں عشق پالنا ہوگا اور لکھتے وقت ارد گرد کے شاعروں ادیبوں کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنی ذاتی کیفیات اور خیالات کو ترجیح دینی ہوگی عارضی اور فوری ٹریڈز کے دباؤ سے خود کو محفوظ رکھنا ہوگا مزید برآں انہوں نے گفتگو کے اختتام میں جو ادبی نصائح دی ہیں اس کی تائید کرتی ہوں اور اس تائید کی عملی تفسیر ہوں۔

عاصم بخاری کا افسانچہ "بسم اللہ آٹو الیکٹریشن" ہمارے معاشرے کی بدصورتی کی تصویر ہے لوگ کاروباری مراکز کے نام تو "مدینہ مدنی" اور "بسم اللہ" رکھ لیتے ہیں مگر اعمال یکسر نام کے متضاد ہوتے ہیں

فرحت پروین کا افسانہ "تیسرا کلمہ" بھی اسی منافق رویے کی کہانی ہے جہاں عبادت کو ظاہری وقار کے نکھار کے لیے کیا جاتا ہے

فرخندہ شمیم کے افسانے "فیروزی رنگ کا جوڑا" کا موضوع یعنی پلاٹ اچھوتا دلچسپ اور غیر متوقع ہے افسانے کا اسلوب مرصع ہے

انا محمد کنول کا افسانہ "خواب" خواب جیسا مدھر رومانوی ہے

"گواہی" اور "بشیراں" بھی اچھے افسانے ہیں

ناصر محمود ملک نے "دیہاتی زندگی دور کے ڈھول سہانے" حرف حرف سچ لکھا ہماری عادت ہے کسی منظر شخصیت یا جگہ کو اپنی تخیل پرستی کی مدد سے بڑھا چڑھا دیتے ہیں دیہات صرف سرسبز صاف ستھرے خالص اور آسان نہیں ہوتے اور نہ ہی دیہاتی اتنے سیدھے اور بھولے ہوتے ہیں یہ سب مفروضے ہیں ہر حقیقت منفی مثبت پہلو رکھتی ہے۔

والسلام

کلیم خارجی

محترم عمران منظور صاحب

خدا کرے کہ آپ صحت مند اور اپنی توانائیوں میں قائم رہیں۔

اپنی فضول قسم کی مصروفیات اور کاہلی کے باوجود میں نے آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کر ہی لیا۔ میری نیک تمنائیں اظہار چاہتی تھیں۔ آپ اور آپ کے تمام رفقاء جن میں محترم اعجاز رضوی صاحب، نوید صادق، کنور امتیاز، ہاشم عمران اور کمپوزنگ والے حافظ عبداللہ داد کے مستحق ہیں۔ کہ جن کی محنت اور پیشہ ورانہ صلاحیت کی وجہ سے بیاض اُردو ادب کا معتبر رسالہ بن چکا ہے۔ بیاض میں نوجوان شاعروں کے ساتھ ساتھ کہنہ مشق شاعروں کی بہترین شاعری پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آپ کے ذاتی اخلاص نے بہت سے لوگوں کو پُر امید رکھا ہوا ہے مجھ جیسے سُست اور گوشہ نشین آدمی پر آپ کی عنایت کا نتیجہ یہ ہے کہ میں اب باقاعدگی سے جھک مارنے لگا ہوں۔ 2023 کے تازہ شمارے میں بہت سے تحریریں داد کی مستحق ہیں لیکن میں مختصر کرتے ہوئے فرحت عباس شاہ کے انٹرویو اور پھر اختر حسین جعفری پہ ان کے مضمون کے لیے آپ کی جرأت کی داد دیتا ہوں۔ کہ آپ نے جوں کا توں چھاپ دیا۔ ان کی بے باک رائے سے کون اختلاف کر سکتا ہے؟ ادیبوں اور ادبی ٹھیکیداروں کے خود غرضانہ اور جاہلانہ رویوں نے کتاب کو اس معاشرے میں ممنوع بنا کے رکھا ہوا ہے ان کے انٹرویو میں زہریلے مدرسین کی اصطلاح بڑی زبردست ہے۔ اختر حسین جعفری پر ان کا مضمون اُردو ادب خاص کر نظم پڑھنے والے اور پڑھانے والوں کے لیے بہت دلچسپ اور فکر انگیز تھا۔ میرے حلقے میں کچھ سنجیدہ لوگ اختر حسین جعفری کی کتابیں ڈھونڈنے میں لگے ہوئے ہیں۔ روایتی اور تن آسان نقاد کے مقابلے میں آزاد فکر تخلیقی نقاد پر فرحت عباس شاہ کا بیانیہ ترقی پسندی کے اُصول وضع کرتا ہے۔

میری ذاتی رائے یہ ہے کہ فرحت عباس شاہ کو ادبی مضامین اور ادبی رسالوں خاص کر بیاض میں باقاعدگی سے چھپنے چاہیے فیس بک سنجیدہ اور بالغ ذہن قاری کی اُمید رکھنا میرے نزدیک بڑی غلط فہمی ہے۔ دوم یہ کہ کتاب کا بھرم رہ جائیگا۔ اب اگر آپ کو ناگوار نہ لگے تو اپنا ذاتی مقدمہ بھی پیش کر دوں؟

تازہ شمارے میں منظور حاوی جیسے آزاد منش شاعر کے خط سے کچھ الفاظ غائب ہوگئے جن کی وجہ سے خط کی فضا قدرے مکدر رہو گئی۔ منظور حاوی خود بڑے صدمے میں ہے اگر آپ مندرجہ ذیل تصحیح چھاپ دیں۔ تو پڑھنے اور لکھنے والے دونوں کا بھلا ہو جائے گا۔

تصحیح 1: بلکہ سننے میں بڑے دل کش اور پُر اثر لگتے ہیں۔

2: حالانکہ میں نے آپ کو یقین دلایا تھا کہ خدا نے مجھے اس وقت بنایا جب وہ اچھے موڈ میں نہیں تھا۔

3: مجھے حیرت ہوتی ہے کہ میرے اور آپ کے درمیان کس قسم کا انسانی اور اخلاقی رشتہ قائم تھا۔

4: آپ نے مجھے اتنی اہم تقریب میں دیکھ کر بے پناہ حیرت اور ہلکی سی مسرت کا اظہار کیا تھا۔

مجھے اعتراف ہے کہ سب کچھ میرے کمپوزر کی جلد بازی سے ہوا ہوگا۔ اس سے ایسی غلطیاں نہ ہوں تو مجھے بھی بڑی حیرت ہوتی ہے۔

مقررا! 90 کی دہائی میں احمد ندیم قاسمی صاحب کی شفقت دیکھ کر میں نے دُعا محفوظ ہے، کے نام سے مختصر کہانیاں، فنون میں لکھنے کا ارادہ کیا تھا۔ چند ایک کہانیاں چھاپ کر اُنہوں نے میری ہمت افزائی بھی کی تھی لیکن یہ سلسلہ بن نہ سکا۔ چند دن پہلے اپنا پرانا مسودہ جھاڑ کے دیکھا ایک کہانی پیش کر رہا ہوں۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے آئندہ بھی کہانی بھیجنے کا حوصلہ دیتے رہیں گے۔ میری کاہلی دیکھئے کہ میں گزشتہ کئی دہائیوں سے دُعا محفوظ چھپوانے کے بارے میں سوچ ہی رہا ہوں۔ اللہ آپ سب کو سلامت رکھے۔

محمد شفیق انصاری

محترم و مکرم جناب عمران منظور صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ

اُمید واثق ہے کہ آپ اور ''بیاض'' کی تمام ٹیم بخیر و عافیت ہوں گے۔

نئے سال 2023 کا شمارہ ہاتھوں میں ہے۔ اور یہ خوشی ناقابلِ بیان ہے۔ آپ اور تمام ٹیم کی انتھک محنت کے بعد ہر ماہ باقاعدگی سے ہمیں تازہ شمارہ مل جاتا ہے۔ یہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ اللہ پاک آپ کو مزید استقامت نصیب فرمائے۔ آمین

دیدہ زیب گلدان میں سجا ''بیاض'' اپنے خوبصورت فرنٹ اور بیک ٹائٹل پر سالِ نو کی مبارک باد لیے اپنے اندر خوبصورت غزلوں، نظموں، حمد، نعت، مضامین، افسانوں اور خطوط سے مزین ایک کہکشاں رکھتا ہے۔

پہلے ہی صفحہ پر مرشدی خالد احمد صاحب کی غزل اپنے خاص اسلوب میں:

ایک ہم ہیں کہ تیرے ہو کے بھی آوارہ ہیں ۔۔۔ اپنی تقدیر ہے آوازۂ صحرا ہونا

حصہ حمد نعت اور عقیدت میں سید ریاض حسین زیدی، حسن عسکری کاظمی، باقی احمد پوری، سعد اللہ شاہ، ناصر بشیر، تجمل احمد تجمل، قسیم صحرا اور اویس الحاقی قابل ذکر ہیں۔

حصہ مضامین میں سید افسر ساجد کا شہزاد قیصر کی شخصیت پر مضمون اور فرحت عباس شاہ کا اختر حسین جعفری کی شاعری پر مضمون اور محمد ظہیر بدر کا "فیض اور اقبال..... چند مماثلتیں" خاصے کی چیز ہیں۔

شوکت علی شاہ کی آپ بیتی ایک خوبصورت انداز سے ایک خاص دلچسپی لیے بڑھ رہی ہے۔ فرحت عباس شاہ کا خوبصورت انٹرویو "گفتگو" میں خوبصورت انداز میں ان کے فن اور شخصیت کو منفرد انداز میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔ شاہد ماکلی کا سلسلہ "شاعر امروز" میں اسامہ عندلیب کی شعر گوئی سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

حصہ غزل اور حصہ نظم کا شعری انتخاب بھرپور ہے۔ سال 2023 کا یہ شمارہ اپنے ہر ہر گوشے کے حوالے سے شاندار ہے۔ والسلام

فیض رسول فیضان

مخدومی عمران منظور صاحب، محترمی نعمان منظور صاحب، مکرمی اعجاز رضوی صاحب، آداب!

سن دو ہزار تیئیس کا شمارہ اول یعنی جنوری کا بیاض خوبصورت، سادہ اور پُرکار ٹائٹل کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ضخیم، قرطاس و خامہ، روشنائی اور غنچہ ہائے نورستہ، بحیثیت مجموعی تخلیقی و تہذیبی رچاؤ کا نفیس و بلیغ تاثر پیدا کر رہے ہیں۔ بیک ٹائٹل سے غالب یاد آئے۔

دیکھیے پاتے ہیں عشاق بتوں سے کیا فیض
اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

فرحت عباس شاہ کو پرائڈ آف پرفارمنس ملنا، مبارک شگون اور "دیر آید درست آید" کے مصداق ہے۔ شاہ صاحب کے انٹرویو کی گہرائی اور مضامین و مقالات کی گیرائی سے پتہ چلتا ہے کہ موصوف شعر کے ساتھ نثر میں بھی ماہر و مشاق ہیں۔

بانی مدیر حضرت خالد احمدؔ کی افتتاحی غزل روایت و جدت کا انوکھا اور البیلا امتزاج ہے۔ خصوصاً یہ دو شعر تو قیامت ہیں:

زندگی میں کسی رنج کا، کسی دکھ کا ہونا ۔۔۔ اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا
ٹھوکریں مارنے لگتا ہے لہو نس نس میں ۔۔۔ کتنا دشوار ہے تیرا مرا یکجا ہونا

اس سے مرشد احمد ندیم قاسمی کی وہ ہم زمین عمیق غزل بھی یاد آ رہی ہے جو اتفاق سے آجکل میرے کالج لیکچروں میں پڑھائی جا رہی ہے:

کچھ غلط بھی تو نہیں تھا مرا تنہا ہونا ۔۔۔ آتش و آب کا ممکن نہیں یکجا ہونا
شاعری روز ازل میں ہوئی تخلیق ندیم ۔۔۔ شعر سے کم نہیں انسان کا پیدا ہونا

حمدیہ و نعتیہ حصہ حسب معمول، عقیدت ریز، مودت پاش اور ایمان افروز ہے۔

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار نے تصوف میں وحدت و وحدانیت کی محبت بھری خوشبوئیں بکھیری ہیں۔ سلامت رہیں۔

محمد ارشاد کی حدیث دل، پڑھ کر جہاں ایک طرف شیخ سعدی جلوہ پیرا ہوئے:

دروغ مصلحت آمیز بہ از راستی فتنہ انگیز۔

تو وہیں دوسری طرف علامہ اقبالؔ بھی ارشاد فرما ہوئے:

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر ۔۔۔ کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کار تریاقی

اختر حسین جعفری کی شاعری پر، اور ان کی تنقید، کا انطباق و انعکاس، فرحت عباس شاہ کے انتقادی شعور و سوچ کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ بہت سی داد۔

عبدالرزاق کیانی کے ورود کا آخری طواف، قاری کی سرسری نہیں بلکہ عرق ریز را ئے ہے۔ جس سے کیانی کہانی، کی مہارت و سلیقہ مندی فاش ہوتی ہے۔

عرفان صادق کی غزل پر مجیب جمال نے مدلل اور جاندار اظہار خیال کیا ہے۔ صادق صاحب کے دو عمدہ شعر:

پرندے کوچ کرتے جا رہے ہیں ۔۔۔ منڈیروں پہ لہو بکھرا ہوا ہے

ایسے مُرجھائے ہیں سب خواب مری آنکھوں میں　　جیسے چپ چاپ درختوں پہ خزاں آتی ہے

فیض و اقبال کی مماثلتیں بھی ظہیر ہود کا حیرت انگیز مضمون ہے۔ جو دونوں شعراء کی فکری اساسیات کے نئے گوشے سامنے لا رہا ہے۔ دو حسب حال شعر:

مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں　　جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

کہاں سے تُو نے اے اقبال سیکھی ہے یہ درویشی　　کہ چرچا بادشاہوں میں ہے تیری بے نیازی کا

شاہ داستان، اور، شاعر امروز، حسب سابق پختگی و نفاست کا مرقع ہیں۔ غزلیہ و افسانوی حصے تو بھرپور ہیں جبکہ حصہ نظم اتفاقی طور پر قدرے گذارہ ہی محسوس ہو رہا ہے۔ تاہم من حیث المجموع، زیر نظر بیاض بھی فلک بوس معیار کا حامل پرچہ ہے جو دیگر رسالوں کیلئے مشعل راہ ہے۔

مدیران والا شان کی خدمت میں تحسین و ستائش!

ایک نئی غزل اور منتخب اشعار کے ساتھ اجازت۔ والسلام مع الاکرام۔

اتنی طویل عمر میں اے کاش ہم بھی	دو چار دن گذارتے آلام کے بغیر	انور شعور
ایسا لگتا ہے زندگی ساری	جیسے نکلا نہیں سراب سے میں	راحت سرحدی
جب اُلجھا ذات کے ریشم میں	جب وقت چلا سلجھاؤ کا	انجم طاہر
اے دوست اسقدر مجھے اذنِ کلام ہو	محفل میں خاص و عام کو میرا سلام ہو	خاور اعجاز
آنے والا بھی جانے والا تھا	یہ مکاں تو کہیں کا تھا ہی نہیں	سعد اللہ شاہ
حیرت کا ہے مقام کہ ہم سے شکستہ پا	یاران تیز گام سے آگے نکل گئے	یعقوب پرواز
اپنی اپنی سمت چلے ہم صحرا میں	ہم نے سر پہ اوڑھی اپنی اپنی دھوپ	سعید روشی
محبت باعثِ قُربِ خدا ہے	دَرُونِ دل رقم کرنا پڑے گا	ارسلان ساحل
بچھڑنا چاہتا ہے مجھ سے لیکن	بچھڑنے کا بہانہ چاہتا ہے	عطا العزیز
زوجہء حضرتِ بابا جی ، صد آفریں	اُن کے سرتاج، عرفان کے تاجدار	منصور ساحل

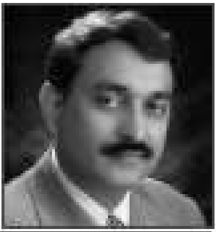

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ماہنامہ بیاض کا شمارہ جنوری 2023 دلکش سرورق کے ساتھ ہاتھوں میں ہے۔ حسب سابق ٹائٹل سادہ ہے مگر خوش رنگ۔

شروع میں خالد احمد کی غزل دی گئی ہے۔ خوبصورت مطلع کے ساتھ:

زندگی میں کسی رنج کا، کسی دکھ کا ہونا
اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا

سفر میں ہم سفر اگر ہم رکاب ہو تو سفر آسان ہو جاتا ہے مگر یہاں دکھوں اور غموں کی ہم سفری بھی بعض اوقات زندگی کو کہا کہی سے بھر دیتی ہے۔

حمدیہ شاعری میں سید ریاض حسین زیدی کا شعر دیکھئے:

کمال کُن کا مظاہرہ ہے　　جو حسنِ تخلیقِ کبریا ہے

عقیل رحمانی کا نعتیہ شعر ملاحظہ کیجئے:

درود ہونٹوں نے جب بھی پڑھا قرینے سے　　ہوائیں عطر کی آنے لگیں مدینے سے

ناصر بشیر کا نعتیہ شعر دیکھئے:

عالمِ جہل میں نور آپ کے پیغام سے ہے　　یہ جو خورشید ہے یہ اور کسی کام سے ہے

زہے نصیب کہ ڈاکٹر نجیب جمال صاحب کی تحریر بھی موجودہ شمارے میں موجود ہے۔ یہ تحریر عرفان صادق کی شاعری کے حوالے سے اہمیت کی حامل ہے۔ انھوں نے غزل کی لفظیات پر سیر حاصل بات کی ہے۔

جناب ڈاکٹر نثار ترابی نے دروں کا طواف کا جائزہ پیش کرتے ہوئے صبا رؤف کیانی کی افسانوی کاوش کا خیر مقدم کھلے دل سے کیا ہے۔

رخشندہ نوید نے اپنی غزل میں "پرندوں کا" جیسی ردیف کے ساتھ خوبصورت شعر تخلیق کیے ہیں کہ گھر کا بنانا اتنا آسان نہیں کہ انھیں منذور

ہواؤں کے سہارے چھوڑ دیا جائے:

اتنا بھی معلوم نہیں ان تند و زور ہواؤں کو — تنکا تنکا جوڑ کے بنتا ہے گھر بار پرندوں کا

غزل کے درج ذیل اشعار خوب ہیں:

یار اس کا بھی خلا بھرتا ہے بکھرتے بکھرتے	اک ستارہ جو کسی شاخِ فلک سے جھڑ جائے	جلیل عالی
آنکھ کے رستے دل میں اتر	بالکل آسان سا بنا ہے مرا	اشرف نقوی
جی رہا ہوں چراغ کی لو پر	ہو کے مایوس آفتاب سے میں	راحت سرحدی
بے یقینی کی بات کیا کرتے	مسئلہ تو یقیں کا تھا ہی نہیں	سعد اللہ شاہ
ہولے ہولے ڈھے جاتا ہے بندہ اندر سے	اپنا رنگ دکھاتی ہیں برساتیں اندر کی	اکرم ناصر
ہوا چھو جائے تمہیں تو ہوا پسند نہیں	تمہیں جو دیکھے انہیں آئینہ پسند نہیں	وسیم جبران
دور تک گہرا خلا ہے دل کے اندر	زور سے آنسو گرا کے دل کے اندر	احمد سجاد بابر
الزام ہے اپنا آپ کروں میں بھی احتساب	تم بھی سوال پوچھنا دل سے تباہ کا	عنبرین خان

ماشاء اللہ یہ شمارہ نظم، حمد و نعت، افسانہ، غزل اور خطوط پر مشتمل اپنے معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

نئے سال کا بیاض 31 دسمبر کو ہی مل گیا تھا۔ شاید یکم جنوری کو اتوار تھا تو اس وجہ سے شمارے جلدی پوسٹ کر دیے گئے۔ منصور آفاق اور فرحت عباس شاہ کی دفتر بیاض آمد پر لی گئی تصاویر اچھی لگیں۔ سلیمان عبداللہ ڈار کی تصوف کے حوالے سے لکھی تحریر ”اللہ کو چن لیں“ بہترین تھی۔ یہ جملے بہت پسند آئے۔ (1) ”طوفان میں کشتیاں اور گھمنڈ میں ہستیاں ڈوب جاتی ہیں، مگر جب اللہ کو چن لیا تو سارے گھمنڈ محبت کی لہر میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔“ (2) ”جب دنیاوی خواہشات اور لمبی لمبی آرزوؤں کی کوئی حد ہی نہ ہو اور کوئی سرحد ہی نہ ہو تو اللہ کیسے ملے؟“ محمد ارشد نے ”صحبتِ دل“ کے عنوان سے تاریخ کی روشن حقیقتوں سے روشناس کرایا۔ تاریخی واقعات نے تحریر کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ نجیب جمال کا عرفان صادق کی شاعری پر ”جس قدر سانس ہے اتنی غزل خوانی کی“ زبردست مضمون تھا۔ عرفان صادق کی منفرد شاعری نے دلچسپی بڑھائے رکھی۔ ”فیض اور اقبال..... چند مماثلتیں“ محمد ظہیر بدر کا خاص اہمیت کا حامل مضمون تھا۔ خالق آرزو نے نسیم سحر کی شخصیت پر خوب لکھا۔ نسیم سحر ایک خوبصورت شاعر اور بہترین نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے خاکوں کی کتاب ”خاک گردی“ میرے پاس ہے، جس میں انہوں نے کئی منفرد خاکے تحریر کیے ہیں۔

فرحت عباس شاہ کی گفتگو بھی دلچسپ رہی۔ تحقیق اور تنقید کے حوالے سے ان کی باتیں دلچسپ تھیں۔ ہمارے ادبی ادارے حقیقی ادیبوں و شاعروں کے ساتھ جو سلوک روا رکھتے ہیں۔ وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ یہ ادارے صرف اپنے من پسند لکھنے والوں کو ہی نوازتے ہیں۔ ادبی منافقت تو ہر دور میں رہی ہے اور شاید یہ کبھی ختم نہ ہو۔ تاہم نیا لکھنے والا اسے طبقات سے دور رہ کر لکھے تو اچھا ہے۔ نوجوان شاعر و ادیب کا المیہ یہ ہے کہ ادبی رسائل و جرائد اور کتابیں پڑھنے کی طرف ان کا رجحان نہیں ہے۔ یہ نوجوان پابندی سے فیس بک یا میٹ پر اپنی شاعری کی ویڈیوز لگا کر لائیکس اور ویوز لائیکس کی گنتی کرنا اہم سمجھتے ہیں۔ گزشتہ سال کتاب میلے پر ایک نوجوان شاعر سے ملاقات ہوئی تو کہنے لگا کہ میں بہت کم پڑھتا ہوں، صرف لکھتا ہوں۔ میں نے کہا بھائی جب تک آپ اچھا پڑھیں گے نہیں تو لکھنے میں بہترین کیسے آئے گی تو موصوف مسکرا کر آگے بڑھ گئے۔ شمارے میں موجود کچھ غزلوں کے درج ذیل اشعار پسند آئے:

زندگی میں کسی رنج کا، کسی دکھ کا ہونا	اچھا ہوتا ہے سفر میں کوئی اپنا ہونا	
درد بھی موج کے مانند سفر کرتے ہیں	اچھا رہتا ہے پلک پر کوئی تارہ ہونا	خالد احمد
بڑے خلوص سے ہم نے کیا تھا عہدِ وفا	خطا معاف کہ اب اس کی آرزو بھی نہیں	حسن عسکری کاظمی
کوئی نظرِ کرم ہوئی مجھ پر	ورنہ میں تو کہیں کا تھا ہی نہیں	سعد اللہ شاہ
اپنے معاصرین سے کیسی مسابقت	جو رہگزارِ عام سے آگے نکل گئے	یعقوب پرواز

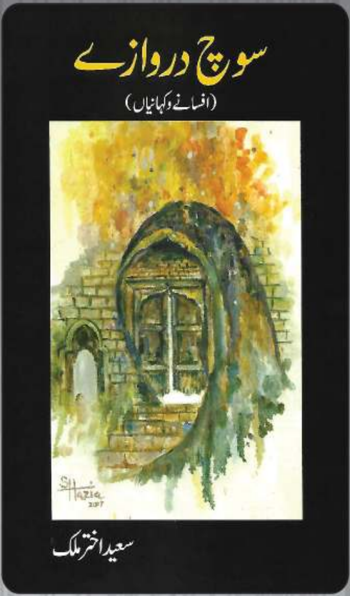
سوچ دروازے
(افسانے وکہانیاں)
سعید اختر ملک

کُلیّاتِ
مَنظور جھلّا
ویکھی جا مولا دے رنگ
سودھی: صفدر واثق

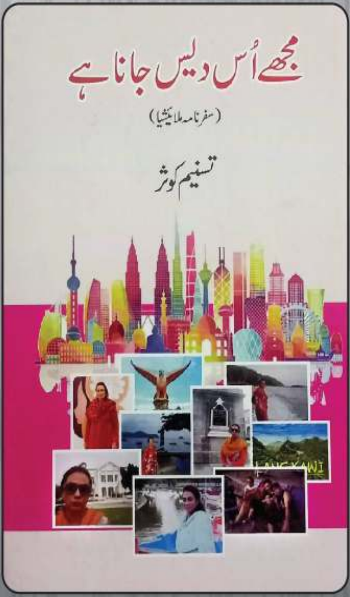
مجھے اُس دیس جانا ہے
(سفرنامہ ملائیشیا)
تسنیم کوثر

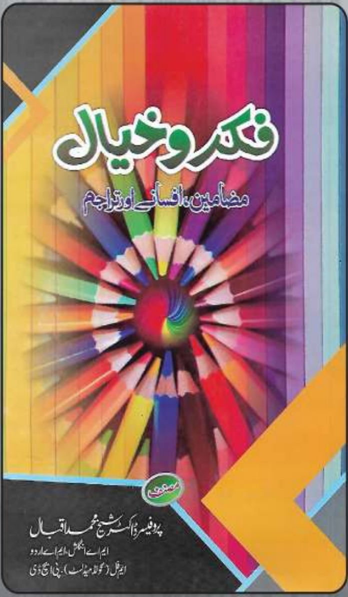
فکر و خیال
مضامین، افسانے اور تراجم
پروفیسر ڈاکٹر شیخ محمد اقبال
ایم اے انگلش، ایم اے اردو
ایم فل (گولڈ میڈلسٹ)، پی ایچ ڈی